آج

٦١

پیٹرک سسکنڈ

اورحان پامک

ارن دھتی رائے

چودھری محمد نعیم

ہیرلڈ پنٹر

رالف رسل

ترتیب

اجمل کمال

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

آج

ادبی کتابی سلسلہ شمارہ 61

جنوری 2009

سالانہ خریداری:

پاکستان: ایک سال (چار شمارے) 500 روپے (بشمول ڈاک خرچ)

بیرون ملک: ایک سال (چار شمارے) 60 امریکی ڈالر (بشمول ڈاک خرچ)

رابطہ:

پاکستان: آج کی کتابیں، 316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400

فون: 5213916 5650623

ای میل: ajmalkamal@gmail.com, aajquarterly@gmail.com

دیگر ممالک:

Dr. Baidar Bakht, 21 White Leaf Crescent, Scarborough,
Ontario M1V 3G1, Canada.
Phone: (416) 292 4391Fax: (416) 292 7374
E-mail: bbakht@rogers.com

Scanned with CamScanner

نئی کتابیں

مٹی کی کان
(کلیات)
افضال احمد سید
Rs.500

کلی منجارو کی برفیں
(منتخب ترجمے)
محمد خالد اختر
Rs.150

پریم وانی
(گیت، ترجمہ اور فرہنگ)
میرابائی
مرتبہ: سردار جعفری
Rs.395

کبیر بانی
(گیت، ترجمہ اور حواشی)
کبیر
مرتبہ: سردار جعفری
Rs.395

درخت نشیں
(ناول)
اتالو کلوینو
انگریزی سے ترجمہ: راشد مفتی
Rs.175

شہزادہ احتجاب
(ناول)
ہوشنگ گلشیری
فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال
Rs.70

Scanned with CamScanner

ترتیب

پیٹرک سسکنڈ
7
مسٹر زومر کی کہانی

اورحان پامک
61
کھڑکی سے باہر دیکھنا
90
میرا تر کی کتب خانہ

ارن دھتی رائے
109
ٹڈی دل کی آہٹ
135
'اور اس کی زندگی مٹا دی جائے'
165
آزادی

Scanned with CamScanner

179
نائن الیون نہیں

چودھری محمد نعیم

197
لشکر کی مائیں
221
حجاب اور میں
234
متشدد مردانہ پن اور اسلام

ہیرلڈ پنٹر

239
فن، سچ اور سیاست

رالف رسل

259
کچھ کھویا کچھ پایا
(خودنوشت سوانح کا دوسرا حصہ — باب 9-7)

Scanned with CamScanner

ناول

بیس سو گیارہ
محمد خالد اختر
Rs.70

گنگا جمنی میدان
اختر حامد خاں
Rs.120

دائرہ
محمد عاصم بٹ
Rs.100

نمبردار کا نیلا
سیّد محمد اشرف
Rs.60

تمس
(ہندی ناول)
بھیشم ساہنی
ترجمہ: شہلا نقوی
Rs.180

قلبِ ظلمات
(انگریزی ناول)
جوزف کونریڈ
ترجمہ: محمد سلیم الرحمٰن
Rs.80

بوف کور
(فارسی ناول)
صادق ہدایت
ترجمہ: اجمل کمال
(زیرِ طبع)

دیمک
(بنگلہ ناول)
شرشیندو مکھوپادھیائے
ترجمہ: رفعت سروش
Rs.70

خیمہ
(عربی ناول)
میرال طحاوی
انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال
Rs.75

ہوئنین پھر جا پاندیئڑا
(اردو ناول کا سندھی ترجمہ)
قرۃ العین حیدر
ترجمہ: ولی رام ولبھ
Rs.240

پہلی بارش
(ہسپانوی ناول)
خولیو لیامازاریس
انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال
Rs.95

نوکر کی قمیض
(ہندی ناول)
ونود کمار شکل
ہندی سے ترجمہ: عامر انصاری، اجمل کمال
Rs.100

سرزمینِ مصر میں جنگ
(عربی ناول)
یوسف القعید
انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال
Rs.125

درخت نشیں
(اطالوی ناول)
اتالو کلوینو
انگریزی سے ترجمہ: راشد مفتی
Rs.175

شہزادہ احتجاب
(فارسی ناول)
ہوشنگ گلشیری
فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال
Rs.70

Scanned with CamScanner

پیٹرک سُسکِنڈ

مسٹر زومر کی کہانی

(ناول)

انگریزی سے ترجمہ
تمثال مسعود

Scanned with CamScanner

معروف جرمن ادیب پیٹرک سسکنڈ (Patrick Süskind) 1949 میں میونخ کے قریب ایک مقام پر پیدا ہوئے۔ انھوں نے قرونِ وسطیٰ اور جدید تاریخ کے مضامین میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ سسکنڈ کا سب سے مشہور ناول Perfume: The Story of a Murderer ہے جو 1985 میں شائع ہوا۔ چند اور ناولوں کے علاوہ سسکنڈ کا ایک کھیل The Double Bass اور مضامین کا مجموعہ On Love and Death بھی شائع ہو چکا ہے۔

جس مختصر ناول کا ترجمہ آئندہ صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے وہ Die Geschichte von Herrn Sommer کے عنوان سے 1991 میں جرمن میں شائع ہوا اور اس کا انگریزی ترجمہ The Story of Mr Sommer 2003 میں۔ اس ناول کی انوکھی بات یہ ہے کہ اس کا عنوان اس کی معنویت میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ کہانی راوی کے بچپن اور لڑکپن کے دنوں کی یادوں پر مشتمل ہے جو جرمنی کے ایک گاؤں میں بسر ہوئے، اور مسٹر زومر کا عجیب و غریب کردار ان یادوں کے مجموعی پس منظر میں پیوست ہے، اور اگر کہانی کو اس کردار سے موسوم نہ کیا جاتا تو پڑھنے والے کے لیے نہ صرف اس کردار کی بلکہ پوری کہانی کی معنویت مختلف ہوتی۔

سسکنڈ کے اس ناول کا ترجمہ تمثال مسعود نے کیا ہے جو ممتاز ادیب نیر مسعود کے بیٹے ہیں۔ انھوں نے حال ہی میں لکھنؤ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی مکمل کی ہے۔ ان کی تحقیق کا موضوع فارسی کہانیوں کے اردو ترجموں سے متعلق تھا۔ وہ خود بھی کہانیاں لکھتے ہیں اور ان دنوں ادبی تحریروں کے ترجموں کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔

Scanned with CamScanner

❁

پیٹرک سسکنڈ (پ 26 مارچ 1949) سے واقفیت کا قصہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ بمبئی میں ایک دوست کے گھر پر ایک ناول The Story of Mr Sommer دیکھی تو اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگا، ایک صفحے پر رک کر اسے یوں ہی پڑھنے لگا، عجیب سحر تھا اس میں، دوست سے کتاب مانگ کر گھر لے آیا اور ایک ہی بلّے میں پوری پڑھ ڈالی۔ کیا بتاؤں، کیا چیز نکلی۔ کچھ دن بعد جب لکھنؤ آیا تو کتاب بھی ساتھ لیتا آیا کہ والد صاحب کو پڑھائی جائے۔ ان کو بھی بہت پسند آئی۔ انھوں نے اپنے دوست اسلم محمود صاحب کو جب یہ کتاب دکھائی تو انھوں نے مصنف اور اس کی دوسری ناولوں Perfume, The Story of Murderer, The Pigeon اور Three Stories and a Reflection کے بارے میں بھی بتایا اور یہ بھی کہ اس ناول کے سرورق کی پشت پر خود مصنف کے دستخط موجود ہیں جو ایک اہم بات ہے۔

پیٹرک سسکنڈ جرمن زبان کے ادیب ہیں اور ان کی ناول کا انگریزی میں ترجمہ مائیکل ہافمین نے کیا ہے۔ یہی ترجمہ میرے اردو ترجمے کا محرک ہے۔ ہافمین کی زبان اتنی رواں اور ترجمہ اتنا عمدہ ہے کہ اس کو پڑھنا اور اس کا گرفت میں آنا بڑا سہل ہے؛ اس خصوصیت نے مجھے اکسایا کہ اسے اردو میں منتقل کر دیا جائے، کام آسان ہے۔ مگر صاحب! بعد میں ترجمہ کرتے وقت معلوم ہوا کہ یہ سوچنا میری ناتجربہ کاری تھی۔ ناول کی پشت پر لکھا ہوا تھا، Michael Hofmann's crystalline translation، اس کا مطلب اب سمجھ میں آیا۔ ناول کے شروع کی چالیس سطروں کے بعد پہلا 'بت کامل (full stop) آیا تھا۔ ”، — ... !“ کی تو ان چالیس سطروں میں بھرمار تھی جنھوں نے مجھے چوندھیا دیا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ جملے کو کہاں توڑا جائے، توڑا بھی جائے یا نہیں۔ جملے کو توڑنے سے اس کی روانی میں خلل پڑتا تھا اور اتنے ”، — ... !“ کا استعمال اردو تحریر میں کہاں ہوتا ہے۔ ان کو رکھوں تو تحریر گنجلک ہوئی جاتی تھی اور چھوڑوں تو روانی مجروح۔ اور وہاں پوری ناول کا یہی انداز۔ آخر میں نے ہتھیار ڈال دیے اور بیچ کا راستہ لیا کہ جملوں کو توڑا بھی اور ”، — ... !“ کا بھی استعمال کیا۔

اپنے کئی امریکی دوستوں کا ممنون ہوں کہ انھوں نے کئی ناموں اور جملوں کی وضاحت فرمائی۔

تمثال مسعود

Scanned with CamScanner

پیٹرک سسکنڈ

انگریزی سے ترجمہ: تمثال مسعود

مسٹر زومر کی کہانی

1

پیڑوں پر چڑھنے کے اپنے پرانے دنوں میں — آج سے بہت پہلے، اب تو کئی برس گذر چکے ہیں — جب میں صرف تین فٹ چار انچ کا تھا، بچوں کا دس نمبر کا جوتا پہنتا تھا، اور اتنا ہلکا تھا کہ اڑ سکتا تھا — جی نہیں، یہ مبالغہ نہیں ہے، واقعی میں اڑ سکتا تھا — یا قریب قریب، یا چلیے یوں کہہ لیجیے کہ اڑنا میرے بس میں تھا، بس ذرا ذہنی طور پر اڑنے کے لیے آمادہ ہونے کی اور اپنی پوری کوشش کرنے بھر کی ضرورت تھی . . . مجھے وہ وقت اچھی طرح یاد ہے جب میں اڑتے اڑتے رہ گیا تھا، یہ میرے اسکول کے پہلے سال کا قصہ ہے جب خزاں کا موسم تھا، اور میں اسکول سے اپنے گھر کی طرف واپس آ رہا تھا، اس دن ہوا اتنی تیز چل رہی تھی کہ بغیر اپنے ہاتھ پھیلائے ہی میں خلا باز کی طرح ہوا میں بہت جھک کر چل سکتا تھا، یا اس سے بھی زیادہ، اور وہ بھی گرے بغیر . . . اور جب میں اس تیز ہوا میں اسکول کی ہری ہری گھاس والی پہاڑی کی ڈھال سے نیچے دوڑتا ہوا آ رہا تھا — چونکہ اسکول گاؤں سے باہر ایک چھوٹی پہاڑی پر تھا — میں نے خود کو اپنے پیروں پر ذرا سا اُچھالا اور اپنے ہاتھوں کو پھیلایا ہی تھا کہ ہوا نے مجھے اوپر اٹھا دیا، تب میں بہت آسانی سے پانچ سے دس فٹ ہوا میں اچھل سکتا تھا اور بیس سے تیس فٹ کی چھلانگ لگا سکتا تھا — یا اتنا فاصلہ اور اتنی اونچائی نہ سہی، لیکن اس سے فرق کیا پڑتا ہے! — خیر، یہ سمجھیے کہ میں بس اڑ ہی رہا تھا، اور اگر میں نے اپنے کوٹ کے بٹن

Scanned with CamScanner

کھول لیے ہوتے اور اس کے دامن کے کونوں کو اپنے دونوں ہاتھوں سے کس کر پکڑ کر پروں کی طرح پھیلا لیا ہوتا، کیوں، تب تو ہوا مجھ کو اپنے ساتھ ہی اٹھا ہی لیتی، اور پھر تو میں بڑی آسانی کے ساتھ اسکول کی پہاڑی سے اٹھ کر بلندی پر اڑنے لگتا، تب میں گھاٹی پر سے اڑتا ہوا جنگل کو پار کر کے جھیل کے قریب پہنچ جاتا جہاں ہمارا گھر تھا، اور وہاں موجود میرے والد، میری والدہ، میرا بڑا بھائی اور میری بہن مجھ کو دیکھ کر حیران رہ جاتے، وہ کبھی اڑنے کے لیے عمر دراز اور بھاری ہو چکے تھے، میں اپنے بغیچے کے اوپر ایک خوبصورت چکر لگاتا ہوا جھیل کے دوسرے سرے تک پہنچ کر بڑی آسانی سے اڑتا ہوا واپس پہاڑی پر آجاتا اور دوپہر کے کھانے کے لیے بالکل صحیح وقت پر گھر بھی پہنچ جاتا۔

لیکن نہ تو میں نے اپنے کوٹ کے بٹن کھولے اور نہ میں ہوا میں اڑا۔ اس لیے نہیں کہ اڑنے سے میں ڈرتا تھا، بلکہ اس لیے کہ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ کیسے اور کہاں اترنا ہے، یہاں تک کہ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ آیا میں دوبارہ زمین پر اتر بھی سکوں گا یا نہیں۔ پھر ہمارے گھر کے سامنے کا فرش بھی تو بہت سخت تھا، بغیچہ بہت چھوٹا تھا، اور جھیل کا پانی بہت ٹھنڈا تھا۔ میرے لیے ہوا سے زمین پر اترنا مشکل نہیں تھا۔ لیکن آخر نیچے آیا کیسے جائے؟ یہ مسئلہ تھا۔

یہ اُسی طرح کی دقت تھی جیسی پیڑوں پر چڑھتے وقت پیش آتی ہے: پیڑ پر چڑھنا تو آسان ہوتا تھا— آپ پیڑ کی شاخیں سامنے دیکھ سکتے تھے، آپ ان کو اپنے ہاتھوں سے چھو کر محسوس کر سکتے تھے اور ان پر اپنا بوجھ ڈالنے سے پہلے ان کی مضبوطی کا اندازہ بھی لگا سکتے تھے— لیکن پیڑ سے اترتے وقت، آپ کو کچھ بھی دکھائی نہ دیتا، اور آپ صرف اندازے کی بنا پر شاخوں کو پیر سے چھونے، ٹٹولنے کے بعد اپنا وزن ان پر ڈال سکتے تھے، جو اکثر مضبوط نہ نکلتیں، جیسے چکنی اور اندر سے سڑی ہوئی، تب آپ یا تو اس شاخ سے پھسل پڑتے یا شاخ ٹوٹ جاتی، اور ایسی صورت میں آپ نے اگر دوسری شاخ کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے نہ پکڑا تب تو آپ پتھر کی طرح نیچے آرہتے، بالکل اطالوی موجد گیلیلیو گیلیلی کے چار سو قبل دریافت کیے ہوئے قانونِ کشش کے مطابق، اور یہ قانون آج تک باضابطہ طور پر جائز بھی ہیں۔

یہ قصہ بھی اسکول کے اُسی پہلے سال کے دوران پیش آیا تھا، یعنی میرا سب سے بری طرح گرنا، گرنا بھی پندرہ فٹ اونچے سرو کے پیڑ سے۔ میرے گرنے نے گیلیلیو کے قانونِ کشش کے

پہلے قانون کی بالکل صحیح طور پر نمائندگی کی تھی، اس قانون میں گیلیلیو کہتا ہے کہ گرنے کا فاصلہ گرنے والی چیز کی قوت کشش کا نصف حصہ ضرب بہ دوگنا وقت کے برابر ہوتا ہے (دوری =1/2 قوت کشش × وقت 2)، اس طرح وقت نکلتا ہے 0.9578262 سیکنڈ، دراصل یہ وقفہ اور بھی کم ہے — ایکس سے بائیس تک گننے میں جتنا وقت لگتا ہے اس سے بھی کم، بلکہ صرف بائیس کہنے میں جتنا وقت لگتا ہے اس سے بھی کم! وہ سب کچھ اس قدر تیزی کے ساتھ ہوا تھا کہ نہ تو میں اپنے ہاتھ پھیلا سکا اور نہ ہی کوٹ کے بٹن کھول کر اسے پیراشوٹ کی طرح استعمال کر سکا، اجی وہاں تو اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ خود کو گرنے سے بچانے کی کوئی ترکیب سوچی جا سکے۔ اچھا اگر میں اڑنے کا فیصلہ کر بھی لیتا — مگر نہیں، اس سیکنڈ کے 0.9578262 ویں حصے میں کچھ بھی نہیں سوچا جا سکتا تھا، اور جب تک میری سمجھ میں آتا کہ میں گر رہا ہوں، میں زمین پر گر چکا تھا — اور وہ بھی گیلیلیو کے دوسرے قانون کے مطابق (رفتار = قوتِ کشش × وقت) — اس 20 میل فی گھنٹہ کی رفتار اور قوت سے نیچے گرتے وقت میرے سر کا پچھلا حصہ ایک ڈال سے بھی ٹکرا گیا تھا جو کم از کم دو انچ موٹی ضرور رہی ہوگی۔ اس تیز رفتار کے ساتھ گرنے کی وجہ تھی قوتِ کشش۔ یہ قوت نہ صرف سیاروں کے درمیان نظم قائم رکھتی ہے بلکہ ہر چیز کو کھینچنے کی عجیب وغریب صلاحیت بھی رکھتی ہے، ہر چیز کو، بڑی ہو یا چھوٹی، اپنی طرف اسی شدت کے ساتھ کھینچتی رہتی ہے؛ اس قوت کے اثر سے ہم اسی وقت آزادی محسوس کر سکتے ہیں جب ہم پانی کے اندر پیر رہے ہوں یا اپنی ماں کے پیٹ میں ہوں۔ مجبوری کے تحت اس قوتِ کشش کے زیر اثر آنے کے ساتھ ساتھ میرے سر میں اچھا خاصا بڑا سا گومڑا بھی پڑ گیا تھا۔ کچھ ہفتوں میں گومڑا تو خیر چلا گیا، لیکن بعد میں کئی برس تک جب بھی موسم بدلتا، خاص کر جب برف باری ہونے والی ہوتی تو مجھے اس گومڑے والی جگہ پر جھنجھناہٹ اور دپدپاہٹ محسوس ہوتی تھی۔ آج، قریب چالیس برس گذرنے کے بعد بھی میرے سر کے پچھلے حصے میں عمدہ قسم کا بادپیما (barometer) کام کر رہا ہے، بارش ہوگی یا برف باری، موسم پرسکون رہے گا یا طوفان آئے گا، اس کا قیاس کرنے میں میرا یہ بادپیما موسم کا حال بتانے والے شخص سے کہیں زیادہ معتبر ہے۔ اب مجھے اپنے دماغ میں کچھ دھواں سا بھی بھرا ہوا محسوس ہوتا ہے، جس کی وجہ سے میں ہمہ تن ہو کر کسی بات پر پوری طرح توجہ نہیں دے پاتا، اور یہ میرے لیے خاصی پریشانی پیدا کرتا ہے، اور یہ شاید اس سفید سرو کے پیڑ

Scanned with CamScanner

سے گرنے کے حادثے کا بعد میں سامنے آنے والا نتیجہ ہے۔ مثال کے طور پر، اب میرے لیے ایک موضوع پر پوری طرح سے توجہ دینا مشکل ہوتا جا رہا ہے، اب میں اپنے خیال کو صفائی اور آسانی سے ظاہر نہیں کر پاتا، اور جب میں کوئی کہانی سناتا ہوں، جیسے یہ کہانی، تب تو مجھے بہت خیال رکھنا پڑتا ہے کہ کہیں مجھ سے کہانی کا سرا نہ چھوٹ جائے، ورنہ تو میں تفصیل کی دلدل میں ہی پھنس کر رہ جاؤں گا، اور آخر میں یہی بھول جاؤں گا کہ میں بتا کیا رہا تھا۔

تو جناب، پیڑوں پر چڑھنے کے ان دنوں میں، اور میرا یقین کیجیے، میں پیڑ پر چڑھنے میں استاد اور تجربہ کار ہوا کرتا تھا، میں گرا نہیں کرتا تھا!— میں تو ان پیڑوں پر بھی چڑھ جایا کرتا تھا جن میں نیچی ڈالیاں نہیں ہوتی تھیں۔ ایسے پیڑوں پر چڑھنے کے لیے آپ کو پیڑ کے تنے کو اپنے گھٹنوں میں پھنسا کر خود کو اوپر اٹھانا ہوتا تھا، اور میں تو ایک پیڑ سے دوسرے پیڑ پر بھی پہنچ جاتا تھا، میں نے کئی پیڑوں پر باقاعدہ نئی طرز کے گھر بنائے تھے، جن میں چھت ہوتی، کھڑکیاں ہوتیں اور فرش پر قالین بھی۔ جنگل کے بیچ میں تیس فٹ کی بلندی پر رہنا، جب میں اس بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں نے اپنے بچپن کا زیادہ تر وقت پیڑوں پر ہی گذارا ہے؛ وہیں میں انگریزی لفظیات یاد کرتا تھا اور کم استعمال ہونے والے لاطینی افعال اور حساب کے فارمولے اور فزکس کے قوانین، جیسے گیلیلیو کے قوتِ کشش کے قوانین، یہ سب کام پیڑوں پر ہی ہوتا تھا۔ میں اپنے اسکول کا کام بھی پیڑ پر کرتا، پڑھائی اور لکھائی بھی کچھ پیڑ پر ہی ہوتی، اور مجھے پیڑوں کی پتیوں اور ڈالیوں کے جھرمٹ میں بننے والے جھروکوں میں سے جھانکنا بھی بہت پسند تھا۔

پیڑوں کے اوپر بڑا سکون ہوتا تھا، اور آپ وہاں سکون سے رہ سکتے تھے۔ وہاں نہ تو ماں کے پریشان کرنے والے بلاوے ہوتے، نہ بڑے بھائی کے واجب التعمیل احکام مجھ تک پہنچ سکتے تھے، وہاں تو بس ہوا کی سنسناہٹ اور پتیوں کی سرسراہٹ کی آواز ہوتی یا پیڑوں کے تنوں کی نرم چرچراہٹ کی آواز . . . اور وہ منظر، خوبصورت، مسلسل رہنے والے منظر: میں وہاں سے صرف اپنا گھر اور بغیچہ ہی نہیں بلکہ تمام گھروں اور بغیچوں کو دیکھ سکتا تھا، میں وہاں سے پوری جھیل اور جھیل کے آگے دور کے پہاڑوں کو بھی دیکھ سکتا تھا، اور جب شام کے وقت سورج پہاڑوں کے پیچھے ڈوب جاتا اور زمین پر رہنے والوں کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا تب بھی میں پیڑوں کی بلندی سے سورج کو

دیکھ سکتا تھا۔ یہ سب بالکل اتنا ہی مزے دار تھا جتنا کہ اڑنا، لیکن شاید اتنا مزے دار اور زور دار نہیں، مگر نہ اڑ پانے کا یہ ہمیشہ بہتر متبادل رہا، خاص طور سے جیسے جیسے میں بڑا ہوتا گیا۔ اب میں تین فٹ دس انچ لمبا ہو گیا تھا اور میرا وزن بھی ساڑھے تین اسٹون کے برابر تھا، اور یہ سب نہ اڑ سکنے کے لیے بہت تھا، یہاں تک کہ اگر ہوا کا بہت تیز جھونکا بھی چلتا اور میں اپنے کوٹ کے بٹن کھول کر اسے پروں کی طرح پھیلا بھی لیتا تب بھی کچھ نہ ہوتا۔ لیکن پیڑوں پر چڑھنا — جیسا میں سوچتا تھا — یہ ایسا کام ہے جو میں زندگی بھر کر سکتا ہوں۔ یہاں تک کہ ایک سو بیس برس کی عمر کو پہنچنے پر بھی، بوڑھا، رعشہ زدہ ہونے پر بھی، میں الم، بیچ یا سرو کے پیڑ کی پھنگی پر جا کر بیٹھ جایا کروں گا۔ بوڑھے بندر کی طرح ہلکی نرم چلتی ہوئی ہوا میں جھومتی شاخوں پر سے دور دور کی زمینوں اور پانیوں، پہاڑوں اور پہاڑوں کے اس پار دیکھا کروں گا...

لیکن میں یہ کر کیا رہا ہوں، اڑنے اور درختوں پر چڑھنے کی باتیں! گیلیلیو گیلیلی اور اس کے قوتِ کشش کے قوانین کے بارے میں بتا رہا ہوں اور اپنے سر کے پیچھے واقع بادپیا کے بارے میں جس کی وجہ سے میں عجیب سی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہوں! میں تو آپ کو بالکل دوسری ہی بات بتانے والا تھا، ایک کہانی سنانے والا تھا، مسٹر زومر کی کہانی — حالانکہ یہ بھی عجیب سی بات ہے، کیونکہ اصل میں اس طرح کی کوئی کہانی ہے ہی نہیں، وہ تو بس ایک عجیب سی شخصیت کا گذر ہوا تھا میری زندگی میں — بالکل واجبی طور پر — بس کچھ وقت کے لیے۔ مجھے لگتا ہے کہ مجھے یہ قصہ دوبارہ ابتدا سے شروع کرنا چاہیے۔

میرے پیڑوں پر چڑھنے کے پرانے دنوں میں، ہمارے گاؤں میں... یا پھر خاص ہمارے گاؤں اُنٹرن زے میں نہیں بلکہ قریب کے دوسرے گاؤں اوبرن زے میں، گو کہ یہ بالکل صاف نہیں تھا کیونکہ اوبرن زے اور اُنٹرن زے اور دوسرے بھی گاؤں قطعی طور پر اپنا الگ مقام نہیں رکھتے تھے، ان گاؤوں کی ایک لمبی قطار جھیل کے ساتھ ساتھ چلی گئی تھی، ایک کے بعد دوسرا گاؤں بغیر کسی بظاہر شروعات اور خاتمے کے بسا ہوا تھا، بس ایک لکیر میں بغیچے اور گھر اور کھیت اور حمام بنے ہوئے... خیر، دنیا کے اس حصے میں، ہمارے گھر سے مشکل سے ایک میل کے فاصلے پر، ایک صاحب رہتے تھے جن کو ہم لوگ مسٹر زومر کے نام سے جانتے تھے — کسی کو اس بات کا ذرا بھی

اندازہ نہیں تھا کہ مسٹر زومر کا پورا نام کیا ہے، پیٹر یا پال یا ہائن رش یا فرانس زیور، یا وہ ڈاکٹر زومر تھے یا پروفیسر زومر — وہ تو بس مسٹر زومر ہی کے نام سے جانے جاتے تھے۔ نہ تو کسی کو یہ معلوم تھا کہ مسٹر زومر کا تعلق کس کاروبار یا کس پیشے سے ہے، یا پہلے کبھی کس پیشے یا کاروبار سے منسلک رہے ہیں۔ جو کچھ معلوم تھا وہ بس یہ تھا کہ ان کی بیوی کام کرتی ہیں، اور وہ کام تھا گڑیاں بنانے کا۔ ہر روز اپنے گھر میں بیٹھی وہ اون، کپڑے اور لکڑی کی چھیلن سے بچوں کے لیے چھوٹی چھوٹی گڑیاں بنایا کرتی تھیں۔ ان کا یہ گھر پینٹر اور ڈیکوریٹر اشٹانگل مائر کے گھر کے تہہ خانے میں تھا۔ ہفتے میں ایک بار اپنی بنائی ہوئی گڑیوں کی بڑی سی پوٹلی بنا کر مسٹر زومر کی بیوی ڈاک خانے جاتی تھیں۔ وہاں سے واپسی میں وہ پرچون کی دکان جاتیں، نانبائی کے یہاں، قصائی کے یہاں اور ترکاری والے کی دکان پر بھی جاتیں، اور چار بڑے بڑے تھیلے لے کر گھر واپس آتی تھیں، اور پھر وہی ہفتے بھر گھر پر گڑیاں بنایا کرتیں۔ کسی کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ یہ زومر میاں بیوی کہاں سے آئے ہیں۔ وہ تو ایک دن بس آگئے تھے — بیوی بس میں سوار اور مسٹر زومر پیدل — اور پھر اس دن سے دونوں گاؤں میں رہنے لگے تھے۔ نہ تو ان کے کوئی اولاد تھی اور نہ کوئی رشتہ دار اور نہ کبھی کوئی ان سے ملنے آتا تھا۔

ان میاں بیوی، خاص کر مسٹر زومر کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ ہونے کے باوجود یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ اُس وقت آس پاس کے پورے علاقے میں مسٹر زومر سب سے زیادہ پہچانی جانے والی ہستی تھے۔ جھیل سے تقریباً چالیس میل کے حلقے میں کوئی بھی ایسا نہ تھا، نہ مرد نہ عورت نہ بچہ، بلکہ کتا تک، جو مسٹر زومر کی شخصیت سے واقف نہ ہو، یہ اس وجہ سے تھا کہ مسٹر زومر ہمیشہ چلا کرتے تھے۔ ایسا کوئی بھی دن نہ گذرتا تھا جب مسٹر زومر چلتے ہوئے نہ دیکھے جائیں۔ چاہے اولے گر رہے ہوں یا برف پڑ رہی ہو، ہوا کے تیز جھکڑ چل رہے ہوں یا جھما جھم بارش ہو رہی ہو، چاہے چلچلاتی ہوئی دھوپ نکلی ہو یا جھیل کے کنارے طوفان مچا ہوا ہو، مسٹر زومر ان سبھی موسموں میں گھر سے باہر ہوتے اور چل رہے ہوتے تھے۔ وہ اکثر دن نکلنے سے پہلے اس وقت گھر سے نکل پڑتے جب مچھوارے صبح چار بجے جھیل میں جال ڈالنے کے لیے نکلتے تھے، اور دیر رات گئے تک گھر واپس نہ آتے تھے، یہاں تک کہ چاند آسمان کی بلندی پر پہنچ جاتا تھا۔ اس عرصے میں وہ حیرت انگیز فاصلے طے کر لیتے تھے۔ پیدل چلتے ہوئے دن بھر میں پچیس میل کا فاصلہ طے کر کے جھیل کا چکر لگا لینا مسٹر

زومر کے لیے معمولی بات تھی۔ چھ چھ میل کے دو تین چکر لگا لینا مسٹر زومر کے لیے کوئی پریشانی کی بات نہیں تھی! صبح ساڑھے سات بجے آنکھوں میں نیند بھرے جب ہم لوگ اسکول کی طرف جا رہے ہوتے اس وقت کئی گھنٹوں سے چل رہے چاق چوبند مسٹر زومر سے ہمارا سامنا ہوتا؛ دوپہر کے کھانے کے وقت بھوکے اور تھکے ہوئے جب ہم اپنے گھروں کو واپس آ رہے ہوتے تو مسٹر زومر غیر معمولی طور پر لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے ہم کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل جاتے؛ اور پھر اسی رات کو سونے کے لیے بستر پر جانے سے پہلے جب میں کھڑکی سے باہر جھانکتا تو جھیل کے کنارے سڑک پر مسٹر زومر کا نحیف اور لمبا قد ایک سائے کی طرح جلدی جلدی چلتا ہوا دکھائی دے جاتا۔

ان کی ہیئت بڑی نمایاں تھی۔ یہاں تک کہ فاصلہ ہونے کے باوجود بھی ان کو پہچاننے میں غلطی نہیں ہوتی تھی۔ جاڑوں میں، وہ لمبا، کالا، ڈھیلا ڈھالا اور بے حد اکڑا ہوا اوورکوٹ پہنا کرتے تھے، جو ان کے جسم پر ڈھیلے زرہ بکتر کی طرح جھولتا رہتا، اور اس کے ساتھ وہ ولنگٹن بوٹ اور سرخ رنگ کا اونی کنٹوپ بھی پہنتے تھے۔ لیکن گرمیوں میں — اور ہاں، مسٹر زومر کے لیے تو سال میں گرمیوں کا موسم ہی زیادہ رہتا تھا۔ یہ موسم شروع مارچ سے لے کر اکتوبر کے خاتمے تک چلتا — تو گرمیوں میں مسٹر زومر کالے ربن کے ساتھ فلیٹ اسٹرا بوٹ پہنے رہتے، گہری کتھئی رنگ کی لینن کی قمیص اور گھٹنوں تک پہنچتی ہوئی ایک نیکر، جس کا رنگ بھی گہرا کتھئی ہوتا تھا، پہنتے تھے۔ ان کی مضبوط اور لچک دار ٹانگیں، جو بہت پتلی تھیں اور ان پر رگوں اور نسوں کا جال بچھا رہتا تھا، اسی نیکر میں سے نکل کر اونچے اور مضبوط بوٹ میں غائب ہو جاتی تھیں۔ مارچ کے مہینے میں یہ ٹانگیں ایک دم سفید ہو جاتیں اور ان پر گہری نیلے رنگ کی رگیں اتنی نمایاں ہو جاتیں کہ معلوم ہوتا جیسے کسی گنجلک دریائی نظام کا نقشہ ہے؛ اور پھر پندرہ دن کے بعد ہی ان کا رنگ سنہرا ہو جاتا، جولائی تک ان رگوں کا رنگ ان کی قمیص اور نیکر کے رنگ کی طرح گہرا کتھئی پڑ جاتا اور پت جھڑ آتے آتے وہ دھوپ، ہوا اور موسم کی وجہ سے بالکل تونسیا جاتیں، یہاں تک کہ یہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ گوشت میں سے رگیں نکلی ہوئی ہیں یا نسیں۔ مسٹر زومر کی ٹانگیں موٹی چھال والے پرانے پائن کی گانٹھ دار شاخیں لگتی تھیں۔ نومبر کے بعد سے ان کی ٹانگیں سیاہ رنگ کے لمبے کوٹ میں چھپ جاتیں اور پھر بہار میں اپنے اصلی زردی مائل رنگ کے ساتھ نمودار ہوتیں۔

دو چیزیں، جن کے بغیر مسٹر زومر کو کبھی نہیں دیکھا گیا، پورے سال ان کے ساتھ رہتیں: ایک تو ان کی چھڑی اور دوسرا ان کا جھولا۔ یہ چھڑی عام چھڑیوں یا چہل قدمی کرتے وقت استعمال کی جانے والی چھڑیوں کی طرح بالکل نہ تھی بلکہ یہ مسٹر زومر کے شانوں تک پہنچنے والی خاصی لمبی، تھوڑی سی لہرائی ہوئی بادامی رنگ کی چھڑی تھی۔ یہ چھڑی ان کے لیے تیسری ٹانگ کا کام کرتی تھی۔ اس کی مدد کے بغیر نہ تو وہ اتنی تیزی کے ساتھ چل سکتے تھے اور نہ ہی عام پیدل چلنے والوں کے مقابلے میں حیرت انگیز فاصلے طے کر سکتے تھے۔ ہر تیسرا قدم مسٹر زومر اپنے داہنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی کو سامنے کی زمین میں کونچ کر اور پوری طاقت سے خود کو ڈھکیل کر طے کرتے تھے۔ دیکھنے میں ایسا لگتا تھا جیسے ان کے پیر چپو کی طرح چل رہے ہیں اور وہ بہے چلے جا رہے ہیں۔ حالانکہ یہاں ان کو آگے بڑھانے میں پوری طاقت ان کے سیدھے ہاتھ کے شانے سے ہوتی ہوئی چھڑی کے ذریعے زمین تک پہنچتی تھی ــــ نہ کہ اصلی ناؤ چلانے والوں کی طرح جو اپنی سپاٹ پیندے والی ناؤ کو لمبے لمبے بانسوں سے آگے کی طرف ڈھکیلتے ہیں۔ ان کا جھولا ہمیشہ خالی رہتا تھا یا تقریباً خالی کیونکہ اگر کسی کو اس جھولے کے بارے میں کچھ معلوم تھا تو بس اتنا کہ اس میں دوپہر کے کھانے کے لیے ایک سینڈوچ اور ایک ٹوپی والی برساتی کے سوا کچھ نہیں رہتا ہے۔ اس برساتی کو مسٹر زومر بارش ہونے پر پہن لیا کرتے تھے۔

مسٹر زومر کو ان کی آوارہ گردی کہاں لے جاتی تھی؟ ان کی ختم نہ ہونے والی دوڑ کا مقصد کیا تھا؟ آخر مسٹر زومر کو کس بات کی جلدی تھی کہ وہ ایک دن میں بارہ بارہ، چودہ چودہ اور سولہ سولہ گھنٹے بھاگا کرتے تھے؟ کسی کو اس بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔

جنگ ختم ہونے کے بعد جب مسٹر زومر اس گاؤں میں آئے تو کسی نے ان کے اس معمول کی طرف غور بھی نہیں کیا۔ کیونکہ اس وقت تقریباً سبھی جھولا لیے گاؤں کے باہر آتے جاتے دکھائی دیا کرتے تھے۔ اس وقت گاؤں میں نہ تو پٹرول تھا اور نہ کاریں، ایک بس تھی، وہ بھی دن میں صرف ایک بار ہی چلتی تھی، گاؤں میں نہ کچھ جلانے کو تھا اور نہ کچھ کھانے کو، اور اگر دو انڈے چاہیے ہوں یا تھوڑا سا آٹا یا آلو یا تارکول کے کچھ ٹکڑے یا لکھنے کے لیے تھوڑا سا کاغذ یا بلیڈ، تو لوگوں کو اکثر گھنٹوں کی مسافت طے کرنا پڑتی اور جو کچھ کام کا سامان مل پاتا اسے ٹھیلے پر لاد کر گھر لے آتے تھے۔ لیکن دو

Scanned with CamScanner

برس کے بعد ہی گاؤں میں سب کچھ دستیاب ہوگیا، کوئلہ آنے لگا اور اب دن میں پانچ مرتبہ بس کی سروس بھی شروع ہوگئی۔ اس کے کچھ اور سال کے بعد قصائی نے اپنے لیے کار خرید لی اور پھر صدر بلدیہ بھی آگئے اور ایک دندان ساز کے پیچھے پیچھے وکیل صاحب بھی چلے آئے۔ پینٹر اشٹانگل مائر اپنی موٹر بائیک پر اور ان کا بیٹا موپڈ پر دندناتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ بس سروس کی متواتر سہولت کی وجہ سے اب لوگ یہ خواب میں بھی نہیں سوچتے تھے کہ کاروباری یا پاسپورٹ کی تجدید کاری جیسے کام کے لیے چار گھنٹے رگڑتے ہوئے جائیں۔ سوا مسٹر زومر کے۔ مسٹر زومر تب بھی چل رہے تھے، جیسے وہ ہمیشہ چلا کرتے تھے۔ صبح صبح وہ اپنا جھولا ٹانگتے، اپنی چھڑی اٹھاتے اور تیزی کے ساتھ کھیتوں اور میدانوں کو، شاہراہوں اور گاؤں کی سڑکوں کو، جنگلوں اور جھیل کو قصبے کو، پورے پورے گاؤں کو دیر رات تک عبور کیا کرتے۔

ان میں سب سے عجیب بات جو تھی وہ یہ کہ وہ کبھی کسی خاص مقصد کے تحت دوڑ دھوپ نہیں کیا کرتے تھے۔ نہ وہ کچھ خرید کر لاتے اور نہ کچھ بانٹتے۔ ان کے جھولے میں سینڈوچ اور برساتی کے علاوہ کچھ بھی نہ رہتا تھا۔ نہ تو وہ ڈاک خانے جاتے نہ کونسل کے دفتر، انھوں نے تو یہ سب معاملے اپنی بیوی پر چھوڑ رکھے تھے۔ نہ وہ کسی آواز پر غور کرتے اور نہ ہی کہیں رکتے۔ قصبے پہنچنے پر وہ کچھ کھانے یا پینے کے لیے کسی پب میں نہ جاتے، حد تو یہ ہے کہ ذرا دیر ستانے کے لیے کسی بنچ پر بھی نہ ٹکتے، بس فوراً پلٹتے اور سیدھے گھر کی طرف یا کہیں بھی جانے کے لیے چل پڑتے۔ اگر کوئی ان سے پوچھتا، ''مسٹر زومر، آپ کہاں سے آرہے ہیں'' یا یہ کہ، ''آپ کہاں جا رہے ہیں؟'' تو جواب میں جھلا کر اپنے سر کو جھٹکا دیتے، جیسے ناک پر بیٹھی مکھی کو اڑا رہے ہوں، اور کچھ اپنے آپ سے بدبدا کر کہتے بھی۔ ان کی یہ باتیں ایک تو پوری طرح سمجھ میں ہی نہ آتیں یا اگر کچھ پلے پڑتا بھی تو جملے یوں ہوتے: ''بس اسکول والی پہاڑی پر جا رہا ہوں رک نہیں سکتا... جلدی سے جھیل کا ایک چکر لگانا ہے... بہت ضروری کام کے لیے آج قصبے جانا ہے... بہت جلدی ہے اب چلنا چاہیے...''، اور اس سے پہلے کہ آپ ان سے پوچھیں، ''جی، کیا؟ معاف کیجیے؟ کہاں؟'' تب تک تو وہ چھڑی سے زمین کو کھودتے ہوئے ہوا ہو چکے ہوتے تھے۔

صرف اور صرف ایک بار میں نے مسٹر زومر کو پورا جملہ کہتے ہوئے سنا تھا۔ اس جملے میں کوئی

Scanned with CamScanner

غلطی نہیں تھی اور یہ اپنے مطلب کی پورے صاف طور پر وضاحت کرنے والا جملہ تھا، اور میں اس جملے کو کبھی نہیں بھول سکتا، آج بھی یہ جملہ میرے کانوں میں گونجتا ہے۔ یہ واقعہ آخر جولائی کے اتوار کی شام کو پیش آیا تھا جب بھیانک بارش ہو رہی تھی۔ اس دن کی شروعات بڑے خوشگوار موسم کے ساتھ ہوئی تھی، آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا بھی نہیں تھا، شام کو بھی ایسی تیز گرمی ہو رہی تھی کہ بس نیبو اور برف والی ٹھنڈی چائے کے گلاس پینے کا دل چاہ رہا تھا۔ میرے والد مجھے اپنے ساتھ گھڑ دوڑ دکھانے لے گئے تھے، جیسا کہ اکثر وہ اتوار کو مجھے لے جایا کرتے تھے، خود تو وہ ہر اتوار کو ریس دیکھنے ضرور ہی جاتے تھے؛ پیسہ لگانے کے لیے نہیں — میں اس پہلو کی بھی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں — بلکہ اس کھیل سے محض اپنے گہرے لگاؤ کی خاطر جاتے تھے۔ حالانکہ اپنی زندگی میں وہ کبھی گھوڑے پر بیٹھے نہ تھے، وہ تو گھوڑے کے بہت بڑے عاشق اور ناقد تھے۔ مثال کے طور پر انھوں نے 1869 سے جرمن ڈربی جیتنے والوں کے نام حفظ کیے تھے اور وہ بھی تاریخ وار اور اُلٹی تاریخ وار دونوں طرح سے۔ اس کے علاوہ 1910 سے انگلش ڈربی اور French Prix de l'Arc de Triomphe کے خاص خاص فاتحین کے نام بھی ان کو یاد تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ کون سے گھوڑے نازک ہوتے ہیں، کون سے مضبوط ہوتے ہیں، بوڑھے ہونے پر گھوڑے اچھلنے کیوں لگتے ہیں اور جوان گھوڑے کبھی ایک میل سے زیادہ کیوں نہیں دوڑتے۔ ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ گھڑ سوار کا وزن کتنے پاؤنڈ ہوتا ہے اور گھوڑے کے مالک کی بیوی سرخ اور سبز اور سنہرے رنگ کے ربنوں والی ہیٹ کیوں پہنتی ہے۔ میرے والد نے گھوڑے سے متعلق خاص کتب خانہ تیار کیا تھا جس میں پانچ سو کتابیں تھیں۔ اور آخر عمر میں تو انھوں نے ایک گھوڑا بھی خرید لیا تھا — وہ بھی دبلا پتلا سا — اس گھوڑے کو وہ اپنے نشان کے ساتھ ریس میں دوڑانا اور چھ ہزار مارک جیتنا چاہتے تھے، اور اس بات سے میری ماں باقاعدہ خوفزدہ ہو گئی تھیں — لیکن یہ ایک الگ قصہ ہے جسے میں کسی دوسرے موقعے پر سناؤں گا۔

تو ہم لوگ گھڑ دوڑ دیکھنے جایا کرتے تھے اور وہاں سے ہمیشہ کی طرح شام کے وقت واپس گھر لوٹ رہے تھے۔ اس وقت بھی سخت گرمی ہو رہی تھی، بلکہ دوپہر سے بھی زیادہ گرمی اور چپچپاہٹ ہو رہی تھی، لیکن اب آسمان پر ہلکی دھند بھی چھا گئی تھی۔ مغرب کی طرف سیسے کے رنگ کے بادل تھے

جن کے کنارے زردی مائل ہورہے تھے۔ پندرہ منٹ کے بعد ہی میرے والد کو کار کی ہیڈ لائٹ جلانا پڑ گئی تھی کیونکہ اب بادل ایک دم سے جمع ہو گئے تھے، انھوں نے افق کو دھندلا کر دیا تھا جس کی وجہ سے گاؤں کے باہر کا پورا علاقہ اندھیرے میں ڈوب گیا تھا۔ اس کے بعد پہاڑی پر سے ہوا کے کچھ جھونکے چلے اور مکئی کے کھیتوں پر پھیل گئے۔ کھیت ہوا میں لہرانے لگے اور چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں میں ہلچل پیدا ہوگئی۔ تقریباً اسی وقت بارش بھی شروع ہوگئی، نہیں، ابھی باقاعدہ بارش شروع نہیں ہوئی تھی بلکہ انگور کے دانوں کے برابر غیر معمولی طور پر بڑی بڑی بوندیں سڑک پر بکھرنے اور کار کے ریڈی ایٹر اور شیشے سے ٹکرانے لگیں۔ اس کے بعد تو طوفان ہی آگیا۔ بعد میں اخبار سے معلوم ہوا کہ اس علاقے میں گذشتہ بائیس برس میں اتنا زبردست طوفان کبھی نہیں آیا تھا۔ میں اس کی تصدیق نہیں کرسکتا کیونکہ اس وقت میں صرف سات برس کا تھا۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ پھر کبھی اپنی پوری زندگی میں ایسے طوفان سے میرا سابقہ نہیں پڑا، کم از کم کھلی سڑک پر کار میں بیٹھے ہوئے تو نہیں۔ پانی کی بوندیں نہیں برس رہی تھیں بلکہ آسمان سے پانی کی چادریں نیچے آرہی تھیں۔ ذرا ہی دیر میں پوری سڑک دھل گئی۔ کار پانی میں ڈوبی ہوئی تھی اور اس کے دونوں طرف سے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ کار کے شیشے پر تو پانی جیسے رکا ہوا سا معلوم ہورہا تھا جبکہ وائپر پوری تیزی کے ساتھ چل رہے تھے۔

پھر صورت حال اور بدتر ہوگئی۔ دھیرے دھیرے بارش اولوں میں تبدیل ہوگئی، اس وقت ہم یہ فرق دیکھنے سے پہلے سن سکتے تھے۔ ہوا کی تیز سنسناہٹ سخت کھڑکھڑاہٹ اور ٹنٹناہٹ میں بدل گئی۔ ہم نے بھی یہ تبدیلی محسوس ہی کی کیونکہ پوری کار جما دینے والی سردی کی گرفت میں تھی۔ پھر ہم نے اولے دیکھے، پہلے تو وہ آل پن کے سرے سے بڑے نہ تھے، پھر وہ مٹر کے برابر ہوئے، پھر کنچوں کے برابر، اور آخر میں تو گولف کی گیند کے برابر سفید اور سبک اولوں کے جھنڈ تڑتڑ کر کے کار کے بونیٹ سے ٹکرانے لگے۔ ان کو دیر تک دیکھنے سے میرا دماغ چکرانے لگا تھا۔ اب ایک گز بھی کار چلانا ناممکن تھا لہٰذا میرے والد نے کار سڑک کے کنارے روک دی — سڑک کے کنارے، سڑک تو دکھائی ہی نہیں دے رہی تھی، معلوم نہیں انھوں نے کار کہاں روکی تھی، کسی کھیت کے کنارے یا کسی پیڑ کے کنارے یا کسی اور دوسری چیز کے کنارے۔ اس وقت مشکل سے آپ اپنے سامنے پانچ فٹ تک

Scanned with CamScanner

دیکھ سکتے تھے، اور ان پانچ فٹ میں لاکھوں برفیلی بلیئرڈ گیندیں ہوا میں ناچتی ہوئی آکر کار سے ٹکرا کر بھیانک ٹنٹناہٹ کی آوازیں پیدا کر رہی تھیں۔ کار کے اندر اتنا شور تھا کہ ہم بات نہیں کر سکتے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہم کسی بہت بڑے سے ڈھول میں بیٹھے ہیں اور اس کے اوپر ایک دیو بیٹھا اسے بری طرح سے پیٹ رہا ہے۔ ہم بس ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور کانپ رہے تھے اور خاموشی سے اپنے اس حفاظتی ڈبے کے تباہ نہ ہونے کی دعا کر رہے تھے۔

بس دو منٹ کے اندر اندر یہ سب ختم ہو گیا۔ اگلے لمحے ہی اولے گرنا بند ہو گئے اور ہوا بھی دھیمی پڑ گئی۔ اب بس ہلکی اور نرم پھوار گر رہی تھی۔ سڑک کے کنارے کے کھیت، جہاں پہلے ہوا کے جھونکے اترے تھے، اب زمین پر بالکل لیٹ چکے تھے۔ مکئی کے کھیت میں چند ٹھنٹھوں کے سوا کچھ بھی نہ بچا تھا۔ سڑک ایسی لگ رہی تھی جیسے اس پر ٹوٹے ہوئے شیشے کے ٹکڑے بکھیر دیے گئے ہوں — جہاں تک نگاہ جاتی تھی بس کچلے ہوئے اولے، پتیاں اور ٹوٹی ہوئی ٹہنیاں اور مکئی کے چھلکے دکھائی دے رہے تھے۔ ٹھیک سڑک کے خاتمے پر میں نے پھوار سے دھندلاتے ہوئے ایک آدمی کے پیکر کو جاتے ہوئے دیکھا۔ میں نے اپنے والد کی توجہ بھی اس طرف کرائی، اور پھر ہم دونوں دور سے اس چیز کو دیکھنے لگے۔ اور یہ سب کچھ ہمارے لیے کسی معجزے کی طرح تھا کہ کوئی دروازے کے باہر ہے، چل رہا ہے، جی ہاں، اور یہ کہ کوئی اب تک سیدھا کھڑا ہے، جبکہ چاروں طرف سب کچھ جھکایا جا چکا ہے، برباد کیا جا چکا ہے۔ اولوں کو کچلتی ہوئی ہماری کار آگے بڑھی، جیسے ہی ہم اس کے قریب پہنچے، میں نے نیکر، ابھرے ہوئے گھٹنے، سفید چمکتی ہوئی ٹانگیں، جھولے کی وجہ سے پیٹھ پر ابھری ہوئی کالی برساتی، اور مسٹرزومر کی پہچانی چال کو پہچان لیا۔

جیسے ہی ہم ان کے قریب پہنچے میرے والد نے مجھ سے کھڑکی کے شیشے کو نیچے کرنے کے لیے کہا — باہر برفیلی ہوا چل رہی تھی۔ ''مسٹرزومر!'' میرے والد نے پکارا۔ ''اندر آجائیے! ہم لوگ آپ کو لفٹ دے دیں گے!'' آگے ان کے لیے جگہ خالی کرنے کے لیے میں پیچھے کی سیٹ پر چڑھ گیا۔ مسٹرزومر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ رکے بھی نہیں۔ انھوں نے تو ہماری طرف دیکھا تک نہیں۔ تیز تیز لمبے ڈگوں کے ساتھ، خود کو چھڑی سے ڈھکیلتے ہوئے وہ بدستور اولوں سے بھری سڑک پر چلتے رہے۔ میرے والد نے بھی کار ان کے پیچھے بڑھا دی۔ ''مسٹرزومر!'' انھوں نے کھلی کھڑکی

میں سے پکار کر کہا۔ ''مہربانی کر کے اندر آجایئے! ایسے موسم میں! ہم آپ کو گھر چھوڑ دیں گے!'' لیکن مسٹر زومر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بغیر ہمت ہارے وہ چلتے رہے۔ مجھے ایسا لگا کہ میں نے ان کے ہونٹوں کو نہ سنائی دینے والے جواب بناتے ہوئے دیکھا۔ لیکن مجھے کچھ سنائی نہیں دیا، شاید ان کے ہونٹ سردی کی وجہ سے تھرتھرا رہے تھے۔ پھر میرے والد اپنی سیٹ پر بالکل آگے کی طرف جھک گئے — اس دوران پورے وقت وہ مسٹر زومر کے ساتھ ساتھ کار چلا رہے تھے — میرے والد نے کار کے کھلے دروازے کو پکڑا اور چلائے، ''اب، خدا کے لیے، اندر آجایئے! آپ بالکل شرابور ہو گئے ہیں! آپ سردی سے اکڑ کر موت کو دعوت دے دیں گے!''

اب، یہ فقرہ ''آپ سردی سے اکڑ کر موت کو دعوت دے دیں گے!'' اصل میں میرے والد کی شخصیت سے بالکل میل نہیں کھاتا تھا۔ میں نے ان کو کبھی کسی سے یہ کہتے ہوئے نہیں سنا تھا، ''آپ سردی سے اکڑ کر موت کو دعوت دے دیں گے!'' ''یہ فقرہ بڑا فرسودہ ہے،'' اگر وہ اسے کہیں سنتے یا پڑھتے تو یہی کہتے، ''اور فرسودہ — تم کو میں ہمیشہ کے لیے بتائے دے رہا ہوں — ایک ایسا فقرہ ہوتا ہے جو اکثر و بیشتر بہت زیادہ اور ہرایرے غیرے کی تحریر میں استعمال ہو چکا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے یہ مکمل طور پر اپنے معنی سے محروم ہو جاتا ہے۔'' گھوڑوں میں دلچسپی والے اپنے استقلال کے ساتھ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہتے، ''یہ اتنا ہی ہلکا اور احمقانہ ہے جیسے یہ جملے: 'ایک عمدہ چائے کی پیالی ہو، میرے دوست، اور پھر یہ تمھیں حقائق سے جوڑ دے گی!' یا یہ فقرہ: 'ہمارے مریض کی اب کیسی حالت ہے، ڈاکٹر؟ کیا آپ کو لگتا ہے کہ وہ یہ سب جھیل لے گا؟' اس طرح کے جملے دل سے نہیں بلکہ گھٹیا ناول اور بے وقوفی کی فلموں سے نکلتے ہیں، اور اس لیے — میں تم کو ہمیشہ کے لیے بتا رہا ہوں — اس طرح کے جملے میں کبھی تمھارے منھ سے نہ سنوں!''

''آپ سردی سے اکڑ کر موت کو دعوت دے دیں گے!'' اس قسم کے جملوں کے بارے میں میرے والد کے یہ خیالات تھے۔ لیکن اس دن، اولوں سے پٹی ہوئی، گاؤں کی سڑک پر ہلکی پھوار میں، مسٹر زومر کے ساتھ ساتھ گاڑی چلاتے ہوئے، میرے والد کار کا دروازہ کھولے ہوئے انھیں فرسودہ قسم کے جملوں میں سے ایک کو پوری آواز کے ساتھ ادا کر رہے تھے: ''آپ سردی سے اکڑ کر موت کو دعوت دے دیں گے!'' اور تب مسٹر زومر تھمے۔ میرا خیال ہے جب انھوں نے یہ لفظ

سنے: ''سردی سے اکڑ کر موت ...'' تو وہ رک گئے تھے، بالکل ساکت ہو گئے تھے، وہ ایک دم سے جوڑ کے تو میرے والد کو پورے زور سے بریک لگا کر کار کو روکنا پڑا تھا، ورنہ تو وہ انھیں پیچھے چھوڑ کر آگے نکل جاتے۔ اور پھر مسٹر زومر نے اپنی لہرائی ہوئی چھڑی کو اپنے داہنے ہاتھ سے اپنے بائیں ہاتھ میں لیا، اور ہماری طرف گھومے، اور، چڑچڑے پن اور جھلاہٹ کے ساتھ اپنی چھڑی کو زمین پر لگاتار مارتے ہوئے انھوں نے بلند اور صاف لہجے میں یہ جملہ کہا: ''آپ مجھے سکون سے کیوں نہیں رہنے دیتے!'' بس اتنا ہی بولے۔ صرف یہی ایک جملہ۔ پھر انھوں نے کار کے دروازے کو دھڑاک سے بند کیا، چھڑی کو واپس اپنے داہنے ہاتھ میں لیا، اور ایک بار بھی پیچھے دیکھے بغیر، بس چل دیے۔

''یہ تو بالکل سنکی ہیں،'' میرے والد بولے۔

جب ہماری کار ان کے پاس سے گذری تو میں نے کھڑکی میں سے ان کے چہرے کو دیکھا۔ وہ اپنی نظریں سڑک پر جمائے ہوئے تھے، لیکن ہر چند قدم کے بعد وہ اپنے سامان پر بھی نظر ڈال لیتے — ان کی آنکھیں پھٹی ہوئی اور دہشت زدہ لگ رہی تھیں۔ ان کے گالوں پر سے پانی بہہ رہا تھا اور ناک اور ٹھڈی سے بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ ان کا منھ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ ایک بار پھر مجھے لگا جیسے ان کے ہونٹ ہل رہے ہیں — شاید چلتے میں وہ خود سے باتیں کر رہے تھے۔

2

''مسٹر زومر کو کلوسٹروفوبیا ہے،'' میری ماں بولیں، جب ہم سب لوگ کھانے کی میز پر بیٹھے طوفان اور مسٹر زومر والے واقعے کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ ''انھیں سخت قسم کا کلوسٹروفوبیا ہے، یہ ایک قسم کی ایسی بیماری ہوتی ہے جس میں مریض کے لیے سکون سے کمرے میں بیٹھنا ناممکن ہو جاتا ہے۔''

''پوری وضاحت کرو،'' میرے والد بولے، ''کلوسٹروفوبیا کا مطلب کیا ہے —''

''یہی کہ مریض سکون سے کمرے میں بیٹھ نہیں سکتا،'' میری ماں نے وضاحت کر دی۔ ''ڈاکٹر لُختر ہنڈ نے تو مجھے یہی بتایا تھا۔''

''یہ لفظ 'کلوسٹروفوبیا' لاطینی اور یونانی زبان سے مل کر بنا ہے،'' میرے والد نے بتایا۔ ''اور

مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر ٹکٹر ہنڈ بھی یہ بات بخوبی جانتے ہوں گے۔ یہ دو ٹکڑوں سے مل کر بنا ہے، ’کلوسٹرم‘ اور ’فوبیا‘۔ ’کلوسٹرم‘ کا مطلب ہوتا ہے ’بند‘ یا ’قید‘ — جیسے ایک لفظ ہے ’خلوت گاہ‘، یا جیسے ایک قصبے کا نام ہے کلاوزین، اطالوی لفظ ’کیوسا‘ یا فرانسیسی میں ’ڈوکلیوز‘ — کیا تم میں سے کوئی مجھے اس قسم کے دوسرے کسی لفظ کی مثال دے سکتا ہے جس میں ’کلوسٹرم‘ موجود ہو؟‘‘

’’اصل میں،‘‘ میری بہن بولی، ’’میں نے ریٹا اشٹانگل مائر سے سنا ہے کہ مسٹر زومر سخت قسم کے تشنج کے شکار ہیں — ان کے پورے بدن میں رعشہ ہے۔ ان کی حالت بالکل فِجٹی فِلپ[1] کی سی ہے، ریٹا بتا رہی تھی کہ جیسے ہی وہ کرسی پر بیٹھتے ہیں، ان پر رعشہ دوڑنے لگتا ہے۔ بس چلتے وقت ان پر رعشہ اثر نہیں کرتا، اور اسی لیے وہ ہر وقت چلتے رہتے ہیں تاکہ کسی کو ان کی اس بیماری کے بارے میں معلوم نہ ہو سکے۔‘‘

’’یہ تو بالکل ویسی ہی کیفیت ہے جو ایک سال سے ذرا بڑے یا دو برس کے گھوڑوں میں ان کی پہلی ریس شروع ہونے سے پہلے ہوتی ہے، اضطراب کے عالم میں ان کے بھی پورے بدن تھرتھرانے لگتے ہیں۔ ایسی صورت میں ان گھوڑوں کو ریس شروع ہونے تک بِھر آنے سے روکے رکھنے میں گھڑ سوار کو بڑی محنت کرنا پڑتی ہے — بعد میں یا تو وہ اس موقعے پر گھبرانا چھوڑ دیتے ہیں یا ان کو اندھیاری پہنا دی جاتی ہے۔ اچھا تم میں سے کون مجھے بِھر آنے کا مطلب بتائے گا؟‘‘

’’بیکار کی بات!‘‘ میری ماں نے کہا۔ ’’اچھا اگر مسٹر زومر آپ کی کار میں آ جاتے اور ان پر رعشہ چڑھنے لگتا تو کیا آپ ان کے رعشے سے پریشان نہ ہوتے!‘‘

’’مجھے افسوس ہے،‘‘ میرے والد بولے، ’’یہی وجہ تھی جو انھوں نے ہماری لفٹ قبول نہیں کی، کیونکہ میں نے ان کے لیے بڑا فرسودہ قسم کا فقرہ استعمال کیا تھا۔ میں نے کہا تھا، ’آپ سردی سے اکڑ کر موت کو دعوت دے دیں گے!‘ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ مجھ سے اس قسم کی حرکت

---

[1] ڈاکٹر ہائنرش ہوفمین کی 1845 میں لکھی ہوئی The Story of Fidgety Philip کا مرکزی کردار۔ یہ بچہ، جیسا کہ بعد کی طبی تحقیق سے معلوم ہوا، Attention-Deficit/Hyperactivity Disorder یا ADHD میں مبتلا تھا جس میں مریض اپنے اردگرد کی چیزوں پر پوری توجہ نہیں دے پاتا اور بعض صورتوں میں بڑی بے صبری سے مختلف قسم کی تیز تیز حرکتیں کیا کرتا ہے۔

Scanned with CamScanner

ہوئی کیسے۔ مجھے پورا یقین ہے، اگر میں ذرا عامیانہ سا فقرہ استعمال کرتا تو وہ ضرور خوشی خوشی ہمارے ساتھ آجاتے، جیسے اگر میں یوں . . . ''

''بس بھی کیجئے،' میری ماں بول اٹھیں۔ ''وہ اندر قطعی نہ آتے کیونکہ انھیں کلوسٹروفوبیا ہے، اور جس کا مطلب ہے وہ بند کار میں بیٹھنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں جیسے بند کمرے میں۔ چاہے آپ ڈاکٹر لُختر ہَنڈ سے پوچھ لیجئے! جیسے ہی وہ خود کو کسی بند جگہ میں پاتے ہیں — چاہے وہ کار ہو یا کمرہ — ان پر دورے پڑنے لگتے ہیں۔''

''دورے کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''شاید،'' میرا بڑا بھائی بولا، جو مجھ سے پانچ برس بڑا تھا، اور گرِمس کی سبھی کہانیاں پڑھ چکا تھا، ''شاید مسٹر زومر بچوں کی کہانی How Six Travelled through the World کے واکر (Walker) کی طرح ہیں، جو ایک دن میں پوری دنیا کا چکر لگا سکتا ہے۔ واپس گھر آنے پر اُسے اپنا ایک پیر چمڑے کی پٹی سے باندھنا پڑتا ہے، کیونکہ یہی ایک طریقہ ہے جس سے وہ رُک سکتا ہے۔''

''بالکل، بالکل! یہ ایک اور امکان ہے جس پر غور کیا جانا چاہیے،'' میرے والد بولے۔ ''شاید مسٹر زومر کا ایک پیر بہت زیادہ چلتا ہے، اور وہ ان کو ہمیشہ چلتے رہنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔ ہمیں ڈاکٹر لُختر ہَنڈ سے کہنا چاہیے کہ وہ ان کے ایک پیر کو باندھ دیں۔''

''کیا بے وقوفی کی باتیں ہو رہی ہیں،'' میری ماں بولیں، ''ان کو کلوسٹروفوبیا ہے، بس اور کچھ نہیں، اور آپ لوگ کلوسٹروفوبیا کا کچھ نہیں کر سکتے۔''

جب میں سونے کے لیے بستر پر لیٹا تو یہ عجیب لفظ بڑی دیر تک میرے سر میں گھومتا رہا: کلوسٹروفوبیا۔ میں نے کئی کئی بار اس لفظ کو دہرایا تاکہ میں اسے بھول نہ جاؤں: کلوسٹروفوبیا . . . کلوسٹروفوبیا . . . مسٹر زومر کو کلوسٹروفوبیا ہے . . . جس کا مطلب ہے وہ کمرے میں ٹھہر نہیں سکتے . . . اور جب وہ کمرے میں ٹھہر نہیں سکتے اس کا مطلب ان کو چلتے ہی رہنا ہے . . . چونکہ ان کو کلوسٹروفوبیا ہے لہٰذا ان کو چلتے رہنا ہے . . . لیکن اگر ''کلوسٹروفوبیا'' اور ''اپنے — کمرے — میں — نہ — ٹھہر — سکنا'' ایک ہی بات ہے اور، ''اپنے کمرے — میں — نہ — ٹھہر — سکنا'' اور ''چلتے — ہی

— رہنا'' ایک ہی مطلب ہے، تو '' چلتے — ہی — رہنا'' اور '' کلوسٹروفوبیا'' دونوں کا مطلب بھی ایک ہی ہوا... تو پھر اس ثقیل لفظ '' کلوسٹروفوبیا'' کے بجائے '' چلتے — ہی — رہنا'' زیادہ آسانی سے کہا جا سکتا ہے... لیکن اس طرح سے کہنے کا کیا مطلب تھا جب میری ماں نے کہا تھا: '' مسٹر زومر کو بس چلتے رہنا ہے کیونکہ انھیں کلوسٹروفوبیا ہے،'' وہ یوں بھی تو کہہ سکتی تھیں، '' مسٹر زومر کو بس چلتے رہنا ہے کیونکہ ان کو بس 'چلتے رہنا' ہے...''

اور اس کے ساتھ ہی مجھے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہونے لگا، لہٰذا میں جلد سے جلد اس نئے الجھنی لفظ کو اور اس سے جڑی تمام باتوں کو بھول جانا چاہتا تھا۔ اس کے بدلے، میں نے یہ سوچنے کی کوشش کی کہ مسٹر زومر کسی طرح کی بیماری یا علت میں گرفتار نہیں ہیں، بلکہ وہ تو اس لیے ٹہلنے جاتے ہیں کہ ان کو چلتے رہنے میں مزہ آتا ہے، بالکل اُسی طرح جس طرح مجھ کو پیڑوں پر چڑھنے میں مزہ آتا ہے۔ مسٹر زومر یوں جو چلا کرتے ہیں تو اس میں ان کو خوشی ملتی ہے اور وہ اس سے محظوظ ہوتے ہیں، بس اس کے سوا اور کوئی بات نہیں ہے، اور وہ تمام تفصیلات اور لاطینی لفظ جو کھانے پر سامنے آئے تھے زبردستی کی گڑھی ہوئی باتیں تھیں، جیسے اُس کہانی How Six Travelled through the World کے کردار کا اپنا پیر باندھ لینا۔

کچھ دیر بعد، گو کہ مجھے مسٹر زومر کا چہرہ اچھی طرح یاد تھا، جب میں نے انھیں کار کی کھڑکی میں سے جاتے ہوئے دیکھا تھا، ان کے چہرے پر سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں اور ان کا منھ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا اور غیر معمولی طور پر پھٹی ہوئی وحشت زدہ آنکھیں، تب میں نے سوچا: اس صورت سے نہیں لگتا کہ وہ مزے میں تھے؛ کسی کی بھی صورت مزے اور تفریح کے وقت ایسی نہیں بنتی ہے۔ یہ تو وہ تاثرات تھے جب کوئی بے حد دہشت زدہ ہو؛ جیسے بہت پیاسا ہو؛ جیسے وہ بارش میں چلتے ہوئے پیاس سے مرا جا رہا ہو؛ ایسی پیاس کہ پوری جھیل پی جائے۔ اور اس کے ساتھ ہی میرا دماغ اور زیادہ چکرانے لگا، اور میں مسٹر زومر کے چہرے کو بھولنے کی پوری کوشش کرنے لگا، لیکن میں نے اسے بھولنے کی جتنی زیادہ کوشش کی ان کا چہرہ اتنا ہی نمایاں ہوتا گیا، بالکل صاف تصویر کی طرح: ایسی کہ میں ان کے چہرے کی ایک ایک لکیر اور جھری کو، پسینے اور بارش کے پانی کی ایک ایک بوند کو، ان کے ہونٹوں کی خفیف سی لرزش کو، جیسے وہ کچھ بدبدا رہے ہوں، دیکھ سکتا تھا۔ اور پھر ان کے

Scanned with CamScanner

بدبدانے کی آواز تیز ہونے لگی اور بالکل واضح ہوگئی، یہاں تک کہ میں مسٹر زومر کی التجا کرتی ہوئی آواز کو سن سکتا تھا، ''آپ مجھے سکون سے کیوں نہیں رہنے دیتے! آپ مجھے سکون سے کیوں نہیں رہنے دے سکتے۔۔۔!''

اور بس، اس آواز کے سنتے ہی میں نے ان کے بارے میں سوچنا بند کر دیا۔ ان کا چہرہ غائب ہوگیا، اور میں جلد ہی سو گیا۔

3

اسکول میں، میری کلاس میں ایک لڑکی تھی، کیرولینا کوکلمان۔ اس کی آنکھیں سیاہ تھیں، بھنویں کالی تھیں اور اس کے بال گہرے بھورے رنگ کے تھے جو اس کی داہنی کنپٹی پر لہراتے رہتے تھے — اس کی گدی اور کانوں کی لووں اور گلے کے درمیان جو ہلکا سا گڈھا تھا وہاں کی جلد بڑی دمکتی ہوئی تھی، اس پر ہلکے ہلکے روئیں تھے جو سورج کی روشنی میں چمکتے تھے اور کبھی کبھی ہوا سے ہلنے بھی لگتے تھے۔ جب وہ ہنستی تھی، اپنی دلکش پھنسی پھنسی آواز میں، تو وہ اپنے سر کو پیچھے داہنی طرف جھٹکا دیتی تھی، ہنسنے میں اس کا چہرہ شوخی سے دمک اٹھتا، یہاں تک کہ اس کی آنکھیں بالکل بند ہو جاتیں۔ میں اس چہرے کو ہمیشہ تکتا رہ سکتا تھا، اور میں جب چاہتا اس چہرے کو دیکھ سکتا تھا، کلاس کے دوران یا بریک میں — لیکن میں اسے دیکھنے میں بہت احتیاط برتتا تھا، تاکہ ایسا کرتے ہوئے کوئی مجھے دیکھ نہ لے، خود کیرولینا بھی، کیونکہ میں بے حد شرمیلا تھا۔۔۔

میں اپنے خوابوں میں اتنا شرمیلا نہیں رہتا تھا۔ وہاں تو میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے جنگل میں لے جاتا اور اس کے ساتھ پیڑوں پر چڑھتا تھا۔ اس کے ساتھ پیڑوں کی ڈالوں پر بیٹھتا، اس کے چہرے کو غور سے دیکھتا، اور اسے کہانیاں سناتا تھا۔ اپنے سر کو پیچھے جھٹکا دے کر اور آنکھیں بند کر کے، وہ خوب ہنستی تھی، اور مجھے اس کی گدی کے بالوں اور کانوں پر پھونکنے کی چھوٹ بھی تھی۔ ہفتے میں کئی کئی بار میں اس طرح کے خواب دیکھتا تھا۔ میں شکایت نہیں کر رہا ہوں، وہ حسین خواب تھے، لیکن بس خواب ہی تھے، اور تمام خوابوں کی طرح ہی وہ بھی اطمینان بخش نہیں ہوتے تھے۔ حقیقت میں کیرولینا کے ساتھ کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا تھا، بس ایک بار، اس کی گدی پر پھونکنا چاہتا تھا، یا کچھ

Scanned with CamScanner

بھی۔ ۔ ۔ لیکن بدقسمتی سے اس کا امکان بہت کم تھا، کیونکہ، کلاس کے تمام بچوں کی طرح کیرولینا بھی اوبرن زے میں رہتی تھی، اور بس اکیلا میں تھا جو اُنٹرن زے میں رہتا تھا۔ اسکول کے گیٹ سے باہر نکلتے ہی ہمارے راستے الگ ہو جاتے تھے، اسکول کی پہاڑی سے مختلف سمتوں میں اترتے ہوئے ہمارے راستے میدان کو پار کرتے ہوئے جنگل میں داخل ہو جاتے، اور، جب وہ جنگل میں غائب ہو جاتے تو ان میں اتنا فاصلہ ہو جاتا تھا کہ میں دوسرے بچوں میں کیرولینا کو پہچان نہ پاتا تھا۔ بس کبھی کبھی میں کیرولینا کے ہنسنے کی آواز سن سکتا تھا۔ صرف خاص موسموں میں، جب ہوا جنوب کی طرف سے چل رہی ہو، اس کے ہنسنے کی چھنی چھنی آواز میدانوں کو طے کرتی ہوئی گھر تک میرے ساتھ چلتی — لیکن ہمیشہ جنوب کی طرف سے ہوا کب چلتی ہے!

ایک دن — ہفتے کو — ایک معجزہ ہوا۔ بریک کے بیچ میں ایک دھماکا، کیرولینا دوڑتی ہوئی آئی، میرے سامنے آکر رُک گئی اور بولی، ''ارے سنو! تم ہمیشہ اُنٹرن زے جاتے ہو، ہے نا؟''

''ہاں،'' میں نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے! تو پیر کو میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گی۔ ۔ ۔''

اور اس کے بعد وہ تفصیلات بتانے لگی، اُنٹرن زے میں اس کی ماں کی ایک دوست رہتی ہیں، اور ان دوست کے گھر سے اس کی ماں اسے لینے آئیں گی، اور پھر وہ اور اس کی ماں، یا وہ اور اس کی ماں کی دوست، یا وہ اور اس کی ماں اور اس کی ماں کی دوست۔ ۔ ۔ مجھے اب یاد نہیں، میں بھول گیا ہوں، مجھے بس یہ یاد ہے کہ جو کچھ وہ بتا رہی تھی وہ میرے ایک کان میں جاتا اور دوسرے سے باہر نکل آتا تھا، کیونکہ میں ایسا مبہوت تھا، اس کے یہ کہنے پر، ''تو پیر کو میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گی!'' کہ میں اور کچھ نہ سمجھ رہا تھا اور نہ سمجھ سکتا تھا، بس وہ ایک حسین جملہ: ''تو پیر کو میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گی!''

اس پورے دن، اصل میں پورے ہفتے، یہ جملہ میرے کانوں میں گونجتا رہا، یہ جملہ کتنا حسین تھا — آہ، کیا بتاؤں! یہ جملہ تو برادرزِ گرِم کی کہانیوں میں میرے پڑھے ہوئے تمام جملوں سے کہیں حسین تھا، The Frog Prince کہانی میں شہزادی کے وعدے سے بھی حسین، جہاں وہ کہتی ہے، ''میری سنہری پلیٹ میں سے کھاؤ، میرے کپ میں سے پیو، اور میرے چھوٹے سے بستر میں سو

Scanned with CamScanner

جاؤ۔" اور میں نے ہفتے کے دن اس بے صبری سے گنے کہ Rumpelstiltskin نے کیا بے صبری سے دن گنے ہوں گے:

Today I stew, and then I'll bake
Tomorrow I shall the Queen's child take!

مجھے *Lustig* *Brother* *and* *Luck* کے ہانس اور *Golden* *Mountain* کے بادشاہ کبھی کا تاثر یہی لگ رہا تھا... "تو پیر کو میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گی!"

میں نے بڑی تیاریاں کی تھیں۔ ہفتے اور اتوار کو میں نے سب سے معقول راستے کی کھوج میں جنگل کو چھان مارا۔ کیونکہ یہ ظاہر بات تھی کہ میں کیرولینا کو اپنے روزانہ کے راستے سے نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میرے ساتھ وہ میرے تمام خفیہ راستوں کو دیکھے، میں اسے اپنے سب سے زیادہ چھپے ہوئے، نظروں سے اوجھل رہنے والے راستے دکھانا چاہتا تھا: میرے، یا پھر ہمارے، اُنٹرن زے کے راستے کی خوبصورتی، جسے وہ دیکھے تو اس کے مقابلے میں اوبرن زے کے راستے کی یاد اس کے ذہن میں دھندلی پڑ جائے۔

طویل غور و خوض کے بعد میں نے ایک راستہ طے کر لیا جو جنگل شروع ہوتے ہی سڑک سے کٹ جاتا تھا، یہ راستہ تنگ گھاٹی سے ہوتا ہوا چھوٹے چھوٹے سرو کے جھنڈ تک پہنچتا، اور وہاں سے کائی لگی ہوئی زمین سے پتے جھڑے ہوئے پیڑوں کے جنگل سے ہوتا ہوا جھیل کی طرف سیدھی ڈھال اتر جاتا تھا۔ اس راستے پر کم از کم چھ ایسے قابلِ دید مقامات تھے جن کو میں اپنی مبصرانہ تفسیر کے ساتھ کیرولینا کو دکھا سکتا تھا۔

ان مقامات کی ترتیب یوں تھی:

(الف) راستے سے ذرا ہٹ کر بجلی کمپنی کا ایک ٹرانسفارمر، جس سے مسلسل بھنبھناہٹ کی آواز نکلتی رہتی تھی اور اس کے دروازے پر پیلے رنگ سے ایک نشان بنا ہوا تھا اور سرخ رنگ کا ایک بلب جلتا رہتا تھا اور یہ لفظ بھی لکھے ہوئے تھے: "خبردار — ہائی وولٹیج — موت کا خطرہ!"؛

(ب) ریسپبیری کی سات جھاڑیاں، جن میں کچھ پکی ہوئی ریسپبیریاں بھی تھیں؛

(ج) ہرنوں کی ایک ناند— جس میں اب گھاس نہیں تھی سوائے چاٹنے والے ایک بڑے سے پتھر کے؛

(د) ایک پیڑ جس کے بارے میں بتایا جاتا تھا کہ جنگ کے بعد ایک جرمن سپاہی نے اس سے لٹک کر خود کو پھانسی لگالی تھی؛

(ہ) چیونٹیوں کی ایک بانبی، چار فٹ پھیلی ہوئی اور تین فٹ اونچی، اور آخر میں اس سفر کی سب سے عمدہ مایۂ ناز چیز؛

(و) ایک بہت بڑا بیچ کا درخت، جس پر میں نے کیرولینا کے ساتھ چڑھنے کا منصوبہ بنایا تھا، اس درخت کی تیس فٹ کی بلندی پر ایک بڑا سا دوشاخہ تھا، جہاں سے ہمیں جھیل کا بے مثل نظارہ دیکھنے کو ملے گا، اور پھر میں کیرولینا کی طرف جھک کر اس کی گردن پر پھونکوں گا۔

میں نے اپنی ماں کے باورچی خانے کی الماری میں سے ایک بسکٹ کا پیکٹ بھی اڑا لیا تھا، فرج سے دہی کی ایک اچاری، دو سیب اور تہہ خانے سے کالی کشمش کے شربت کی ایک بوتل بھی غائب کر دی تھی— میں نے یہ سب سامان ایک جوتے کے ڈبے میں جمایا اور اسے اتوار کی شام کو بیچ کے بڑے درخت کے اوپر، دوشاخے پر رکھ دیا، تاکہ جب ہم پیر کو وہاں پہنچیں تو کچھ سامان ہمارا منتظر ہو۔

اُس رات جب میں سونے کے لیے لیٹا تو میں نے کیرولینا کے لیے کئی کہانیاں بُنیں، ایک کہانی راستے کے لیے، ایک کہانی بیچ کے درخت کے اوپر سنانے کے لیے جب ہم وہاں ساتھ ہوں گے۔ پھر میں نے اپنے کمرے کی بجلی جلائی، بستر کے پاس رکھی ہوئی میز کی دراز میں سے ایک چھوٹا سا بیچ کس نکال کر اسے اسکول بیگ میں رکھ لیا، یہ میری سب سے قیمتی چیز تھی، یہ کل اس سے وداعی کے وقت اسے دینے کے لیے تھا۔

میں دوبارہ بستر پر آکر لیٹ گیا، میں نے دونوں کہانیوں کو دہرایا، اگلے دن کی تمام تفصیلات کو دہرایا، راستے میں الف سے دال تک کہاں کہاں رکنا ہے، اور کب اور کہاں میں اسے پیچ کس دوں گا، ان سب باتوں کو کئی کئی بار دہرایا، جوتے کے ڈبے میں رکھے ہوئے سامان کے بارے میں سوچا جو اب جنگل میں بیچ کے درخت کے دوشاخے پر رکھا ہوا ہمارا انتظار کر رہا تھا— یہ جگہ سب سے

مکمل طور پر ہماری ملاقات کے لیے تیار تھی !— اور آخر کار میں اس کے ان شیریں لفظوں کے ساتھ نیند میں ڈوب گیا، ''تو پیر کو میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گی . . . تو پیر کو میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گی . . . ''

پیر کو صبح تڑکے نرم دھوپ پھیلی ہوئی تھی، آسمان گہرے پانی کی طرح نیلے رنگ کا ہو رہا تھا، بلیک برڈ گا رہی تھی اور جنگل میں کٹھ پھڑوے کی کھٹ کھٹ گونج رہی تھی۔ جب میں اسکول جا رہا تھا تو راستے ہی میں پہلی بار مجھے اس کا خیال آیا کہ اپنی تمام تیاریوں کے دوران میں یہ بالکل بھول ہی گیا تھا کہ موسم کے خراب ہو جانے کا بھی تو کچھ انتظام کرنا چاہیے۔ میرا بنایا ہوا پورا راستہ الف سے دال تک بارش اور تیز ہواؤں میں برباد ہو جائے گا— ریسپبیری کی جھاڑیاں غارت ہو جائیں گی، چیونٹیوں کی بانبی بہہ جائے گی، کائی بھرا راستہ پیروں کے نیچے پچ پچ کرنے لگے گا، چیچ کا پیڑ ایسا پھسلواں ہو جائے گا کہ اس پر چڑھنا ممکن نہ ہوگا، اور میرے سامان کا ڈبا، اس میں یا تو پانی بھر جائے گا یا ہوا اسے اُڑا لے جائے گی۔ لیکن میں نے افسردہ خیالات کی جگہ خود کو خوشیوں سے بھر لیا، اور اس نے مجھے مسرت کا ایسا ولولہ دیا جو مثبت طور پر فخر یہ تھا: خوشی کی بات یہ نہیں تھی کہ میں موسم کے بارے میں دوبارہ نہیں سوچوں گا— نہ یہ کہ میرا خیال کر کے موسم اپنا ارادہ بدل دے گا! نہ ہی یہ کہ کیرولینا کوکلمان کے ساتھ آج ملاقات ہوگی— نہیں، یہ سب نہیں، بلکہ ان سب سے اعلیٰ بات، اس ملاقات کے لیے مجھے سال کا سب سے عمدہ دن عطا ہوا ہے! حقیقتاً، یہ دن میرا ہے۔ مہربان خالق کی نظرِ خاص مجھ پر ہے— میں نے سوچا— جب قسمت میرے ساتھ ہے تو دل میں اندیشے کیوں لاؤں! فخر اور غرور آخری مرحلے میں غلطیوں کا ارتکاب بنتے ہیں، پریوں کی کہانیوں میں تو ہمیشہ یہی ہوتا ہے، جب غرور میں آ کر ہیرو فخر یہ سوچتا ہے کہ اب تو خوشی اس کی مٹھی میں ہے۔

میں نے جلدی جلدی قدم بڑھانا شروع کر دیے۔ میں کسی قیمت پر دیر سے اسکول نہیں پہنچنا چاہتا تھا۔ اپنے سبق کے دوران میں اتنا معصوم بن گیا جتنا پہلے کبھی نہیں رہا تھا، تاکہ میری ٹیچر کو ذرا بھی ایسا بہانہ نہ مل جائے کہ وہ مجھے کلاس کے بعد روک لیں۔ میں خاموش بھی تھا، محتاط بھی، مسکین اور اطاعت کرنے والا مکمل مثالی طالب علم بن گیا تھا۔ میں نے کیرولینا کی طرف ایک بار بھی نہیں دیکھا، میں نے خود کو اسے دیکھنے سے باز رکھا— نہیں ابھی نہیں، میں نے خود کو اجازت نہیں دی، بالکل تو ہم

Scanned with CamScanner

پرستانہ فکر، جیسے یوں دیکھنے سے میں اسے کسی خطرے میں ڈال دوں گا...

جب اسکول کی چھٹی ہوئی تو معلوم ہوا کہ لڑکیوں کو ابھی ایک گھنٹے تک اور رکنا ہے، مجھے یاد نہیں آرہا ہے کہ کیوں، شاید سلائی کڑھائی کی تربیت کے لیے، یا کچھ اور بات تھی۔ صرف ہم لڑکوں کو اسکول سے باہر جانے کی اجازت ملی۔ میں اسکول سے بالکل نہیں جانا چاہتا تھا— یہ معمول کے ایک دم خلاف بات تھی۔ میں نے اسے اپنے لیے ایک مزید امتحان کے طور پر قبول کرلیا، اور اس میں مجھے کامیاب ہونا تھا، اور اس کے علاوہ کیرولینا سے ملاقات کے لیے اس لمبے انتظار میں ایک پہلو اور جڑ گیا: ہم دونوں نے ایک دوسرے کے لیے مزید ایک خاص گھنٹے کی مدت تک انتظار کیا ہے!

میں اسکول کے گیٹ کے باہر تقریباً بیس گز کے فاصلے پر انتظار کرنے لگا، جہاں اوبرن زے اور اُنٹرن زے کے راستے الگ ہوتے تھے۔ وہاں پر ایک ڈگمگ کرتا ہوا پتھر پڑا تھا، یہ پتھر کی سل کسی بڑے پتھر میں سے ٹوٹ کر نکلی تھی۔ اس پتھر کے بیچ میں دندانے دار پنجے کی شکل میں گڑھا تھا، لوگ کہتے تھے کہ بہت زمانے پہلے یہ گڑھا ایک دیو کے غصے میں پیر پٹخنے کی وجہ سے پڑ گیا تھا، کیونکہ کسانوں نے قریب ہی کہیں ایک چرچ بنا دیا تھا، وقت گذارنے کے لیے میں اس دیو کے پنجے میں جمع پانی کے چھینٹے اڑانے لگا۔ میری پیٹھ پر تیز دھوپ پڑ رہی تھی، بغیر بادلوں کا آسمان ابھی تک گہرا نیلا ہو رہا تھا، میں بس بیٹھا انتظار کر رہا تھا اور پانی کے چھینٹے اڑا رہا تھا، اس وقت میرے دماغ میں کچھ نہیں چل رہا تھا، میں تو بس اس صورت حال سے محظوظ ہو رہا تھا۔

آخر کار لڑکیاں باہر نکلیں۔ پہلے تو ان کا ایک پورا جھنڈ جلدی جلدی مجھے پیچھے چھوڑتا ہوا آگے نکل گیا، اور پھر، ان سب کے آخر میں وہ نکلی۔ میں جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ وہ میرے پاس دوڑتی ہوئی آئی، اس کے گہرے بھورے بال ہوا میں لہرا رہے تھے، اس کے بالوں کی لٹ اوپر نیچے اچھل رہی تھی، وہ شوخ زرد رنگ کا لباس پہنے ہوئے تھی، میں نے اپنے ہاتھ پھیلا دیے، وہ میرے سامنے آکر رک گئی، اُتنی ہی قریب جتنی بریک کے وقت تھی، میں اس کے ہاتھوں کو تھامنا چاہتا تھا، میں اسے گلے لگانا اور اس کے چہرے کے بیچ میں پیار کرنا چاہتا تھا؛ تبھی وہ بولی، ''ارے! کیا تم میرا انتظار کر رہے تھے؟''

''ہاں،'' میں نے کہا۔

''ارے! میں تو تمھارے ساتھ بالکل نہیں آسکتی۔ میری ماں کی دوست کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اور میری ماں اُن سے ملنے نہیں جارہی ہیں، لہٰذا میری ماں نے مجھ سے کہا کہ مجھے . . . ''

اور اس کے بعد لمبی چوڑی تفصیل، جو میں نے تقریباً سنی ہی نہیں، بس کان میں کچھ پڑتا رہا، کیونکہ ایک دم سے مجھے عجیب سے بہرے پن اور پیروں کے بے قابو ہونے کا احساس ہوا تھا، اور جو کچھ مجھے اب اچھی طرح سے یاد ہے وہ یہ کہ جب وہ اپنی بات کہہ چکی تو اپنی ایڑی پر تیزی سے گھومی اور اس کا شوخ زرد رنگ کا پیکر اوبرن زے کی سمت میں دوڑ گیا، بڑی تیزی کے ساتھ، تاکہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ جاملے۔

میں اسکول کی پہاڑی سے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ میں یقیناً بہت دھیرے دھیرے چل رہا تھا، کیونکہ جس وقت میں جنگل کے کنارے پہنچا تو خود بخود اوبرن زے کو جاتے راستے کی طرف میری نگاہ اٹھ گئی، تو وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ میں رکا، گھوما اور دائرے میں بن رہے اسکول کی پہاڑی کے خاکے کو دیکھنے لگا۔ پورے ترائی کے علاقے پر دھوپ پھیلی ہوئی تھی، ہلکی سی ہوا بھی گھاس کو ہلا نہیں رہی تھی۔ پورا منظر مکمل سکوت میں ڈوبا ہوا تھا۔

اور تب میں نے ایک چھوٹے سے ہلتے ہوئے نقطے کو دیکھا۔ وہ نقطہ دھیرے دھیرے اپنا راستہ بناتا ہوا، جنگل کے بالکل بائیں طرف سے پیڑوں کے ساتھ، اسکول کی پہاڑی کے اوپر، اس کی چوٹی کے برابر برابر مغرب کی طرف جاتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ نیلے آسمان کے پس منظر میں اس خاکے کو، جو چیونٹی سے بڑا نہ ہوگا، آپ آسانی سے دیکھ سکتے تھے کہ یہ کوئی آدمی ہے۔ میں نے مسٹر زومر کو ان کی تین ٹانگوں کی وجہ سے پہچان لیا۔ روزمرّہ کے معمول کی طرح، ہلکی کھٹ کھٹ کے ساتھ ان کی ٹانگیں تیزی سے چل رہی تھیں، اور دور فاصلے پر وہ نقطہ افق کی طرف سرک رہا تھا — ایک ساتھ تیز بھی اور دھیرے بھی، بالکل گھڑی کی لمبی سوئی کی طرح۔

4

ایک سال کے بعد، میں نے سائیکل چلانا سیکھی۔ اس نے مجھے عجیب الخلقت شے نہیں بنایا کیونکہ اب میں چار فٹ پانچ انچ لمبا ہو چکا تھا، میرا وزن پانچ اسٹون اور دو پاؤنڈ کے برابر تھا اور

میرا جوتا ساڑھے بارہ نمبر کا تھا۔ لیکن مجھے سائیکل چلانے کا بہت شوق نہ تھا۔ وہ ڈگمگاتی ہوئی صرف دو کمزور پہیوں پر چلنے والی چیز مجھے ہمیشہ بڑی غیر معتبر معلوم ہوتی تھی، ہاں بھئی، عجیب وحشی سی بلا، کیونکہ کبھی کوئی مجھے یہ نہ سمجھا سکا کہ اگر سائیکل کو کسی چیز سے ٹیک لگا کر یا کسی چیز کے سہارے نہ کھڑا کیا جائے تو یہ فوراً گر جاتی ہے، تو پھر جب پانچ اسٹون کے وزن والا لڑکا اس پر سوار ہوگا اور بغیر کسی سہارے اور ٹیک کے اسے یہاں وہاں دوڑائے گا تو وہ کیوں نہ گرے گا؟ اس غیر معمولی عمل کو انجام دینے میں جائرواسکوپک (Giroscopic) قانون اور خاص طور سے زاویے دار حرکت کی توانائی کے قانون (Angular Momentum) درکار تھے، اور اس وقت ان دونوں سے میں نابلد تھا، بلکہ آج بھی میں انھیں پوری طرح نہیں سمجھتا، اور یہ دونوں لفظ 'جائرواسکوپک' اور 'اینگلر مومنٹم' مجھے تھوڑے خطرناک سے معلوم ہوتے ہیں اور مجھے اس حد تک پس وپیش میں مبتلا کر دیتے ہیں کہ مجھے اپنے سر کے پیچھے گومڑے والی جگہ پر وہی مانوس سی سرسراہٹ اور دپدپاہٹ محسوس ہونے لگتی ہے۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی قباحت نہیں ہے کہ اگر یہ بہت ضروری نہ ہوتا تو میں کبھی سائیکل چلانا نہ سیکھتا۔ لیکن یہ تو بہت ضروری ہو گیا تھا کیونکہ میں پیانو سیکھنے جا رہا تھا۔ اور صرف ایک ہی شخصیت تھی جو پیانو سکھاتی تھی، وہ تھیں پیانو ٹیچر جو اوبرن زے کے دوسرے سرے پر رہتی تھیں، جس کا مطلب تھا وہاں پہنچنے میں ایک گھنٹے پیدل چلنا، لیکن سائیکل سے — میرے بڑے بھائی کو وہاں پہنچنے میں ساڑھے تیرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگتے تھے۔ یہ وہی پیانو ٹیچر تھیں جنھوں نے میری ماں کو، میری بہن کو، میرے بھائی کو اور گاؤں کے ہر اس شخص کو پیانو بجانا سکھایا تھا جسے کوئی بھی ساز بجانے کا شوق تھا — چاہے وہ چرچ آرگن ہو یا ریٹا اشٹانگل مائر کا باجا۔ ماری — لُوئیز — فنکیل ان کا نام تھا، مِس — ماری — لُوئیز — فنکیل۔ وہ 'مِس' پر بہت زور دیتی تھیں، لہٰذا مجھے کہنا پڑ رہا ہے کہ ابھی تک میں نے ایسی عورت نہیں دیکھی جس میں نسوانیت کی اس حد تک کمی ہو جتنی ماری — لُوئیز — فنکیل میں تھی۔ وہ بہت قدیم تھیں، سفید بال، کوبڑ اور سوکھا ہوا چہرہ، چھوٹی کالی کالی مونچھیں اور سینہ بالکل دھنسا ہوا۔ یہ بھی مجھے معلوم تھا، کیونکہ ایک بار میں نے انھیں شمیز میں دیکھ لیا تھا جب میں غیر متوقع طور پر اپنے وقت سے ایک گھنٹے پہلے اپنے سبق کے لیے پہنچ گیا تھا، اور اس وقت تک ان کی دوپہر کی

نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنے پرانے اور شاندار بڑے مکان کی راہداری میں صرف اسکرٹ اور شمیز پہنے ہوئے کھڑی تھیں، یہ شمیز نرم، ڈھیلی اور خاص عورتوں کے پہننے والی ریشمی شمیز نہیں تھی بلکہ ہلکی، بغیر آستینوں والی سوتی بنیائن کی طرح تھی جسے ہم لڑکے ورزش کے وقت پہنتے تھے، اس شمیز میں سے ان کی سوکھی ہوئی بانہیں اور پتلی، لٹکتی ہوئی کھال والی گردن باہر نکلی ہوئی تھی — اور اس کے نیچے ان کا سینہ تھا جو بالکل مرغ کے سینے کی طرح ہڈہا اور سپاٹ تھا۔ اس کے علاوہ — جیسا میں نے بتایا — وہ اس بات پر زور دیتی تھیں کہ 'فنکیل' سے پہلے 'مس' لگایا جائے، اور، جیسا کہ انھوں نے اکثر اس کی وضاحت بھی کی تھی، بغیر کسی کے پوچھے ہی، کہ — بھلے ہی مرد یہ سوچتے ہوں کہ اب ان سے بات نہیں کی جا سکتی، لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ وہ غیر شادی شدہ ہیں اور شادی کے لیے تیار بھی۔ ان کی یہ وضاحت، ظاہر ہے، بالکل بکواس تھی، کیونکہ دنیا میں ایسا کون مرد ہوگا جو سپاٹ سینے اور مونچھوں والی بوڑھی مس فنکیل سے شادی کرے گا؟

اصل میں، مس فنکیل خود کو مس فنکیل کیوں بلواتی تھیں، اس کی ایک خاص وجہ تھی، وہ یہ کہ وہ خود کو مسز فنکیل بلوا ہی نہیں سکتی تھیں، چاہ کر بھی نہیں بلوا سکتی تھیں، کیونکہ وہاں پہلے ہی ایک مسز فنکیل موجود تھیں... یا مجھے یوں کہنا چاہیے کہ وہاں ابھی تک ایک مسز فنکیل موجود تھیں۔ یہ تھیں مس فنکیل کی ماں۔ اور اب جبکہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ مس فنکیل قدیم تھیں، تو مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون سا لفظ ہے جو مسز فنکیل کے ساتھ انصاف کرے گا: پورے سفید بالوں والی بڑھیا، نوادر، ماقبل تاریخ، پہاڑوں جتنی پرانی... میرا خیال ہے وہ سو برس کی تو رہی ہی ہوں گی۔ وہ بہت زیادہ بوڑھی تھیں، اتنی کہ بس زندگی کی بہت ہی مدھم سی حرارت کے ساتھ زندہ تھیں، گوشت اور خون والے انسان سے زیادہ وہ بالکل فرنیچر کی طرح لگتی تھیں، یا بوسیدہ سی محفوظ کی ہوئی تتلی کی طرح، یا چینی کے بنے ہوئے کسی نازک سامان کی طرح۔

نہ وہ ہلتی تھیں، نہ بولتی تھیں، مجھے نہیں معلوم کہ وہ کس قدر دیکھ اور سن سکتی تھیں، میں نے ان کو بیٹھے ہونے کے علاوہ کبھی کسی دوسری صورت میں نہیں دیکھا تھا۔ گرمیوں میں وہ سفید باریک ریشمی کپڑے کے خول میں اور جاڑوں میں سیاہ مخملی لبادہ پہنے، کچھوے کی طرح آگے کی طرف نکلے ہوئے اور ہلتے ہوئے سر کے ساتھ خاموش، ساکت اور بے پروائی کے عالم میں ایک جہازی کرسی پر بیٹھی

Scanned with CamScanner

رہتی تھیں — یہ کرسی موسیقی والے بڑے ہال کے ایک کونے میں قدیم دیواری گھڑی کے نیچے رکھی رہتی تھی۔ صرف چند بہت ہی خاص موقعوں پر، جب کوئی شاگرد گھر سے اپنا سبق بہت اچھی طرح مکمل کر کے لاتا، اور ایک بھی غلطی کیے بغیر Czerny etudes بجا کر سناتا، تب مس فنکیل شاگرد کے جانے کے وقت ہال کے بیچ میں جا کر کھڑی ہو جاتیں، اور جہازی کرسی کی طرف چلا کر کہتیں، ''ماں!'' — وہ انھیں 'ماں!' کہہ کر پکارتی تھیں — ''ماں! اس بچے کو ایک بسکٹ دے دو، اس نے آج بہت عمدہ پیانو بجایا ہے!'' اور پھر آپ کو پورا ہال طے کر کے اس کونے تک جانا ہوتا تھا، اور اس قدیم بوڑھی عورت کے سامنے اپنا ہاتھ پھیلا دینا ہوتا تھا۔ مس فنکیل دوسری بار پکار کر کہتی تھیں، ''بچے کو ایک بسکٹ دے دو، ماں!'' اور تب، غیر معمولی طور پر آہستہ آہستہ، ایک ہاتھ، نیلا، نازک، کپکپاتا ہوا ہاتھ باریک کپڑے میں سے یا مخملی لبادے میں سے نمودار ہوتا، کچھوے کی طرح نکلے ہوئے سر اور آنکھوں سے بے تعلق، یہ ہاتھ کرسی کے ہتھے پر سے سرکتا ہوا نیچی سی کافی ٹیبل کی طرف بڑھتا جہاں بسکٹوں والی پلیٹ رکھی ہوتی تھی، ہاتھ ایک بسکٹ اٹھاتا، یہ عام طور سے کریم بھرے ہوئے چوکور ویفر والے بسکٹ ہوتے تھے، بسکٹ اٹھائے یہ ہاتھ آہستہ آہستہ میز پر سے چل کر جہازی کرسی کے ہتھے تک آتا، پھر سامنے بڑھتے ہوئے بچے کے ہاتھ کی طرف بڑھتا، اور پھر وہ اپنی ہڈہی انگلیوں سے بسکٹ کو ٹپکا دیتیں، بالکل اشرفی کی طرح۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ بچے کا ہاتھ اور ان کی ہڈہی انگلیاں ایک دوسرے سے چھو جاتیں، جس سے عجیب سی گھبراہٹ کا احساس ہوتا، کیونکہ آپ ایک سرد اور نرم چیز کے مَس ہونے کا خیال کر رہے ہوتے تھے، لیکن وہ تو گرم، بلکہ جلتا ہوا، اور بے حد نازک، ہلکا، چست اور رونگٹے کھڑے کر دینے والا احساس ہوتا، جیسے آپ کی مٹھی میں سے چڑیا پھڑ پھڑا کر اُڑ گئی ہو۔ اس کے بعد آپ ''بہت شکریہ، مسز فنکیل!'' کہتے اور پھر ہال سے باہر، اس تاریک بڑے مکان سے نکل کر، دھوپ اور تازی ہوا میں آ جاتے۔

مجھے یاد نہیں سائیکل چلانے جیسے تاریک فن کو سیکھنے میں مجھے کتنا وقت لگا تھا۔ مجھے جو کچھ یاد ہے وہ بس یہ کہ اپنی ماں کی سائیکل سے، جنگل کے ایک کم ڈھال والے راستے پر، جہاں کوئی مجھے دیکھ نہیں سکتا تھا، میں نے بے دلی اور پکے ارادے کے ملے جلے احساس کے ساتھ خود ہی سائیکل چلانا سیکھی تھی۔ یہ راستہ بہت پتلا سا تھا اور اس کے دونوں طرف سے زمین اونچی اُٹھی ہوئی تھی جس

سے میں ہر طرف سے دھکا لگا سکتا تھا، اور اس بات کا یقین کر لیا تھا کہ اگر میں گرا تو پتیوں اور نرم زمین پر گروں گا۔ آخرکار، کئی ناکام کوششوں کے بعد، اچانک، میں نے وہ کر دکھایا۔ اپنے تمام نظریاتی شبہات کے باوجود میں دو پہیوں پر تیزی سے آگے بڑھ گیا: وہ ایک حواس گم کر دینے والا اور فخر کا احساس تھا! گھر کے چبوترے پر، اور بغل کے بغیچے میں اپنے گھر والوں کے سامنے میں نے سائیکل چلا کر دکھائی، اور انعام میں مجھے ماں باپ کی شاباشی ملی اور بڑے بھائی اور بہن کے ٹانگ کھینچنے والے فقرے۔ اس کے علاوہ، میرے بھائی نے مجھے سڑک پر چلنے کے بنیادی قوانین کے بارے میں بھی بتایا، سب سے ضروری بات یہ کہ ہمیشہ اپنے داہنی طرف چلنا چاہیے، داہنی طرف کی وضاحت یوں کی گئی کہ اس طرف جدھر سائیکل کے ہینڈل پر بریک لگا ہوا ہے، اور اس کے بعد سے، ہفتے میں ایک بار بدھ کے روز، تین سے چار بجے کے درمیان، سائیکل چلاتا ہوا میں، خود سے، پیانو کا سبق لینے مس فنکیل کے گھر جاتا تھا۔ اس فاصلے کے لیے میرے بھائی نے جو ساڑھے تیرہ منٹ تجویز کیے تھے وہ میرے لیے کس قدر امید افزا تھے۔ میرا بھائی مجھ سے پانچ سال بڑا تھا، اور اس کی سائیکل کا ہینڈل نیچے کی طرف جھکا ہوا تھا اور اس میں تین گیئر بھی تھے، جبکہ میں اپنی ماں کی سائیکل کو کھڑے ہو کر چلاتا تھا، کیونکہ وہ میرے لیے بہت بڑی تھی۔ سائیکل کی گدی جتنی نیچی ہو سکتی تھی اتنی نیچی کر دی گئی تھی، تب بھی میں پیڈل چلانے کے ساتھ ساتھ اس پر بیٹھ نہیں سکتا تھا، یا تو میں گدی پر بیٹھ جاؤں یا پیڈل چلا لوں، اس مصیبت نے سائیکل چلانے کو بے حد مشکل، تھکا دینے والا عمل بنا دیا تھا اور، جیسا مجھے اچھی طرح معلوم تھا، یہ سائیکل چلانے کا بے حد مہمل انداز تھا: پہلے کھڑے کھڑے تیزی سے پیڈل چلانا تاکہ سائیکل کچھ رفتار پکڑ لے، پھر پیڈل کے سہارے اوپر اُٹھ کر ڈگمگاتی ہوئی گدی پر بیٹھ جانا، اور پیڈل چلانے کے لیے پوری طرح ٹیڑھا ہو جانا، اور پورے وقت اسی طرح رہنا۔ اسی طریقے سے میں سائیکل چلاتا ہوا اپنے گھر سے جھیل کے کنارے کنارے اوبرن زے تک مس فنکیل کے گھر بیس منٹ میں پہنچتا تھا۔ یہ وقت زیادہ تھا، اور اگر راستے میں کوئی اڑچن آ جائے تو اور بھی زیادہ وقت لگتا تھا۔ ظاہر ہے یہ کئی طرح کی اڑچنیں تھیں۔ میرے سائیکل چلانے کے دوران پیش آنے والی اڑچنیں تھیں: سائیکل کو موڑنا، روکنا، گدی پر چڑھنا اور اترنا وغیرہ؛ میں نہ تو کسی سے آگے نکل سکتا تھا اور نہ کسی کو آگے نکلنے دے سکتا تھا، اور نہ دوسری سمت سے آنے والے

Scanned with CamScanner

کے پاس سے گذر سکتا تھا۔ جیسے ہی مجھے سامنے سے یا پیچھے سے آتی ہوئی کار کی آواز بھر سنائی دے جاتی، میں جھٹ سے بریک لگا کر کنارے ہو جاتا، سائیکل سے اتر پڑتا، اور اس کے نکل جانے تک انتظار کرتا۔ جب دوسرے سائیکل سوار سامنے سے آتے دکھائی دیتے، میں رک جاتا اور ان کو نکل جانے دیتا۔ پیدل چلنے والوں سے آگے نکلنے کا میرا طریقہ یہ تھا کہ میں ان کے پیچھے سائیکل سے اتر جاتا، سائیکل ہاتھ میں لیے لیے دوڑ کر ان کے آگے پہنچتا، اور ایک محفوظ فاصلہ ہو جانے پر ہی دوبارہ پیڈل پر پیر رکھتا۔ سائیکل چلانے کے لیے مجھے پوری طرح سے آگے اور پیچھے خالی سڑک درکار تھی، اور یہ بھی کہ کوئی مجھے دیکھ نہ رہا ہو۔ اڑچنیں یہیں ختم نہ ہوتی تھیں، اُنٹرن زے اور اوبرن زے کے آدھے راستے پر مسز ہارٹ لاؤب کا چھوٹا اور خطرناک ولایتی کتا رہتا تھا جو سڑک پر ہر چلتی ہوئی چیز پر زور زور سے بھونکا کرتا تھا۔ اس کے زوردار حملوں سے بچنے کا ایک ہی راستہ تھا کہ سڑک کے کنارے کنارے چپ چاپ کھسک لیا جائے۔ میں چالاکی سے باغ کے جنگلے کے ایک کھمبے کو پکڑ کر کھڑا ہو جاتا، اور کانپتے ہوئے پیروں کے ساتھ گدّی پر بیٹھا انتظار کرتا کہ مسز ہارٹ لاؤب اپنے کتے کو آواز دیں تو راستہ صاف ہو۔ اب تو تعجب نہ کیجیے جو ان حالات میں مجھے اوبرن زے تک پہنچنے میں اکثر بیس منٹ کافی نہیں ہوتے تھے۔ اس لیے اپنی طرف سے پوری احتیاط برتتے ہوئے میں گھر سے ڈھائی بجے ہی نکل جاتا تھا تاکہ مس فنکیل کے یہاں وقت پر پہنچ سکوں۔

جیسا کہ میں نے ابھی آپ کو بتایا کہ مس فنکیل کیسے خاص موقعوں پر اپنی ماں، اسے پکار کر بچوں کو بسکٹ دینے کے لیے کہتی تھیں، میں نے اس بات پر خاص زور دیا تھا کہ یہ موقعے بہت ہی خاص ہوا کرتے تھے، بہت ہی مشکل سے ایسا موقع آتا تھا، کیونکہ مس فنکیل ایک سخت ٹیچر واقع ہوئی تھیں، اور اُن کو خوش کرنا بڑا مشکل تھا۔ اگر کہیں آپ نے اپنا سبق ٹھیک سے یاد نہیں کیا یا پیانو بجانے میں کہیں کوئی غلطی کی، تو ان کا سر ڈراؤنے انداز میں ہلنے لگتا تھا، ان کا چہرہ سرخ ہو جاتا، وہ اپنی کہنی سے آپ کو کونچتیں، جھنجھلا کر انگلیاں چٹخاتیں، اور آپ کو بڑے ہی بے تکے ناموں سے پکار پکار کر چلانے لگتیں۔ ان میں کا سب سے بُرا واقعہ اس وقت پیش آیا جب میں ان کی شاگردی میں ایک سال کے لیے تھا، اور وہ میرے لیے بے حد پریشانی کا وقت تھا، اتنا کہ آج بھی اس کے بارے میں سوچ کر میں مضطرب ہو جاتا ہوں۔

Scanned with CamScanner

یہ سب شروع ہوا میرے قریب دس منٹ دیر سے پہنچنے کی وجہ سے۔ مسز ہارٹ لاؤب کے کتّے نے مجھے جنگلے میں اٹکائے رکھا، دو کاروں سے میرا سابقہ پڑا، اور دو راہگیروں کے گذرنے کا انتظار۔ جس وقت میں مس فنکیل کے پاس پہنچا ہوں، وہ غصے میں اکڑی ہوئی ہال میں ٹہل رہی تھیں، ان کا سر کانپ رہا تھا، چہرہ لال ہو رہا تھا اور وہ اپنی انگلیاں چٹخا رہی تھیں۔

"تم کو معلوم ہے کیا بج رہا ہے؟" وہ غرائیں۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرے پاس گھڑی ہی نہیں تھی — میری تیرھویں سالگرہ تک مجھے گھڑی نہیں ملی تھی۔

"وہ دیکھو!" وہ چلّائیں اور اپنی انگلی ہال کے اس کونے کی طرف تیزی سے گھما دی، جدھر قدیم دیواری گھڑی مسز فنکیل کے ساکت، بے حس پیکر کے اوپر ٹِک ٹِک کر رہی تھی۔ "سوا تین بج رہے ہیں! اب تک تم کر کیا رہے تھے؟"

میں مسز ہارٹ لاؤب کے کتّے کے بارے میں کچھ بدبدایا، لیکن انھوں نے مجھے اپنی بات ختم ہی نہیں کرنے دی۔ "کیا کتّا!" انھوں نے میری بات کاٹتے ہوئے تعجب سے کہا۔ "کتّے کے ساتھ کھیل رہے تھے! مجھے یقین نہیں ہوتا! تم ضرور آئسکریم کھا رہے ہو گے! میں تمھاری قسم کے لڑکوں کو خوب جانتی ہوں! ہمیشہ مسز ہارٹ لاؤب کی دکان میں گھسے رہتے ہو، اور آئسکریم ٹھونسا کرتے ہو!"

اب یہ تو زیادتی تھی! مسز ہارٹ کی دکان جانے اور آئسکریم کھانے کا الزام لگانا! جبکہ مجھے کوئی جیب خرچ بھی نہیں ملتا تھا! ہاں، میرا بھائی اور اس کے دوست اس قسم کی حرکتیں کرتے تھے۔ وہ لوگ اپنے جیب خرچ کی ایک ایک پائی مسز ہارٹ کی آئسکریم پر اڑا دیتے تھے۔ لیکن میں کہاں! مجھے تو ایک آئسکریم کے لیے اپنی ماں یا بہن کی کتنی للّو پتّو کرنا پڑتی تھی! اور وہاں مجھ پر الزام لگایا جا رہا تھا کہ میں مسز ہارٹ کی دکان میں گھسا ہوا آئسکریم ٹھونس رہا تھا، جبکہ اصلیت میں مصیبتوں سے جوجھتا ہوا، پسینہ بہاتا ہوا میں پیانو سیکھنے سائیکل سے آ رہا تھا! اس بے بنیاد الزام کو سن کر میرے منھ پر تالا لگ گیا، اور میں رونے کے لیے بالکل تیار ہو گیا۔

"اب یہ ریں ریں کرنا بند کرو!" مس فنکیل نے جھڑک کر کہا۔ "اپنا موسیقی کا سبق نکالو، اور مجھے دکھاؤ کہ تم نے کیا سیکھا۔ میں شرط لگا سکتی ہوں کہ تم نے مشق کرنے کی زحمت نہ کی ہوگی!"

اور ہوا بھی ایسا ہی تھا، انھوں نے بالکل غلط نہیں سمجھا تھا۔ گذشتہ ہفتے مشکل سے ہی مجھے مشق

کرنے کے لیے کچھ وقت ملا تھا، کچھ تو دوسرے ضروری کام کرنا تھے اس لیے، اور کچھ اس لیے کہ جو دھن انھوں نے مجھے دی تھی وہ بڑی مشکل تھی، یہ فیوگ قسم کی کِلِنک دھن تھی، اس کو بجانے میں داہنا اور بایاں ہاتھ ایک دوسرے سے بہت دور رہتا تھا، اس میں جگہ جگہ بے تکے طور پر رکنا پڑتا تھا، یہ قدرتی آہنگ کے خلاف تھی اور دھن کے بیچ بیچ میں الجھنی وقفے، اور ان سب باتوں میں جو سب سے اہم تھی وہ یہ کہ پوری دھن بڑی بھیانک تھی۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو اس کے نغمہ نگار کا نام ہاش لَر تھا — خدا اسے غارت کرے!

ویسے تو، مجھے لگتا ہے کہ میں نے ان دو دھنوں پر معقول طور پر طبع آزمائی کر لی تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ راستے میں پیش آنے والی یہ مصیبتیں — خاص طور سے مسز ہارٹ لاؤب کے کتے کا حملہ اور پھر مس فنکیل کی جھڑکیاں — انھوں نے مکمل طور پر میرے اعصاب کو مجروح کر دیا تھا۔ لہٰذا اب میں پسینے میں شرابور اور کانپ رہا تھا، میری آنکھیں آنسوؤں سے دھندلا گئی تھیں، میرے سامنے پیانو کے انتھاسی گٹکے اور مسٹر ہاش لَر کا etudes تھا، اور میرے پیچھے گردن پر مس فنکیل کی جلتی ہوئی قہر آلود سانسیں . . . اور جناب، میں کچھ بھی نہیں کر سکا۔ میں نے سب گڑبڑ کر دیا، میں نے مدھم اور اونچے سُروں کو خلط ملط کر دیا، پورے اور نصف سُر، چوتھائی اور آٹھویں درجے کے وقفے، بایاں اور داہنا سب گڈمڈ کر دیا۔ اس سے پہلے کہ میں پہلی سطر کے خاتمے تک پہنچتا، میری آنکھوں میں بھرے آنسوؤں کے عکس نما میں سبق اور پیانو کے گٹکے گھومنے لگے، اور پھر میں نے اپنے ہاتھ نیچے لٹکا دیے اور بے قابو ہو کر پھوٹ پڑا۔

''جیسا میں نے سوچا تھا!'' میرے پیچھے سے سرسراتی ہوئی آواز آئی، اور اس کے ساتھ ہی تھوک کی ہلکی سی پھوار بھی میری گردن پر پڑی۔ ''جیسا میں نے سوچا تھا۔ دیر میں آنے میں ماہر، آئسکریم کھانے اور بہانے بنانے میں ماہر، لیکن سبق یاد کرنے کی باری آئے تو بالکل دوسرا معاملہ! لیکن تم سیکھو گے، میرے بچے، تم سیکھو گے!'' اور اسی کے ساتھ وہ میرے پیچھے تیزی سے چکر کاٹ کر میری بغل میں بنچ پر آ کر بیٹھ گئیں، اور اپنے دونوں ہاتھوں میں انھوں نے میرا داہنا ہاتھ تھام لیا، اور، میری ایک انگلی کو پیانو کے گٹکوں پر جمانے لگیں، بالکل اسی انداز میں جس طرح مسٹر ہاش لَر کیا کرتے ہوں گے۔ ''یہ یہاں! یہ یہاں! یہ یہاں! انگوٹھا یہاں! درمیانی انگلی یہاں! یہ یہاں! اور یہ

یہاں۔۔۔!''

پھر جب وہ میرے داہنے ہاتھ کی مشق کرا چکیں تو انھوں نے میرا بایاں ہاتھ تھاما، اور اسی انداز میں شروع ہوگئیں: ''یہ یہاں! اور یہ یہاں! اور یہ یہاں۔۔۔!''

وہ میری انگلیوں کو اس جوش کے ساتھ استعمال کر رہی تھیں، کہ لگتا تھا وہ نغمے کو مادّی طور پر اس کے ایک ایک سُر کے ساتھ، میری انگلیوں میں پیوست کر دینا چاہتی ہوں۔ اس سے مجھے تکلیف ہو رہی تھی، اور یہ مشق تقریباً آدھے گھنٹے تک چلی۔ آخرکار وہ میرے پاس سے اٹھیں، جھٹ سے سبق بند کیا، اور بولیں، ''اگلے ہفتے تک، تمھیں یہ ایسا یاد ہو جائے گا لڑکے، کہ بغیر دیکھے ہی تم اسے دل اور پورے جذبے کے ساتھ، یا کسی بھی طرح، بجانے لگو گے!'' اور پھر انھوں نے ایک ضخیم، چار ہاتھ والی موسیقی کی کتاب کھولی، اور اسے دھڑ سے میوزک اسٹینڈ پر رکھتے ہوئے بولیں، ''اور اب بقیہ دس منٹ کے لیے، ہم دیابیلی بجائیں گے، تاکہ کم سے کم تم موسیقی پڑھنا تو سیکھ ہی لو۔ تمھاری شامت آجائے گی اب جو تم نے کوئی غلطی کی!''

میں نے فرمانبرداری سے سر ہلایا اور اپنے چہرے کے آنسوؤں کو اپنی آستین سے پونچھا۔ دیابیلی بڑا مہربان نغمہ نگار تھا۔ وہ بے تکے ہاش لرکی طرح مشکل دھنیں نہیں بناتا تھا۔ دیابیلی کو بجانا آسان تھا، یوں تو اس کی دھنیں بڑی سادی، ابتدائی سی ہوتیں، لیکن ہمیشہ بہت متاثر کرتی تھیں۔ مجھے دیابیلی بہت پسند تھا، کبھی کبھی میری بہن تو یہاں تک کہہ جاتی تھی، ''اگر کوئی پیانو بالکل بھی نہ بجا پاتا ہو، تب بھی وہ دیابیلی کی دھن بجا سکتا ہے۔''

تو ہم نے چار ہاتھوں سے دیابیلی کو بجانا شروع کیا، بائیں طرف کے نیچے سُروں پر مس فنکیل کے ہاتھ چلنے لگے اور میں نے داہنی طرف دونوں ہاتھوں سے بجانے والے یکساں سُروں کو سنبھالا۔ ذرا دیر کے لیے دھن آہنگ میں ڈوبی، تو مجھے اپنی ہمت بندھتی ہوئی محسوس ہوئی، میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے اینٹین دیابیلی جیسا نغمہ نگار پیدا کیا، اس راحت کے لمحے میں آکر، مجھ سے یہ دیکھنا رہ گیا کہ جی میجر کے گٹکے پر چھوٹی گت تھی اور اسی طرح شروعات میں بھی ایف شارپ پر خاص گت تھی؛ اس کا یہ مطلب تھا کہ آپ لمبے عرصے تک صرف سفید گٹکوں کو ہی نہیں بجا سکتے، بلکہ ان خاص جگہوں پر، اور بغیر کسی اطلاع کے، آپ کو جی کے بالکل نیچے والے ایف شارپ نام کے

Scanned with CamScanner

گٹکے کو بھی دبانا ہوتا تھا۔ لہٰذا جب میرے حصے میں پہلی بار ایف شارپ ظاہر ہوا تو میں اسے پہچاننے میں ہی ناکام ہو گیا، اب ایسی صورت میں موسیقی کا کوئی بھی رسیا ہو اس حرکت پر برہمی سے اختلاف کرے گا۔

''اب یہ ایسا مشکل نہیں ہے!'' یہ کہہ کر مس فنکیل نے پیانو بجانا روک دیا۔ ''مشکل! مشکل کا پہلا اشارہ اور ماسٹر صاحب چوک گئے! کیا تمھاری کھوپڑی میں آنکھیں نہیں لگی ہیں؟ ایف شارپ! یہ یہاں! صاف صاف لکھا ہوا ہے! سمجھے! اب، اوپر سے شروع کرو! ایک — دو — تین — چار . . .''

میرے لیے آج تک یہ ایک رمز بنا ہوا ہے کہ میں نے دوبارہ وہی غلطی کیسے کر دی۔ میں یہ غلطی نہ کرنے کے واسطے بہت زیادہ محتاط تھا، یہاں تک کہ مجھے ہر گٹکے کے پیچھے سے ایف شارپ جھانکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا، غالباً یہ اس وجہ سے تھا کہ میں ایف شارپ بجانے کے لیے بے چین ہو رہا تھا، اور خود پر جبر بھی کر رہا تھا کہ ایف شارپ ابھی نہیں بجانا ہے، ابھی نہیں، ابھی نہیں . . . جب تک . . . ارے، میں نے ایک بار پھر اسی جگہ پر آ کر ایف شارپ کے بجائے ایف نیچرل بجا دیا۔

ان کے چہرے پر خون دوڑ گیا اور وہ زور سے چلائیں، ''میں اس پر یقین نہیں کر سکتی! میں نے کہا، ایف شارپ، خدا اس کو غارت کرے! ایف شارپ! تم کو نہیں معلوم ایف شارپ کیا ہے؟ گھونگھے کہیں کے! یہ رہا یہاں!'' — پلنک پلنک — انھوں نے اپنی کلمے کی انگلی سے، جس کی پور اس وقت سے قریب تین دہائیوں کے بعد چلنے والے پرانے سکے جتنی چوڑی تھی، جی گٹکے کے نیچے کالے رنگ کے گٹکے کو ٹھونکتے ہوئے انھوں نے کہا، ''یہ ہے ایف شارپ . . .!'' — پلنک پلنک — ''یہ . . .!'' اور اسی وقت ان کو چھینک آ گئی۔ انھوں نے چھینکا، اپنی کلمے کی انگلی سے مونچھوں کو پونچھا اور پھر کالے گٹکے کو مزید دو تین بار ٹھونکتے ہوئے چلائیں، ''یہ ہے ایف شارپ، یہ ہے ایف شارپ . . .!'' اور پھر انھوں نے اپنی آستین میں سے رومال نکالا اور زور سے ناک چھنکی۔

لیکن میری نظریں ایف شارپ پر جمی رہ گئیں۔ میں زرد پڑ گیا۔ وہاں، گٹکے پر، ناخون کے برابر، پنسل جتنی موٹی، لبلبی، چمکدار، پیلی اور ہرے رنگ کی تازہ تازہ ناک لتھڑی ہوئی تھی، ظاہر ہے یہ مس فنکیل کی ناک کی پیداوار تھی، جب ان کو چھینک آئی تھی تو یہ ناک میں سے نکل کر ان کی

Scanned with CamScanner

مونچھوں میں پھنس گئی تھی، وہاں سے ان کی کلمے والی انگلی پر، جب انھوں نے اپنی مونچھیں پونچھیں، اور پھر وہاں سے ایف شارپ پر۔

''چلو اوپر سے شروع کرو!'' وہ مجھ پر غرائیں۔ ''ایک — دو — تین — چار...'' اور ہم نے دوبارہ بجانا شروع کیا۔

اس کے بعد کے تیس سیکنڈ میری زندگی کے سب سے بدتر وقت میں سے تھے۔ مجھے اپنے گالوں میں سے خون بہتا ہوا اور گردن پر ٹھنڈا پسینہ پھوٹتا ہوا سا معلوم ہو رہا تھا۔ میرے بالوں کے سرے کھڑے ہو گئے تھے، میرے کان متواتر طریقے سے ٹھنڈے اور گرم ہو رہے تھے، اور آخر میں تو میں بالکل بہرا ہو گیا تھا، مانو میرے کان ہی بند ہو گئے ہوں، میں مشکل سے اینٹین دیابیلی کی وہ خوبصورت دھن سن پا رہا تھا، جسے میں بالکل فطری طور پر بجا رہا تھا، بغیر سبق کو دیکھے — دو تکراروں کے بعد، میری انگلیوں کو اپنے جانے کا راستہ معلوم تھا — جی گٹکے کے نیچے والے کالے گٹکے پر سے میں اپنی نظریں ہٹا ہی نہیں پا رہا تھا، جس پر ماری — لُوئیز — فنکلیل کی ناک چپکی ہوئی تھی... بس اب سات گٹکے باقی تھے... اب چھ... ٹھیک ناک کے بیچ میں اپنی انگلی رکھے بغیر گٹکے کو دبانا ناممکن تھا... اب پانچ گٹکے باقی تھے، چار... لیکن اگر میں اسے نہ بجاؤں اور ایف شارپ کی جگہ تیسری بار بھی ایف نیچرل کو ہی دبا دوں، تو کیا ہوگا... اب بس تین گٹکے... یا اللہ، کوئی معجزہ دکھا! کچھ کہہ! کچھ کر! کاش زمین مجھے پورا نگل جائے! پیانو پھٹ جائے! وقت پیچھے پلٹ جائے، کچھ بھی ہو جائے تا کہ مجھے ایف شارپ نہ بجانا پڑے!... اب دو گٹکے بچے، اب ایک... اور خدا نے نہ کچھ کہا اور نہ کچھ کیا، اور آخر وہ خطرناک گٹکا آ ہی گیا، اور پھر — مجھے اچھی طرح یاد ہے — وہ چھٹے اور آٹھویں گٹکے کے درمیان والا تھا، میں ڈی سے ایف شارپ کی طرف بڑھا، جی کے اوپر چوتھائی آواز کے خاتمے پر... میری انگلی کے لیے یہ جہنم میں اترنے جیسا تھا، یہ آٹھ گٹکوں کا سلسلہ، ڈی — سی — بی — اے — جی... ''اور اب ایف شارپ!'' وہ قریب سے چلائیں... اور، اچھی طرح جانتے بوجھتے ہوئے کہ میں کیا کر رہا ہوں، میں نے گستاخانہ طور پر ایف نیچرل دبا دیا۔

پیانو کا ڈھکنا اتنی تیزی سے بند ہوا کہ مجھے اپنی انگلی ہٹانے کے لیے بہت کم وقت ملا تھا، مس فنکلیل میرے قریب کھڑی بری طرح اچھل پڑیں۔

''تم نے یہ جان بوجھ کر کیا ہے!'' وہ چیخیں، مارے غصے کے ان کی آواز اٹک اٹک کر نکل رہی تھی، وہ اتنی زور سے چلا رہی تھیں کہ، بہرے پن کے باوجود، میرے کانوں میں سیٹیاں بجنے لگی تھیں۔ ''تم نے یہ جان بوجھ کر کیا ہے، گستاخ شیطان! گندے گجوے! گندے کہیں کے، تم۔۔۔''

کمرے کے بیچ میں رکھی ہوئی کھانے کی میز کے چاروں طرف وہ چکر لگانے لگیں، اور ہر لفظ پر وہ میز پر گھونسا مارتی جاتیں۔ ''میں تمھارے اشاروں پر نہیں ناچوں گی۔ سنا تم نے! ایک لمحے کے لیے بھی یہ مت سوچنا کہ میں تمھیں اس بدتمیزی کے لیے چھوڑ دوں گی! میں تمھاری ماں کو فون کروں گی۔ میں تمھارے باپ کو فون کروں گی۔ میں ان سے مطالبہ کروں گی کہ وہ تمھاری ایسی خاطر کریں کہ تم ایک ہفتے تک بیٹھنے کے قابل نہ رہو۔ میں چاہتی ہوں کہ تم کو اگلے تین ہفتوں کے لیے گھر میں بند کر دیا جائے، اور میں چاہتی ہوں کہ تم روزانہ تین گھنٹے جی میجر کی مشق کرو، اور ڈی میجر کی اور اے میجر کی بھی، اس کے ساتھ ایف شارپ اور سی شارپ اور جی شارپ، یہاں تک کہ تم انھیں سوتے میں بھی بجا سکو! یہ جو تم نے میرے ساتھ بے ہودگی کی ہے اس کا میں تمھیں مزہ چکھاؤں گی، چھوٹے بندر! میں تمھیں سکھاؤں گی۔۔۔ اگر میرا بس چلے تو میں تمھیں کوڑوں سے ماروں۔۔۔ ابھی اسی وقت۔۔۔ اپنے ہاتھوں سے۔۔۔''

اور اس کے ساتھ ہی غصے کے مارے ان کا گلا رندھ گیا، اپنے دونوں ہاتھ ہوا میں لہرانے لگیں، ان کا چہرہ عنابی رنگ کا ہو گیا تھا، ایسا لگتا تھا وہ کسی لمحے بھی پھٹ جائیں گی، اور پھر انھوں نے میز پر رکھے پھلوں کے پیالے میں سے ایک سیب اٹھالیا، نشانہ۔ لے کر اسے اتنی زور سے کمرے کے ایک کونے کی طرف اچھالا کہ وہ جا کر دیوار سے ٹکرایا، اور قدیم دیواری گھڑی کے پاس ان کی بوڑھی ماں کے پھوپے جیسے سر کے بالکل اوپر دیوار پر ایک بھورا نشان پڑ گیا۔

اور اس کے بعد، جیسے کوئی خوفناک مافوق الفطرت چیز حرکت میں آ گئی، باریک کپڑے کے اندر کچھ لرزا، اور قبا کی تہوں میں سے قدیم بڑھیا کا ہاتھ نمودار ہوا، اور دھیرے دھیرے بسکٹوں کی جانب مانوس سمت میں بڑھنے لگا۔۔۔

لیکن مس فنکیل نے یہ منظر نہیں دیکھا، صرف میں نے دیکھا۔ انھوں نے زور سے دروازہ کھولا، اپنے ہاتھ سے باہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ غراتی آواز میں بولیں، ''اپنا سامان سمیٹو

اور یہاں سے دفع ہو جاؤ!'' اور میں جیسے ہی لڑکھڑاتا ہوا باہر نکلا، ایک جھما کے کے ساتھ میرے پیچھے دروازہ بند ہو گیا۔

میرا پورا بدن کانپ رہا تھا۔ میرے گھٹنے اس بری طرح سے کانپ رہے تھے کہ مجھ سے چلا نہیں جا رہا تھا، سائیکل چلانا تو دور رہا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے میں نے نغمے کی کتاب کو سائیکل کے کیریئر پر جمایا اور سائیکل کو ڈھکیلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ جیسے ہی میں بڑھا، برے برے خیالات میرے دماغ میں کوندنے لگے۔ وہ بات جس نے مجھ میں ہلچل پیدا کر دی تھی، جس نے مجھے ادھیڑ بن کی، ہیجانی حالت میں پہنچا دیا تھا؛ مس فنکیل کا باتیں سنانا نہیں تھا؛ نہ تو مار کھانے کا ڈر تھا اور نہ گھر میں بند کیے جانے کا ڈر؛ یہ کسی بھی طرح کا خوف نہیں تھا۔ وہ تھی برباد کرنے والی حقیقت شناسی کہ پوری دنیا ناانصاف ہے، مہلک ہے، خطرناک اور بنیادی طور پر بڑی مطلبی ہے۔ اور اس کے گندے خطرناک مطلبی ہونے کے ذمہ دار دوسرے لوگ تھے۔ بھی لوگ۔ سب، بغیر کسی استثنیٰ کے۔ ان کی شروعات میری ماں سے ہوتی تھی، جنھوں نے مجھے نئی سائیکل دلانے سے انکار کر دیا تھا؛ میرے والد، جنھوں نے میری ماں کا اس فیصلے میں ساتھ دیا تھا؛ میرا بڑا بھائی اور بہن، جو اس سائیکل کے ملنے پر چپکے چپکے مجھ پر ہنستے تھے؛ مسز ہارٹ لاؤب کا وہ بے ہودہ کتا جو ہمیشہ میری گھات میں رہتا تھا؛ وہ راہگیر جو جھیل والی سڑک پر میرے لیے رکاوٹ بنے تھے، اسی وجہ سے مجھے پہنچنے میں دیر ہوئی تھی؛ نغمہ نگار ہاش لُر اور اس کی بیزار کن اور نہ بجائی جا سکنے والی دھنیں؛ مس فنکیل کی غلط تہمتیں اور ایف شارپ پر ان کی سڑی ہوئی ناک... یہاں تک کہ سب لوگ، اس میں خدا بھی شامل تھا، جی ہاں، زبردستی کا قادر مطلق، جس سے میں نے مدد مانگی اور اس موقعے پر اس نے بزدلانہ خاموشی اختیار کر لی اور ناانصافی کو اپنی ہی کرنے دی۔ جب وہ سب لوگ میرے خلاف سازش کرنے کے لیے متحد ہو گئے تھے، تو اس مجمعے سے میں کیسے نپٹتا؟ آخر میں اس دنیا میں کر کیا رہا تھا؟ اس مطلبی، گھٹیا دنیا میں۔ ان سب کو ان کے مطلبوں میں پھنسا رہنے دو! وہ سب جہاں اپنی ناک پونچھنا چاہیں پونچھنے دو! جتنا زیادہ ہو سکے وہ مجھے خود سے دور کر دیں۔ میں نے سب سہا۔ میں دنیا کو خدا حافظ کہنے جا رہا تھا۔ میں خود کو ختم کرنے جا رہا تھا — اسی وقت۔

جیسے ہی میں نے یہ تہیہ کیا، میرا دل بے حد ہلکا ہو گیا۔ یہ تصور کہ مجھے 'یہ دنیا چھوڑ دینا

Scanned with CamScanner

چاہیے' ــــ ان تمام ناانصافیوں اور بے ہودگیوں کو جھیلنے کے دوران مجھے یہ طرزِ عمل بڑا پرکشش لگا ــــ اس میں کچھ تشفی اور فیاضی کا غیر معمولی عنصر بھی ملا ہوا تھا۔ میرے آنسو خشک ہو گئے۔ میری کپکپی بند ہوگئی۔ ایک بار پھر اس دنیا میں امید کی کرن پھوٹ نکلی۔ بس اب اس کے صحیح طریقے سے عمل پذیر ہونے کی کسر تھی۔ بس اس سے پہلے کہ میرا خیال بدل جائے۔

میں نے پیڈل پر پیر رکھا اور سائیکل آگے بڑھا دی۔ اوبرن زے کے بیچ راستے سے میں نے گھر کی طرف جانے والی سڑک نہیں لی، بلکہ داہنی طرف مڑ گیا جھیل سے مخالف سمت میں، جنگل سے ہوتا ہوا پہاڑی پر چڑھ گیا اور اوبڑ کھابڑ راستے سے ہوتا ہوا ٹرانسفارمر کے پاس اپنے اسکول کی سڑک پر نکل آیا ــــ وہاں میری پہچان کا سب سے بڑا درخت کھڑا ہوا تھا، یہ اسپروس کا ایک بہت بڑا اور پرانا سرخی مائل درخت تھا۔ اس درخت پر مجھے چڑھنا تھا، اور اس کی پھنگی پر سے خود کو موت کے منھ میں جھونکنا تھا۔ اور کوئی دوسری قسم کی موت میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ حالانکہ ڈوبنے اور چاقو مار لینے اور پھانسی لگا لینے سے بھی موت ہو سکتی تھی، اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ خود کا دم گھونٹ لینا یا کرنٹ لگا لینا بھی ممکن ہے ــــ اس آخری والی ترکیب کے بارے میں تو ایک بار میرے بھائی نے پوری تفصیل سے تشریح بھی کی تھی: ''لیکن اس کے لیے تم کو zero axial کنڈکٹر چاہیے ہوگا،'' اس نے کہا تھا: ''جس پر الفا اور اومیگا ہو، کیونکہ بغیر زیرو ایگزیئل کنڈکٹر کے کچھ نہیں ہوگا، ورنہ تو ننگے تاروں پر بیٹھنے والی چڑیاں فوراً ہی مر نہ جاتیں۔ اور جیسا کہ تم کو معلوم ہے، وہ نہیں مرتیں۔ اور کیوں نہیں مرتیں؟ کیونکہ ان کے پاس زیرو ایگزیئل کنڈکٹر نہیں ہوتا۔ نظری طور پر، ہزاروں وولٹ کا ہائی ٹنشن والا تار تم کو بہت سہل لگ سکتا ہے، لیکن بغیر زیرو ایگزیئل کنڈکٹر کے کچھ بھی نہیں ہوگا۔''

میرے بھائی کو بھلے ہی یہ سب سمجھ میں آتا ہو، لیکن میرے لیے یہ کرنٹ وغیرہ کا نظام بہت پیچیدہ تھا۔ نا بھائی ــــ میرے لیے تو پیڑ کی پھنگی پر سے گرنا سب سے ٹھیک تھا۔ مجھے گرنے کے مطابق تھوڑا بہت معلوم بھی تھا۔ میرے لیے گرنے میں کوئی قباحت نہیں تھی۔ میرے لیے اپنی موت پانے کا یہی ایک ممکن طریقہ تھا۔

میں نے اپنی سائیکل کو ٹرانسفارمر سے ٹکا کر کھڑا کر دیا، اور نئے اُگ رہے پودوں میں سے ہوتا ہوا سرخ اسپروس کے درخت کی طرف چل دیا۔ یہ درخت اتنا پرانا ہو چکا تھا کہ اس کی نچلی

ڈالیاں جھڑ چکی تھیں، لہٰذا پہلے میں قریب کے ایک سرو کے پیڑ پر چڑھا اور پھر اس پر سے اسپروس کے درخت پر پہنچ گیا۔ اب اس پر چڑھنا آسان ہو گیا تھا۔ اس کی موٹی، مضبوط شاخیں بالکل سیڑھی کے ڈنڈے کی طرح تھیں اور پھر میں بغیر رکے چڑھتا گیا چڑھتا گیا، یہاں تک کہ اچانک ڈالیوں میں سے مجھ پر دن کی روشنی پھوٹ پڑی، اور وہاں درخت کا تنا اتنا پتلا ہو گیا تھا کہ میں اسے دھیرے دھیرے جھومتے ہوئے محسوس کر سکتا تھا۔ میں اب بھی درخت کی پھنگی سے ذرا نیچے ہی تھا، لیکن، جب میں نے پہلی بار نیچے دیکھا تو مجھے کہیں زمین دکھائی ہی نہیں دی، میرے پیروں کے نیچے پتلی پتلی ڈالیوں اور شاخوں اور اسپروس کے پھلوں کا ایسا جھنڈ تھا جو ایک سبزی مائل بھورا اور دبیز قالین لگ رہا تھا۔ یہاں سے کودنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے بادلوں کے اوپر سے کودا جائے — نیچے کا نظارہ ایک نرم اور آرام دہ بستر کا سا تھا، جس پر گرنے کا نتیجہ دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔ اور میں ایسی نامعلوم جگہ گرنا نہیں چاہتا تھا، میں تو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا کہ گرتے وقت میں کہاں اور کیسے اور کس چیز کے پاس سے گزر رہا ہوں۔ میں چاہتا تھا کہ میرا گرنا گیلیلیو کے تجربوں والا کلاسک بے باک گرنا ہو۔

لہٰذا میں نے نیچے کم روشنی والے حصے میں اترنا شروع کیا، میں تنے کے چاروں طرف دیکھتا ہوا اتر رہا تھا کہ کہاں ایسی جگہ ہے کہ میں بغیر کسی چیز سے ٹکرائے صفائی سے گر سکوں۔ بس میں ایک یا دو شاخیں ہی نیچے اترا تھا کہ مجھے ایک بہت ہی معقول جگہ مل گئی، یہ ایک سرنگ جیسی کھلی ہوئی گلیاری تھی، اب جو میں نے زمین کی طرف دیکھا تو وہاں زمین پر درخت کی جڑیں ابھری ہوئی تھیں جن سے یقینی طور پر ایک زبردست اور مہلک ٹکر نہ ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ بغیر کسی طرح کی مزاحمت کے نیچے گرنے کے لیے اب مجھے بس شاخ پر تھوڑا سا تنے سے الگ کھسکنا تھا۔

میں دھیرے دھیرے دبکتا ہوا تنے سے ٹیک لگا کر شاخ پر بیٹھ گیا، اور ایک گہری سانس لی۔ اس وقت تک میں ان انتظامات میں اتنا زیادہ الجھا ہوا تھا کہ اپنے اس جان دینے والے فیصلے پر اپنا ردعمل ظاہر کرنے کا مجھے موقع ہی نہ مل سکا تھا۔ اب اس نازک لمحے میں، میرے خیالات بھیڑ کی شکل میں میری طرف بڑھنے لگے، اور میں دوبارہ اس بدکار دنیا پر اور اس کے تمام باشندوں پر لعنت ملامت کرنے لگا، میں نے اپنے خیالات کا رخ اپنی تدفین کے پُرکیف موضوع کی طرف موڑ دیا۔

Scanned with CamScanner

آہا، یہ بھی کیا شاندار تدفین ہوگی! چرچ کے گھنٹے بجیں گے، آرگن بجایا جائے گا، اوبرن زے کا قبرستان سوگواروں سے قریب قریب بھر جائے گا۔ میں ساکت، پھولوں کے بستر پر، شیشے کے تابوت میں لیٹا ہوں گا، ایک چھوٹا کالا گھوڑا مردہ گاڑی کو کھینچ رہا ہوگا، اور چاروں طرف بالکل سناٹا ہوگا سوائے لوگوں کی سسکیوں کے، میرا بھائی اور بہن رو رہے ہوں گے، میرے کلاس کے تمام بچے، مسز ہارٹ لاؤب اور مس فنکیل رو رہی ہوں گی، تمام احباب اور رشتے دار دور دور سے میری میت پر رونے آئیں گے، اور، رونے کے دوران، وہ بھی اپنے سینوں کو کوٹیں گے اور بکا اور ماتم کریں گے، ''ہائے! اس پیارے اور نایاب بچے کی اس ناوقت موت کے ہم سب ذمہ دار ہیں! ہائے! کاش ہم نے اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا ہوتا، ہم نے اس کے ساتھ اتنی سختی اور ناانصافی نہ کی ہوتی تو آج یہ پیارا، اچھا، چہیتا لڑکا زندہ ہوتا!'' اور میری قبر کے پاس کھڑی ہوئی کیرولینا کوکلمان میری قبر پر گلدستہ رکھتی اور آخری بار رخصت ہونے کے لیے مجھے دیکھتی، اور اپنے آنسوؤں کے ساتھ، تکلیف دہ بھرآئی ہوئی آواز میں کہتی، ''ہائے، میری جان! صرف میرے! کاش میں پیر کو تمھارے ساتھ آجاتی!''

خوشگوار تصورات! میں ان سے جی بھر کے لطف اندوز ہوا، تدفین کے اجزا، کفن پہنانے، چائے اور شیرینی کے دور چلنے، میرے بارے میں قصیدہ پڑھنے جیسے لوازمات کو میں نے بار بار چھوٹی موٹی تبدیلیوں کے ساتھ دہرایا، اور آخر میں یہ سارا معاملہ اتنا زیادہ جذباتی ہوگیا کہ میں بس رویا تو نہیں، لیکن میری آنکھیں ضرور نم ہوگئیں۔ ان علاقوں میں ہونے والی تمام تدفینوں میں اس تدفین کا کوئی مقابلہ نہیں تھا، آنے والے وقت میں لوگ کئی دہائیوں تک اس تدفین کو یاد رکھیں گے... کتنے افسوس کی بات ہے کہ خود میں ہی اس میں شریک نہ ہوسکوں گا، کیونکہ میں تو مر چکا ہوں گا۔ بدقسمتی سے میرے کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ اس طرح کی تدفین کے لیے مجھے مرنا پڑے گا۔ میں اپنا کیک بھی نہیں کھا سکوں گا۔ دنیا سے انتقام لینا ہے، یا دنیا میں یوں ہی رہتے رہنا ہے؟ انتقام لینا ہے!

میں اسپروس کے درخت کے تنے سے کھسکا۔ دھیرے دھیرے، ایک ایک انچ کرکے، میں نے تنے سے کھسکنا شروع کیا، میرا ایک ہاتھ تنے پر تھا، جس سے میں سہارا ابھی لیے ہوئے تھا اور خود

Scanned with CamScanner

کو ذرا ڈھکیل بھی رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے جس شاخ پر میں بیٹھا تھا اسے زور سے پکڑے ہوئے تھا۔ پھر وہ وقت آیا جب تنے کو صرف میری انگلیوں کی پوریں چھو رہی تھیں۔۔۔ اور پھر وہ بھی ہٹ گئیں۔۔۔ اور تب میں نے صرف شاخ کو بغیر کسی دوسرے سہارے کے اپنے دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ میں نے اپنی اونچائی کا اندازہ لگایا تو یہ ہمارے گھر کی پہلی منزل کی تین گنا تھی۔ ہمارے گھر کی پہلی منزل تیس فٹ تھی، لہٰذا میں تقریباً نوّے فٹ کی بلندی پر تھا۔ تو گیلیلیو گیلیلی کے قوانین کے مطابق میرے گرنے میں تقریباً 2.4730986 سیکنڈ لگنا تھے اور اس کے بعد 54.15 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے مجھے زمین سے ٹکرانا تھا۔

میں بڑی دیر تک نیچے زمین کو دیکھتا رہا۔ مجھے محسوس ہوا کہ گہرائی مجھے کھینچ رہی ہے۔ میں اس میں ڈوبا جا رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا وہ مجھے اشارے کر رہی ہو، ''بس، کود پڑو!'' وہ مجھے غیبی تاروں سے کھینچ رہی تھی۔ ''آجاؤ!'' اور یہ بہت آسان تھا، بچکانی حد تک آسان۔ بس ذرا سا آگے کی طرف جھکنا تھا، بس ذرا سا توازن گڑبڑانا تھا — باقی کا کام تو خود بخود ہو جانا تھا۔۔۔

''بس، کود پڑو۔''

ہاں ہاں، میں کودنا تو چاہتا ہوں! لیکن میں یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوں کہ کب! کس وقت! سیکنڈ کے کس حصے میں! میں نہیں بتا سکتا، اب! اب بس میں کود جاؤں!

میں نے فیصلہ کیا کہ میں تین تک گنوں گا، جیسے ہم لوگ ایک دوسرے سے دوڑ لگانے اور پانی میں کودنے کے لیے کیا کرتے تھے۔ بس تین پر پہنچتے ہی میں کود پڑوں گا۔ میں نے گہری سانس لی اور گننا شروع کیا۔

''ایک۔۔۔ دو۔۔۔'' اور پھر میرا سلسلہ ٹوٹ گیا، کیونکہ میں نے یہ طے نہیں کیا تھا کہ گرتے وقت مجھے اپنی آنکھیں کھلی رکھنا چاہیے یا بند۔ ذرا غور کرنے کے بعد، میں نے فیصلہ کیا کہ گنتی گنتے وقت میں اپنی آنکھیں بند رکھوں گا، تین تک پہنچنے پر بھی آنکھیں بند رکھوں گا اور اس کے بعد کے خالی لمحے میں گرنے کے لیے میں جھک جاؤں گا، اور آنکھیں اس وقت کھولوں گا جب میں واقعی گرنا شروع کر دوں گا۔ میں نے دوبارہ اپنی آنکھیں بند کیں اور گنتی شروع کی: ''ایک۔۔۔ دو۔۔۔''

تبھی مجھے کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز سڑک کی طرف سے آرہی تھی۔ آہنگ کے

Scanned with CamScanner

ساتھ، کھٹ کھٹ کی آواز: ''کھٹ — کھٹ — کھٹ''، میرے گننے کی رفتار سے ڈگنی تیزی سے، اس طرح ''ایک'' پر ایک ''کھٹ''، ''ایک'' اور ''دو'' کے درمیان ''کھٹ''، ''دو'' پر ''کھٹ''، ''دو'' اور آنے والے ''تین'' کے درمیان پھر ''کھٹ'' — بالکل مس فنکیل کی تال کی طرح: ''کھٹ — کھٹ — کھٹ۔'' بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ کھٹ کھٹ میری گنتی گڑبڑانے کی جان بوجھ کر کوشش کر رہی ہے۔ میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور اسی وقت وہ کھٹ کھٹ بند ہو گئی اور میں نے سرسراہٹ، ڈنڈیوں کے کھڑ کھڑ کرنے اور کسی جاندار کے زور زور سے ہانپنے کی آواز سنی — اور وہاں، تقریباً نوّے فٹ دور، بالکل میرے نیچے، مسٹر زومر کھڑے ہوئے تھے، تو اگر میں کودتا تو یقیناً ہم دونوں کا کچومر ہی نکل جاتا۔ میں نے اپنی شاخ کو پوری طاقت سے جکڑ لیا اور آگے نہیں سرکا۔

مسٹر زومر وہاں کھڑے ہانپ رہے تھے۔ جب ان کے ذرا دم آ گیا، تو وہ اچانک ساکت ہو گئے اور انھوں نے اپنی سانس روک لی، اِدھر اُدھر اپنی گردن کو جھٹکے دیے، شاید وہ کچھ سن گن لے رہے تھے۔ پھر وہ نیچے جھکے اور انھوں نے بائیں طرف جھاڑیوں میں جھانکا اور داہنی طرف پیڑوں میں، وہ ریڈ انڈین کی طرح پیڑ کے چاروں طرف گھومے اور پھر اپنی جگہ پر آ کر کھڑے ہو گئے اور چاروں طرف ایک بار پھر دیکھنے اور سننے لگے (لیکن انھوں نے اوپر نہیں دیکھا!)، اور جب انھیں یقین ہو گیا کہ کوئی انھیں دیکھ نہیں رہا ہے، اور وہاں آس پاس کوئی نہیں ہے تو انھوں نے تین جمی ہوئی حرکات میں اپنی اسٹرا ہیٹ، اپنی چھڑی اور اپنا جھولا اتارا، اور زمین پر پیڑ کی جڑوں کے درمیان ایسے لیٹ گئے جیسے بستر پر لیٹے ہوں۔ لیکن لیٹنے پر ذرا دیر بھی انھوں نے آرام نہیں کیا، بلکہ ایک لمبی اور سرد آہ کھینچی — نہیں، وہ آہ نہیں تھی، کیونکہ آہ میں بھی کچھ راحت کا عنصر ہوتا ہے، وہ تو بہت کچھ کراہنے جیسا تھا، سینے کے اندر سے نکلتی ہوئی ایک کھوکھلی کھرکھراہٹ سی آواز، مایوسی اور سکون کی تلاش کی ملی جلی آواز۔ دوسری بار پھر انھوں نے وہی خوفناک، مایوسی سے کراہتی ہوئی، بالکل بے ضابطہ عذاب اور تکلیف والی آواز نکالی، اور پھر اس میں وہی نہ سکون نہ آرام اور نہ ہی ذرا سی راحت کا احساس تھا، کیونکہ وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئے، اپنا جھولا اٹھایا، اس کے اندر سے عجلت کے ساتھ سینڈوچ اور ٹین کی پانی کی بوتل نکالی، اور ندیدے پن سے جلدی جلدی چپڑ چپڑ کر کے سینڈوچ منھ میں ٹھونسنے لگے، چبانے کے دوران وہ رک رک کر مشکوک نظروں سے چاروں طرف دیکھتے بھی جاتے

Scanned with CamScanner

تھے، جیسے کوئی خطرہ ان کے پیچھے لگا ہو، اور اس سے ان کا فاصلہ بہت کم ہو، اور یہ فاصلہ لحہ بہ لحہ کم ہوتا جا رہا ہو، اور وہ خطرہ کسی بھی لمحے یہاں بس پہنچنے ہی والا ہو۔ ذرا ہی دیر میں انھوں نے پورا سینڈوچ نگل لیا، پانی کی بوتل سے ایک چسکی لی اور پھر مزید عجلت کے ساتھ جانے کی تیاری شروع کر دی: پانی کی بوتل اپنے جھولے میں ڈالی، کھڑے ہوتے ہوتے جھولے کو کندھے پر ڈالا، ہیٹ اور چھڑی کو جھپٹا، اور دگنی رفتار سے ہانپتے ہوے، جھاڑیوں سے بھڑتے ہوے، چھوٹی چھوٹی ڈالیوں میں ہلچل پیدا کرتے ہوے نکل پڑے، اور پھر سڑک پر سے تدریجاً جلدی جلدی دھیمی ہوتی ہوئی ان کی چھڑی کے ڈامر کی سڑک پر پڑنے کی کھٹ کھٹ کھٹ کی آواز ایک آہنگ میں آتی ہوئی سنائی دینے لگی۔

میں اسپروس کی شاخ پر بیٹھا تھا اور خود کو تنے کی طرف کھسکانے لگا، اب یہ مت پوچھیے کہ میں وہاں سے واپس کیسے آیا۔ میں کپکپا رہا تھا اور تھرتھرا رہا تھا۔ اچانک ہی موت کے منھ میں کودنے کا خیال رفع ہو گیا۔ مجھے یہ بڑا بے تکا پن لگا۔ اس وقت تو میں یہ سمجھ ہی نہ سکا کہ ایسا بے وقوفی کا خیال میرے دماغ میں آیا کیسے: ایک ذرا سی ناک کی وجہ سے خود کو مار ڈالنا! خاص کر جب میں نے ایک ایسے آدمی کو دیکھا تھا جس کی پوری زندگی اپنی موت سے بھاگنے میں گذر رہی تھی۔

5

پانچ یا چھ برس ضرور گذر چکے تھے کہ جب میری مسٹر زومر سے دوسری بار ملاقات ہوئی، اور یہ آخری ملاقات بھی تھی۔ حالانکہ اس عرصے میں متعدد موقوں پر میں نے انھیں دیکھا تھا— جیسا کہ وہ ہمیشہ اپنے دوروں پر رہتے تھے اس لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ ان سے کہیں سڑک پر مٹھ بھیڑ نہ ہو، یا تو وہ جھیل کے کنارے راستوں پر دکھائی دے جاتے، یا میدانوں میں، یا پھر جنگل میں۔ میں ان سے بہت زیادہ واقف نہیں تھا، مجھے نہیں لگتا کہ کسی اور کو بھی ان کے بارے میں کوئی خاص معلومات تھی، وہ اتنی مرتبہ دکھائی دیا کرتے تھے کہ ہم لوگ ان کی موجودگی سے بے نیاز ہو گئے تھے۔ ہم ان کے وجود سے اس قدر مانوس ہو چکے تھے جیسے وہ گاؤں کے منظر کا ہی ایک حصہ ہوں، لہٰذا ان چیزوں کو دیکھ کر آپ کو کسی طرح کا تعجب نہیں ہوتا، جیسے آپ کبھی یوں نہیں کہیں گے، ''وہ دیکھو، مینار!'' یا میں

کہوں، ''وہ وہاں اسکول کی پہاڑی کے اوپر! وہ دیکھو، بس جا رہی ہے...!'' بس کبھی کبھار، جیسے اتوار کو جب میں اپنے والد کے ساتھ گھڑ دوڑ دیکھنے جاتا، اور سڑک پر ہماری کار ان کے پاس سے گذرتی تو ہم میں سے کوئی طنزیہ انداز میں بول دیتا، ''وہ دیکھو، مسٹر زومر جا رہے ہیں — اپنی موت کو...'' حالانکہ اس وقت ہمارا یہ جملہ اس آدمی کی طرف بالکل منسوب نہیں ہوتا تھا جو ہمارے آگے ہوتا یا ہمارے پیچھے، بلکہ یہ جملہ تو کئی برس پہلے آئے اس اولوں سے بھرے طوفان والے دن کی یادوں کی بازگشت تھا، جب میرے والد نے وہ فرسودہ فقرہ استعمال کیا تھا۔

یقیناً ان کی بیوی، جو گڑیاں بناتی تھیں، مر چکی تھیں، لیکن کسی کو بھی یہ معلوم نہ تھا کہ ان کی موت کب اور کہاں ہوئی، اور نہ کسی نے ان کی تدفین میں شرکت کی تھی۔ وہ اب پینٹر اور ڈیکوریٹر اشٹانگل مائر کے یہاں نہیں رہتے تھے — وہاں تو اب ریٹا اور اس کے شوہر رہنے لگے تھے — بلکہ وہ تو اب چند مکان چھوڑ کر ریڈل نام کے مچھوارے کی کھپریل میں اٹھ آئے تھے۔ وہ کبھی وہاں زیادہ وقت نہیں ٹھہرتے تھے، مسز ریڈل نے بعد میں انکشاف کیا تھا کہ وہ بس ذرا دیر کے لیے آتے تھے، بس چائے بنانے یا کچھ کھانے کے لیے، اور پھر نکل جاتے۔ اکثر تو وہ دن ختم ہونے پر بھی نہ آتے، بلکہ راتوں کو بھی باہر ہی ٹھہرتے تھے؛ وہ کہاں رہتے تھے، وہ راتیں کہاں گذارتے تھے، کیا وہ کبھی سوتے بھی تھے، وہ ہمیشہ کہاں رہتے تھے، اور کیا وہ پوری رات بھٹکا کرتے تھے — اس بارے میں کسی کو نہیں معلوم تھا۔ بلکہ کوئی پروا بھی نہیں کرتا تھا۔ اب لوگوں کے پاس پروا کرنے کے دوسرے تمام سامان تھے۔ لوگ اپنی کاروں، اپنی واشنگ مشینوں، اپنے پانی کے ہزارے میں مصروف تھے نہ کہ اس کی فکر تھی کہ یہ سنکی بوڑھا راتیں کہاں بسر کرتا ہے۔ لوگ ایک دن پہلے ریڈیو پر سنی ہوئی خبروں یا ٹیلی ویژن کے پروگراموں کے بارے میں بات کرتے تھے، یا پھر مسز ہارٹ کی نئی کھلی سلف سروس سُپر مارکٹ کے بارے میں بات کرتے تھے — لیکن مسٹر زومر کے بارے میں تو بالکل نہیں! یوں تو مسٹر زومر اب بھی گاہے بگاہے نظر آتے ہی رہتے تھے، مگر عام لوگوں کے شعور میں اب وہ موجود نہیں تھے۔ وقت نے، جیسا کہ لوگ کہتے ہیں، مسٹر زومر پر پردہ ڈال دیا تھا۔

مجھ پر نہیں! چونکہ میں نے وقت کے ساتھ تناسب قائم رکھا تھا، میں وقت کے ساتھ ساتھ رہا — خیر جہاں تک مجھے لگتا تھا — اور کئی بار تو مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ میں اپنے وقت سے آگے ہوں!

Scanned with CamScanner

میں اب پانچ فٹ سات انچ لمبا ہو گیا تھا، میرا وزن ساڑھے سات اسٹون تھا، اور میں سات نمبر کا جوتا پہنتا تھا۔ میں اسکول میں پانچویں درجے میں جانے والا تھا۔ میں گرِم کی تمام کہانیاں اور موپاساں کو بھی آدھا پڑھ چکا تھا۔ اور جلد ہی، مجھے سرخ رنگ سے '16' کی مہر لگا ہوا اسٹوڈنٹ کارڈ بھی ملنے والا تھا، جس کے ملنے کی سب کو بڑی تمنا رہتی تھی، اور جو مجھے 'A' اور 'AA' والی فلمیں دیکھنے کا حق دیتا تھا، اور 'ماں باپ اور/ یا کسی ذمہ دار' کے بغیر ریستوراں اور کیفے میں رات کے دس بجے تک جانے کا بھی حق دیتا تھا۔ میں ایک ہی وقت میں حساب کے سوال بھی لگا لیتا تھا اور میڈیم ویو والا کرسٹل ریسیور بھی بنا سکتا تھا، مجھے De bello Gallico زبانی یاد تھی، اوڈیسی کی پہلی سطر بھی ——— حالانکہ میں نے اپنی زندگی میں کبھی یونانی نہیں پڑھی تھی، تب بھی۔ پیانو پر اب میں دیابیلی یا نفرت زدہ ہاش لر کی دھن نہیں بجاتا تھا، بلکہ اب تو مقبول نغمہ نگاروں جیسے ہیڈن، شومان، بیتھوفن اور شوپیں میرے پسندیدہ نغمہ نگار تھے، اور میں بوگی ——— ووگی اور بلوز بھی خوب بجاتا تھا۔ اب جب کبھی مس فنکیل مجھ پر غصے میں برستیں، تو میں ان کی جھاڑ کو فلسفیانہ طور پر لے لیتا، بلکہ بدتمیزی سے چپکے چپکے کھی کھی، کھی کھی بھی کرتا۔

اب پیڑوں پر چڑھنا تو بالکل ہی ختم ہو گیا تھا۔ بلکہ اب تو میری اپنی سائیکل تھی، میرے بھائی کی پرانی والی سائیکل، جس کے ہینڈل نیچے کی طرف گرے ہوئے تھے اور اس میں تین اسپیڈ گیئر بھی تھے، اس سائیکل سے میں نے اُنٹرن زے سے مس فنکیل کے مکان تک کے فاصلے کو اپنے بھائی کے ساڑھے تیرہ منٹ میں عبور کرنے کے ریکارڈ کو پورے پینتیس سیکنڈ سے توڑا تھا ——— وہ بھی اپنی خود کی گھڑی کے وقت کے مطابق۔ اصل میں ——— پورے انکسار سے کہوں تو ——— میں کچھ سائیکل اسٹار ٹائپ بن گیا تھا، صرف رفتار اور اسٹیمنا کے معاملے میں نہیں، بلکہ پھرتی میں بھی۔ ہاتھ چھوڑ کر چلانا، اور موڑ مڑنا، بغیر جھولا کھائے ایک سو اسّی ڈگری میں سائیکل کو گھما دینا، یا زور سے بریک لگانا اور پھسلانا، یہ سب کچھ میرے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ میں سائیکل کے کیریئر پر کھڑا ہو سکتا تھا ——— حالانکہ اس کا کوئی مطلب نہیں تھا لیکن یہ بڑی پرکشش ہنرمندی تھی جس سے اس بات کی تصدیق ہوتی تھی کہ اب مجھے اینگلر مومنٹم کے قانون پر کتنا اعتماد تھا۔ مشق کے ساتھ ساتھ میرے نظریے میں سائیکل چلانے کی جو شرطیں تھیں وہ اب از کار رفتہ ہو گئی تھیں۔ میں ایک پرجوش سائیکلسٹ بن گیا

Scanned with CamScanner

تھا۔ مجھے لگنے لگا تھا کہ سائیکل چلانا بالکل اڑنے جیسا ہے۔

ظاہر ہے اب بھی کچھ باتیں ایسی تھیں جنھوں نے میری زندگی کو ضیق کر رکھا تھا، جیسے (الف) یہ حقیقت کہ وی ایچ ایف والا وائرلیس ہمیشہ میرے تصرف میں نہیں رہتا تھا، جس کا مطلب تھا جمعرات، دس سے گیارہ بجے کے دوران آنے والے کرائم تھرلر کو نہ دیکھ پانا، اور اگلے روز صبح، اسکول بس میں اپنے دوست کورنی لیس مِشیل سے ان کے بارے میں ملنے والی معلومات پر قناعت کرنا — جو کہ بالکل مختلف بات تھی؛ اور (ب) یہ حقیقت کہ ہمارے گھر میں ٹیلی وژن نہیں تھا۔ ''گھر میں ٹیلی وژن نہیں لاؤں گا'' یہ میرے والد کا فیصلہ تھا، جو اسی سال پیدا ہوئے تھے جس سال گیوسپے ویردی (Giuseppe Verdi) کی وفات ہوئی تھی۔ ''ٹیلی وژن گھر میں بجائی جانے والی موسیقی کے لیے نقصان دہ ہے، یہ آنکھوں کے لیے مضر ہے، گھریلو زندگی کو برباد کر دیتا ہے اور بے ہودگی کی طرف راغب کرتا ہے۔'' (سال میں صرف ایک دن ایسا تھا جب ٹیلی وژن نہ تو آنکھوں کے لیے مضر ہوتا اور نہ بے ہودگی کی طرف راغب کرتا، وہ جولائی مہینے کے شروع کا دن ہوتا جب ہیمبرگ، ہارن کے فلیٹ کورس سے جرمن ڈربی براہ راست نشر ہوتی۔ اس موقعے کے لیے میرے والد سرمئی رنگ کی ہیٹ پہن کر، کار چلاتے ہوئے اوبرن زے میں مِشیل کے گھر پہنچتے۔ اور وہاں ٹرانسمشن دیکھتے۔) بدقسمتی سے میری ماں اس معاملے میں ان کی تردید کرنے میں ناکام ہوگئی تھیں، اس لیے، گاہے بگاہے تفریح کی خاطر Lassie, Mother Knows Best اور The Adventures of Hiram Holiday جیسے مہذب پروگرام دیکھنے کے لیے مجھے اپنے دوست کورنی لیس مِشیل کے گھر زبردستی بھیجا جاتا۔

کو وقت کی بات یہ تھی کہ یہ سبھی پروگرام شام کے وقت آتے تھے، اور رات آٹھ بجے والی خبروں کے آنے تک ختم نہیں ہوتے تھے۔ اس پر مصیبت یہ کہ ٹھیک آٹھ بجے کھانے کی میز پر، اپنے دھلے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ مجھے موجود ہونا پڑتا تھا۔ بہر حال ایک ہی وقت میں دو جگہ پر موجود ہونا ناممکن بات تھی، خاص طور سے جب ایک جگہ سے دوسری جگہ سائیکل سے پہنچنے میں ساڑھے سات منٹ لگتے ہوں — ہاتھ دھونے کی بات تو چھوڑ ہی دیجیے — میرے ٹیلی وژن دیکھنے پر پابندی سے گریز کرنے نے فرض اور ذاتی میلان کے درمیان چلنے والی روایتی کشمکش کو بڑھاوا دے دیا تھا۔ یا تو

اپنے دوست کے گھر سے شو ختم ہونے کے ساڑھے سات منٹ پہلے ہی نکل پڑوں —— اور ڈرامے کا خاتمہ نہ دیکھوں —— یا اس کا خاتمہ دیکھ لوں، اور رات کے کھانے پر ساڑھے سات منٹ دیر سے پہنچوں، اور ماں کی ڈانٹ، اور گھریلو زندگی پر ٹیلی وژن سے پڑنے والے منفی اثرات پر اپنے والد کا طویل لکچر سنوں۔ میری زندگی کا وہ پورا دور اس قسم کے تذبذب سے بھرا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ہمیشہ تنبیہ کی جاتی تھی کہ تم کو یہ کرنا چاہیے، یوں کرو، یوں نہ کرو، یہ نہیں کرنا چاہیے... ہمیشہ کسی نہ کسی چیز کی آپ سے توقع، مطالبہ، حاجت: یہ کرو! وہ کرو! یہ مت بھولو! تم نے ابھی تک یہ نہیں کیا؟ تم ابھی تک وہاں نہیں گئے؟ تم کیوں... ؟ دباؤ، مستقل طور پر تناتنی، ہمیشہ وقت کی تنگی، ہر چیز وقت پر۔ ان دنوں ایسا بہت کم ہوتا کہ لوگ آپ کو سکون سے رہنے دیتے... لیکن میں اپنے بچپن کی ان تمام تکراروں پر نہ فریاد کرنا چاہتا ہوں اور نہ غصہ۔ بہتر تو یہ ہوگا کہ میں جلدی سے اپنے سر کو کھجاؤں، یا شاید اپنی بیچ والی انگلی سے سر کے پیچھے ایک خاص مقام پر ایک یا دو بار ٹھک ٹھک کروں، اور اس بات پر پوری توجہ دوں کہ آخر مسٹر زومر کے ساتھ ہونے والی اپنی آخری ملاقات کے بارے میں اور اس کہانی اور ان کی کہانی کے خاتمے پر میں کیا بتانا چاہتا ہوں۔

وہ خزاں کا موسم تھا، میں مشیل کے گھر سے ٹیلی وژن دیکھ کر واپس آ رہا تھا۔ اس دن کا پروگرام بڑا اکتا دینے والا تھا، اور ڈرامے کا خاتمہ بڑے گھسے ہوئے انداز میں ہونے والا تھا، لہٰذا میں آرام سے معقول وقت پر رات کے کھانے پر پہنچنے کے لیے آٹھ بجنے میں پانچ منٹ پر ہی مشیل کے گھر سے نکل پڑا۔

اندھیرا چھانے لگا تھا، صرف مغرب میں آسمان دھندھلا دھندھلا سرمئی مائل ہو رہا تھا۔ میں بغیر لائٹ کے ہی سائیکل چلا رہا تھا، کیونکہ جزوی طور پر اس کی لائٹ میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ رہتی ہی تھی —— اگر بلب ٹھیک ہوتا، تو اس کی وائرنگ میں کچھ خرابی ہو جاتی تھی —— اگر میں ڈائمو کو ٹھیک کرنے بیٹھ جاتا تو اُنٹرن زے پہنچنے میں مجھے پورے ایک منٹ کی دیر ہو جاتی۔ ویسے بھی، مجھے لائٹ کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ میں یہ راستہ تو سوتے ہوئے بھی طے کر سکتا تھا۔ یہاں تک کہ اندھیری گھپ راتوں میں بھی، سڑک کا کالا ڈامر، ایک طرف باغ کے جنگلے اور دوسری طرف جھاڑیوں کے بیچ میں، الگ سے دکھائی دیتا، لہٰذا احتیاط کے ساتھ آپ کو اپنی سائیکل اندھیرے میں

Scanned with CamScanner

سب سے گہرے اندھیرے والی جگہ پر رکھنا ہوتی تھی۔

تو جناب، میں اس ڈوبتی رات میں سائیکل کے ہینڈل پر جھکا ہوا، تیسرا گیئر لگائے، اڑا چلا جارہا تھا، اور ٹھنڈی، نم اور جگہ جگہ دھوائی ہوئی ہوا میرے کانوں میں سیٹیاں بجارہی تھی۔

تقریباً آدھا راستہ طے کرنے پر — اس مقام پر جہاں سے سڑک جھیل سے کٹنے لگتی تھی، اور بجری والے پرانے گڑھے سے کٹتی تھی، جس کے پیچھے بہت گھنا جنگل تھا — میری سائیکل کی چین اتر گئی۔ یہ، بدقسمتی سے، بہترین گیئر سسٹم ہونے کے باوجود، اس میں پیش آنے والی بڑی خرابی تھی، کہ اسپرنگ کے ڈھیلے ہونے کی وجہ سے چین تنی ہوئی نہ رہ پاتی تھی۔ میں پہلے بھی اس خرابی کو دور کرنے کی ناکام کوششوں کے ساتھ جوجھنے میں کئی شامیں برباد کر چکا تھا۔ میں نے سائیکل کو روکا، اس پر سے اترا اور پہیے میں گھس کر چین کو ٹھیک کرنے لگا، جو گیئر کی ڈھری اور فریم میں پھنسی ہوئی تھی، دھیرے دھیرے پیڈل کو گھماتے ہوئے، میں نے چین کو دوبارہ گیئر کے کانٹوں پر چڑھا دیا۔ میں اس کام میں اتنا ماہر ہو گیا تھا کہ اندھیرے میں بھی آسانی سے چین چڑھا سکتا تھا۔ لیکن اس کام میں یہ بڑی خرابی تھی کہ اس میں ہاتھ ہمیشہ گریز میں سن جاتے تھے۔ لہٰذا، جب چین چڑھ گئی، تو میں میپل کی بڑی بڑی پتیوں سے اپنے ہاتھ پونچھنے کی خاطر جھیل کی طرف چل دیا۔ جیسے ہی میں نے میپل کی ڈالی کو نیچے جھکایا، سامنے پوری جھیل دکھائی دینے لگی۔ اس وقت وہ ایک بڑے سے روشن آئینے کی طرح لگ رہی تھی۔ اور وہاں، اس آئینے کے ایک کنارے پر، مسٹر زومر کھڑے تھے۔

پہلی نظر میں تو مجھے لگا کہ وہ ننگے پیر ہیں۔ پھر میں نے دیکھا تو وہ پانی میں اپنے بوٹوں تک ڈوبے ہوئے تھے، وہ جھیل کے کنارے سے دو گز کے فاصلے پر کھڑے ہوئے تھے، ان کی پشت میری طرف تھی، وہ دوسرے کنارے کی طرف مغرب کی جانب دیکھ رہے تھے، جہاں دو پہاڑوں کے پیچھے آسمان پر اب بھی ہلکی زرد اور سفید روشنی کی ایک دھجی پڑی ہوئی تھی۔ وہ وہاں جنگلے کے کھمبے کی طرح، بالکل ساکت کھڑے تھے، جھیل کی چمکیلی سطح پر ان کی گہری پرچھائیں پڑ رہی تھی، لمبی اور لہرائی ہوئی چھڑی ان کے ہاتھ میں تھی، اور ان کی اسٹراہیٹ ان کے سر پر۔

اور پھر، ایک دم سے، انھوں نے چلنا شروع کر دیا۔ ایک ایک قدم اٹھاتے ہوئے، اور ہر تیسرے قدم پر چھڑی کو نیچے پانی میں گھسیڑ کر خود کو دھکا دیتے ہوئے، مسٹر زومر جھیل میں چل رہے

Scanned with CamScanner

تھے۔ وہ بالکل ویسے ہی چل رہے تھے جیسے زمین پر چلا کرتے تھے، اپنے خاص عجلت بھرے انداز میں مغرب کی طرف بڑھتے ہوئے وہ جھیل کے بیچ میں پہنچ گئے۔ اس جگہ پر جھیل کا پانی بالکل ساکت تھا۔ بیس گز آگے جانے پر پانی مشکل سے ان کی کمر تک پہنچ رہا تھا، اس کے بعد پانی ان کے سینے تک آ گیا، وہ اب بھی کنارے سے بہت دور نہیں تھے۔ اب پانی ان کی عجلت بھری رفتار میں رکاوٹ پیدا کر رہا تھا، لیکن ان کو روکنا ممکن نہیں تھا، اس رخنہ اندازی کے خلاف انھوں نے اپنی رفتار کو بڑھانے کے اشتیاق میں بضد ہو کر بغیر کسی تامل کے اپنی چھڑی کو دور پھینک دیا اور اپنے ہاتھوں کو چپوؤں کی طرح چلانے لگے۔

میں کھلے منھ اور پھٹی ہوئی آنکھوں سے جھیل کے کنارے کھڑا انھیں ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ میری صورت بالکل ایسی بنی ہوئی تھی جیسی بھوت پریت کا قصہ سنتے وقت لوگوں کی بن جایا کرتی ہے۔ نہ میں چوکنا تھا اور نہ یہ منظر دیکھ کر میں چوندھیایا ہوا ہو رہا تھا، بلکہ میں پوری طرح متوجہ تھا کہ کہیں اس خوفناک منظر کے کسی حصے کو دیکھنے سے میں چوک نہ جاؤں۔ شروع میں تو مجھے یوں لگا کہ جیسے وہ وہاں کھڑے کسی چیز کو ڈھونڈھ رہے ہیں جو پانی میں گم ہو گئی ہے؛ لیکن بھلا کچھ ڈھونڈھنے کے لیے اپنے بوٹ پہنے پہنے پانی میں کون اترتا ہے؟ پھر جب وہ آگے بڑھے، تو مجھے لگا: وہ پانی میں غوطہ لگانے جا رہے ہیں؛ لیکن بھلا اکتوبر مہینے کی رات میں، پورے کپڑے پہنے پہنے پانی میں کون غوطہ لگاتا ہے؟ اور آخر میں، جب وہ اور گہرے پانی میں چلے گئے، تب میرے دل میں بڑا عجیب سا خیال یہ آیا تھا کہ وہ پیدل چلتے ہوئے جھیل کو پار کرنا چاہتے ہیں — پیر کر نہیں۔ ایک سیکنڈ کے لیے بھی میں نے یہ نہیں سوچا کہ وہ پیر رہے ہیں، مسٹر زومر اور پیراکی! یہ دونوں قطعی متضاد باتیں تھیں، بالکل نہیں: انھیں تو پیدل ہی، جلدی جلدی چل کر جھیل کو پار کرنا تھا، سو گز پانی کے نیچے، دوسرے کنارے سے تین میل کے فاصلے پر۔

اب پانی ان کے شانوں تک آ گیا تھا، پھر وہ چڑھ کر ان کے کالر تک آ گیا... انھوں نے جھیل میں مزید زور لگایا... اور وہ پھر پانی پر دوبارہ ابھرے، وہ ذرا دیر کو پانی میں سے ابھرے، ان کے شانے پانی میں سے نمودار ہوئے... وہ بغیر رکے، چلتے رہے، آگے، اور آگے، اب وہ اور گہرائی میں پہنچ گئے تھے، ان کا گلا، پھر کنٹھا... اور صرف اس وقت مجھ پر ظاہر ہونا شروع ہوا کہ کیا ہو رہا

ہے، لیکن نہ تو میں اپنی جگہ سے ہلا، اور نہ میں چلایا، ''رک جائیے، مسٹر زومر! واپس آجائیے!'' نہ میں مدد کے لیے دوڑا، اور نہ میں نے ان کو بچانے کے لیے کسی چیز کو تلاش کیا، جیسے کوئی ناؤ، رافٹ، لیلو، میں نے تو اپنی آنکھیں تک نہ ہلائیں — ایک سیکنڈ کے لیے بھی نہیں، جھپکائیں تک نہیں — میں تو بڑھتے ہوئے سر کے چھوٹے نقطے کو تکے جا رہا تھا۔

اور پھر ایکا ایکی وہ چلے گئے۔ صرف اسٹرا ہیٹ پانی پر تیر رہی تھی۔ ایک اذیت ناک وقفے کے بعد، شاید، آدھے منٹ، یا شاید ایک منٹ کے بعد چند بڑے بڑے بلبلے پانی کی سطح پر پھوٹے، پھر اس کے بعد سناٹا۔ صرف وہ مہمل سی ہیٹ، اب دھیرے دھیرے بہتی ہوئی جنوب مغرب کی طرف جا رہی تھی۔ میں بڑی دیر تک اپنی نظروں سے اس کا تعاقب کرتا رہا، یہاں تک کہ وہ تاریکی میں غائب ہوگئی۔

6

قریب دو ہفتے کے بعد کسی نے مسٹر زومر کی گمشدگی کو محسوس کیا۔ اس کے بعد مچھوارے رائیڈل کی بیوی کو بھی ان کا خیال آیا جنھیں اپنے کھپریل والے کمرے کے کرائے کی فکر ہو رہی تھی۔ دو ہفتے بعد، جب مسٹر زومر پلٹ کر نہیں آئے، تو انھوں نے مسز اِشفا نگل مائر کو بتایا، اور مسز اِشفا نگل مائر نے مسز ہارٹ کو بتایا جنھوں نے اپنے تمام گاہکوں کو اس بارے میں بتایا۔ لیکن جس طرح کسی کو ان کے ٹھکانوں کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ تھا، اسی طرح نہ تو کسی نے مسٹر زومر کو دیکھا تھا اور نہ کچھ معلوم تھا، مزید دو ہفتے گذرنے کے بعد، مچھوارے رائیڈل نے فیصلہ کیا کہ گمشدہ شخص کے بارے میں پولیس کو اطلاع دے دی جائے۔ کئی ہفتے گذرنے کے بعد ایک مقامی اخبار میں چھوٹا سا اشتہار نکلا، جس میں ایک پرانی پاسپورٹ سائز فوٹو بھی لگی تھی۔ اس فوٹو میں کوئی بھی مسٹر زومر کو پہچان نہیں سکتا تھا، کیونکہ وہ ایک گھنے بالوں والے، چست اور پراعتماد، اور ہونٹوں پر کھیلتی شوخ مسکراہٹ والے ایک نوجوان کی فوٹو تھی۔ اس فوٹو کے نیچے لکھی سطر میں پہلی بار لوگوں کو مسٹر زومر کا پورا نام معلوم ہوا: میکسی مِلیَن ارنسٹ ایگی ڈیس زومر۔

پھر، کچھ وقت کے لیے، مسٹر زومر اور ان کی پراسرار گمشدگی گاؤں کی باتوں کا خاص موضوع بن گئی تھی۔ ''وہ تو بس آوارہ پھرا کرتے تھے،'' کوئی کہتا۔ ''ممکن ہے وہ بھٹک گئے ہوں اور انھیں گھر

Scanned with CamScanner

واپس آنے کا راستہ نہ مل سکا ہو۔ ممکن ہے وہ اپنا نام بھول گئے ہوں اور یہ بھی کہ وہ کہاں رہتے ہیں،'' وغیرہ وغیرہ۔

''ممکن ہے انھوں نے ترک وطن کر لیا ہو،'' کچھ کا کہنا تھا؛ ''کناڈا یا آسٹریلیا چلے گئے ہوں۔ اپنے اس کلوسٹروفوبیا کے سبب ان کو یوروپ ناکافی پڑ رہا ہو۔''

''ممکن ہے وہ پہاڑوں میں بھٹک گئے ہوں اور کہیں گر گرا کر مر گئے ہوں،'' کچھ کا یہ بھی کہنا تھا۔

کسی کو جھیل کا خیال تک نہ آیا تھا۔ اور جب اخباروں میں خبر چھپی تو اچھا خاصا وقت گذر چکا تھا، اور مسٹر زومر کو دوبارہ بھلایا جا چکا تھا۔ اب کوئی بھی ان کو یاد نہیں کر رہا تھا۔ مسز رائیڈل نے تہہ خانے کے ایک کونے میں ان کا تھوڑا سا جو سامان تھا اسے سمیٹ کر رکھ دیا، اور گرمیوں کی چھٹیاں بتانے کے لیے آنے والوں کے لیے تہہ خانے کو پھر سے کرائے پر دینے کے لیے تیار کر دیا۔ اب وہ اسے 'summer visitors' نہیں کہتی تھیں کیونکہ یہ نام بہت ٹھسّے والا اور رعب دار لگتا تھا، لہٰذا وہ اب اسے 'townsfolk' یا 'holidaymakers' کہنے لگی تھیں۔

میں اپنی طرف سے خاموشی اختیار کیے رہا۔ میں ایک لفظ بھی نہ بولا۔ اس شام، جب مجھے گھر پہنچنے میں بڑی دیر ہو گئی تھی اور ٹیلی وژن دیکھنے کے مضر اثرات کے بارے میں مجھے بھاشن سننا پڑا تھا، تب بھی میں نے جو کچھ بھی دیکھا تھا اس کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ بتایا۔ اس کے بعد بھی میں نے کچھ نہیں بتایا۔ میں نے اس بارے میں ایک لفظ بھی نہ اپنی بہن سے، نہ اپنے بھائی سے، نہ پولیس سے، یہاں تک کہ کورنی لیس مِشیل سے بھی نہیں کہا۔

معلوم نہیں وہ کیا وجہ تھی جس نے مجھے اتنے دن تک اور اتنی سخت دلی سے خاموش رکھا۔۔۔ لیکن مجھے اتنا یقین ہے کہ اس کی وجہ کسی طرح کا خوف یا گناہ یا بے ایمانی نہیں تھی۔ بلکہ اس کی وجہ تھی جنگل میں ان کا کراہنا، بارش میں ہونٹوں کا کپکپانا، اِن لفظوں کے ساتھ التجا کرنا ''آپ مجھے سکون سے کیوں نہیں رہنے دیتے!'' کی یاد تھی — بالکل ویسی ہی یاد جس نے مجھے اس وقت بھی مدد کے لیے پکارنے سے باز رکھا تھا جب میں مسٹر زومر کو پانی میں غائب ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

❊❊

Scanned with CamScanner

آئندہ صفحات میں ترکی کے ممتاز ادیب اورحان پامک (Orhan Pamuk) کی ایک کہانی اور ایک مضمون کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ پامک کی کہانی To Look Out the Window ان کے تازہ ترین مجموعے Other Colours: Essays and a Story میں شامل واحد مختصر کہانی ہے۔ یہ مجموعہ 2008 کے اوائل میں شائع ہوا تھا۔ یہ کہانی، جو بڑی حد تک خودسوانحی ہے اور پامک کی اپنے بچپن کے دنوں کے گھریلو ماحول اور اُس زمانے (1950 کے عشرے) کے استنبول کی یادوں پر بنیاد رکھتی ہے، ایک اعتبار سے پامک کی اس تقریر سے منسلک ہے جو انھوں نے 2006 میں نوبیل انعام قبول کرتے وقت کی تھی اور جس کا ترجمہ ''ابا کا سوٹ کیس'' کے عنوان سے آج شمارہ 55 میں شائع کیا گیا تھا۔ ان کا مضمون My Turkish Library کے عنوان سے نیویارک ریویو آف بکس کے 18 دسمبر 2008 کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس مضمون کو بھی اسی تسلسل میں پڑھا جا سکتا ہے۔

Scanned with CamScanner

اورحان پامک

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

کھڑکی سے باہر دیکھنا

1

جب دیکھنے کو کچھ نہ ہو اور نہ سننے کو کہانیاں ہوں تو زندگی بڑی اکتا دینے والی ہو جاتی ہے۔
جب میں بچہ تھا تو بوریت ایک ایسی چیز ہوتی تھی جس کا مقابلہ ہم یا تو ریڈیو سن کر کرتے تھے یا کھڑکی سے باہر پڑوس کے فلیٹوں میں جھانک کر یا نیچے گلی میں گزرتے لوگوں کو دیکھ کر۔ ان دنوں، 1958 میں، ٹیلی وژن ترکی میں ابھی نہیں آیا تھا۔ لیکن ہم اس کا اعتراف کرنا پسند نہیں کرتے تھے: ہم ٹیلی وژن کا ذکر امید پرستی کے انداز میں کرتے، جیسا کہ ہم ہالی وڈ کی ان ایڈونچر فلموں کا ذکر کرتے تھے جو استنبول پہنچتے پہنچتے چار پانچ سال لگا دیتی تھیں، یہ کہہ کر کہ ''یہ ابھی آنے والا ہے۔''

کھڑکی سے باہر دیکھنا وقت گزاری کا اتنا اہم مشغلہ تھا کہ جب ترکی میں ٹیلی وژن آخر کار آ گیا تو لوگ اس کے سامنے اسی طرح برتاؤ کرتے جیسے اپنی کھڑکیوں کے سامنے کیا کرتے تھے۔ جب میرے ابا، چچا اور دادی ٹیلی وژن دیکھتیں تو وہ سب ایک دوسرے کی طرف دیکھے بغیر اسی طرح بحث میں مشغول رہتے، اور بیچ بیچ میں رک کر ایک دوسرے کو بتاتے کہ ابھی ابھی انھوں نے کیا دیکھا، جیسے وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کیا کرتے تھے۔

''اگر برف اسی طرح پڑتی رہی تو جم جائے گی،'' پھپھی ہوا سے اڑتے برف کے گالوں کو دیکھتے ہوئے کہتیں۔

Scanned with CamScanner

''وہ حلوہ بیچنے والا نشانتاشی والے نکڑ پر واپس آ گیا ہے!'' دوسری کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے، جو ٹرام کی لائنوں والی بڑی سڑک پر کھلتی تھی، میں کہتا۔

اتوار کو ہم اور سارے چچا اور پھپھیاں اور سب لوگ جو نیچے کی منزلوں کے فلیٹوں میں رہتے تھے، دادی کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھانے اوپر جمع ہو جاتے۔ جب میں کھانا آنے کے انتظار میں کھڑکی میں کھڑا ہوتا تو اپنی امی، ابا، پھپھیوں اور چچاؤں کے ساتھ وہاں ہونے پر اس قدر خوش ہوتا کہ میرے سامنے ہر چیز کانچ کے اس فانوس سے نکلتی زردی مائل روشنی سے جگمگاتی ہوئی لگتی جو کھانے کی لمبی میز کے اوپر لٹکا ہوا تھا۔ دادی کی بیٹھک میں ویسا ہی اندھیرا رہتا جیسا نیچے کی منزلوں کی بیٹھکوں میں رہتا تھا، لیکن مجھے دادی کی بیٹھک ہمیشہ زیادہ اندھیری محسوس ہوتی تھی۔ شاید اس کی وجہ ٹول کے پردے اور بھاری غلاف تھے جو بالکنی کے کبھی نہ کھلنے والے دروازوں پر پڑے، ڈراؤنے سائے ڈالا کرتے تھے۔ یا شاید یہ سیپیاں جڑی اسکرینوں، بڑی بڑی میزوں، الماریوں اور بے بی گرانڈ پیانو کی وجہ سے ہوگا جس کے اوپر وہ سارے فریم کیے ہوئے فوٹوگراف رکھے رہتے تھے، یا اس بے ہوا کمرے کی عمومی گھٹن کی وجہ سے جہاں سے ہمیشہ گرد کی بو اٹھا کرتی تھی۔

کھانا پورا ہو چکا تھا اور چچا برابر کے ایک تاریک کمرے میں بیٹھے تمباکو پی رہے تھے۔

''میرے پاس فٹ بال میچ کا ایک ٹکٹ ہے، لیکن میں نہیں جا رہا،'' انھوں نے اعلان کیا۔ ''تمھارے ابا تمھیں لے جائیں گے۔''

''ابا، ہمیں فٹ بال میچ دکھانے لے چلیں!'' میرے بڑے بھائی نے دوسرے کمرے سے اونچی آواز میں کہا۔

''بچوں کو کھلی ہوا کی ضرورت ہے،'' امی بیٹھک میں سے بولیں۔

''پھر تم انھیں کیوں نہیں باہر لے جاتیں؟'' ابا نے امی سے کہا۔

''میں اپنی اماں کے ہاں جا رہی ہوں،'' امی نے جواب دیا۔

''ہمیں نانی کے گھر نہیں جانا!'' بھائی بولا۔

''گاڑی لے جاؤ،'' چچا نے کہا۔

''چلیے نا، ابا!'' بھائی نے کہا۔

Scanned with CamScanner

پھر ایک لمبی اور عجیب سی خاموشی چھا گئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے کمرے میں موجود ہر شخص امی کے بارے میں کچھ خیالات پر غور کر رہا ہو، اور جیسے ابا کو معلوم ہو کہ وہ خیالات کیا ہیں۔

''تو تمھاری گاڑی لے جاؤں، ہے نا؟'' انھوں نے چچا سے پوچھا۔

بعد میں، جب ہم سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچ چکے تھے اور امی سویٹر اور چار خانوں والے موٹے اونی موزے پہننے میں ہماری مدد کر رہی تھیں، ابا راہداری میں سگریٹ پیتے ہوئے اِدھر سے اُدھر چکر کاٹ رہے تھے۔ چچا نے اپنی ''نفیس، کریم کلر'' ڈاج 1952 تشویقیہ مسجد کے سامنے کھڑی کر رکھی تھی۔ ابا نے ہم دونوں بھائیوں کو آگے کی سیٹ پر بیٹھنے کی اجازت دی اور چابی کو ایک ہی بار گھما کر گاڑی اسٹارٹ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

اسٹیڈیم پر قطار لگانے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ ''یہ ایک ٹکٹ ان دونوں کے لیے،'' ابا نے گھومنے والے دروازے کے باہر بیٹھے شخص سے کہا۔ ''ایک آٹھ سال کا ہے، دوسرا دس سال کا۔'' اندر جاتے ہوئے ہم اس شخص کی آنکھوں میں دیکھنے سے گھبرا رہے تھے۔ اسٹینڈ میں بہت سی خالی سیٹیں تھیں اور ہم فوراً بیٹھ گئے۔

دونوں ٹیمیں خاکی میدان میں اتر چکی تھیں اور مجھے ان کھلاڑیوں کو اپنی چمکدار سفید نیکریں پہنے خود کو تازہ دم کرنے کی غرض سے اِدھر اُدھر بھاگتے دیکھنے میں مزہ آنے لگا۔ ''وہ دیکھو، چھوٹا مہمت،'' بھائی ان میں سے ایک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''جونیئر ٹیم سے ابھی نکل کر آیا ہے۔''

''پتا ہے۔''

میچ شروع ہوا اور بہت دیر تک ہم کچھ نہ بولے۔ کچھ دیر بعد میرے خیالات میچ سے بھٹک کر دوسری چیزوں کی طرف جانے لگے۔ سب کھلاڑی ایک ہی پٹی کیوں پہنے ہوئے ہیں جبکہ ان کے نام الگ الگ ہیں؟ میں تصور کرنے لگا کہ میدان میں اب کھلاڑی نہیں، صرف نام دوڑ رہے ہیں۔ ان کی نیکریں میلی ہوتی جا رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد میں نے زمین پر بیٹھے تماشائیوں کے ٹھیک پیچھے ایک جہاز کو، اپنی دلچسپ لمبی چمنی کے ساتھ، باسفورس سے دھیمی رفتار میں گزرتے دیکھا۔ ہاف ٹائم ہونے تک کسی ٹیم نے کوئی گول نہیں کیا تھا، اور ابا نے ہم دونوں کو مونگ پھلی کا ایک ایک لفافہ اور ایک ایک پنیری روٹی خرید کر دی۔

Scanned with CamScanner

''ابا، مجھ سے ختم نہیں ہو رہا،'' میں نے باقی بچا ہوا اپنے ہاتھ میں دکھاتے ہوئے کہا۔
''تو جاؤ اسے وہاں رکھ دو،'' وہ بولے۔ ''تمھیں کوئی نہیں دیکھے گا۔''
ہم اٹھے اور ٹانگیں سیدھی کرنے کے لیے ٹہلنے لگے، جیسا کہ اور سب لوگ کر رہے تھے۔ ابا کی طرح ہم نے اپنے ہاتھ اپنی اونی پتلونوں کی جیبوں میں دے رکھے تھے، اور میدان کی سمت سے مڑ مڑ کر اپنے پیچھے بیٹھے لوگوں کو دیکھ رہے تھے، کہ ہجوم میں سے کسی نے ابا کو آواز دی۔ ابا اپنا ہاتھ کان کے پاس لے گئے، یہ اشارہ کرنے کے لیے کہ اتنے شور میں انھیں کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی۔
''میں نہیں آ سکتا،'' انھوں نے ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''بچے ساتھ ہیں۔''
ہجوم میں بیٹھا آدمی جامنی رنگ کا اسکارف پہنے تھا۔ وہ کرسیوں کی پشتوں کو دھکیلتا اور کئی لوگوں کو اپنے سامنے سے ہٹا کر راستہ بناتا ہوا ہماری قطار تک آ پہنچا۔
''تمھارے لڑکے ہیں؟'' ابا سے بغلگیر ہونے کے بعد اس نے پوچھا۔ ''اتنے بڑے ہو گئے۔ یقین نہیں آتا۔''
ابا کچھ نہ بولے۔
''تو یہ بچے کب نمودار ہو گئے؟'' اس آدمی نے تعریفی نظروں سے ہمیں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم نے اسکول سے فارغ ہوتے ہی شادی کر لی تھی؟''
''ہاں،'' ابا نے کہا، وہ اس کے چہرے کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے۔ دونوں کچھ دیر اور باتیں کرتے رہے۔ جامنی اسکارف والے آدمی نے بھائی کی اور میری طرف مڑ کر دونوں کے ہاتھوں میں ایک ایک ان چھلی امریکی مونگ پھلی تھما دی۔ اس کے جانے کے بعد ابا اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے اور بہت دیر تک کچھ نہ بولے۔
دونوں ٹیموں کے نئی نیکریں پہن کر میدان میں واپس آ جانے کے کچھ دیر بعد ابا نے کہا، ''چلو گھر چلیں۔ تمھیں سردی لگ رہی ہے۔''
''مجھے تو نہیں لگ رہی،'' بھائی بولا۔
''لگ رہی ہے،'' ابا نے کہا۔ ''اور علی کو بھی لگ رہی ہے۔ چلو، اب چلیں۔''
جب ہم اپنی قطار میں بیٹھے دوسرے لوگوں کے گھٹنوں سے ٹکراتے اور کبھی کبھی ان کے پیروں

پر چڑھتے ہوئے ان کے آگے سے گزر رہے تھے، میرا پیر پنیری روٹی کے اس ٹکڑے پر پڑا جسے میں نے زمین پر ڈال دیا تھا۔ سیڑھیوں سے اترتے ہوئے ہمیں ریفری کے سیٹی بجانے کی آواز سنائی دی جو دوسرے ہاف کے شروع ہونے کا اعلان تھا۔

''تمھیں سردی لگ رہی تھی کیا؟'' بھائی نے پوچھا۔ ''تم نے کہا کیوں نہیں کہ نہیں لگ رہی؟''

میں چپ رہا۔ ''بےوقوف،'' بھائی بولا۔

''دوسرے ہاف کا کھیل گھر جا کر ریڈیو پر سن لینا،'' ابا بولے۔

''یہ میچ ریڈیو پر نہیں آ رہا،'' بھائی نے کہا۔

''اچھا اب چپ،'' ابا نے کہا۔ ''واپسی پر تقسیم چوک کی طرف سے چلیں گے۔''

ہم چپ رہے۔ چوک سے گزرتے ہوئے ابا نے گلی میں ذرا اندر واقع جوئے کی دکان سے کچھ پہلے گاڑی روک لی، بالکل جیسا ہمارا اندازہ تھا۔ ''کوئی آئے تو دروازہ مت کھولنا،'' ابا نے کہا۔ ''میں ایک منٹ میں واپس آتا ہوں۔''

وہ گاڑی سے اتر گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ باہر سے گاڑی کا تالا بند کرتے، ہم دونوں نے بٹن دبا کر اندر سے بند کر لیا۔ لیکن ابا جوئے کی دکان میں نہیں گئے؛ وہ لپکتے ہوئے اینٹوں سے بنی سڑک پار کر کے دوسری طرف پہنچ گئے۔ وہاں ایک دکان تھی جس کے باہر جہازوں، پلاسٹک کے بڑے بڑے ہوائی جہازوں اور دھوپ میں چمکتے سرسبز نظاروں کے پوسٹر لگے تھے، اور وہ دکان اتوار کو بھی کھلی رہتی تھی، وہ اسی دکان میں داخل ہو گئے۔

''ابا کہاں گئے ہیں؟''

''گھر جا کے سب سے اوپر سب سے نیچے والا کھیل کھیلیں؟'' بھائی نے پوچھا۔

جب ابا لوٹے تو بھائی ایکسلریٹر سے کھیل رہا تھا۔ ہم واپس نشانتاشی پہنچے اور ابا نے گاڑی وہیں مسجد کے سامنے کھڑی کر دی۔

''میں تمھیں کچھ دلوا نہ دوں؟'' ابا بولے۔ ''مگر اب وہ نامور شخصیات والی سیریز مت مانگنا!''

''اوہ، پلیز، ابا!'' ہم ضد کرنے لگے۔

جب ہم علاء الدین کی دکان پر پہنچے، ابا نے ہمیں نامور شخصیات سیریز کی چوئنگ گم کے دس

Scanned with CamScanner

دس پیکٹ خرید کر دیے۔ پھر ہم اپنے گھر کی عمارت میں داخل ہوے۔ لفٹ میں سوار ہوتے ہوتے میں اتنے جوش میں آ چکا تھا کہ مجھے لگا میری پتلون گیلی ہو جائے گی۔ اندر کی ہوا گرم تھی اور امی ابھی تک نہیں لوٹی تھیں۔ ہم نے کاغذ پھاڑ کر چیونگ گم کھول لی اور ریپر فرش پر پھینک دیے۔

میرے حصے میں دو فیلڈ مارشل فوزی چقماق، ایک ایک چارلی چیپلن، حامت کپلان پہلوان، گاندھی، موزارٹ اور ڈیگال، دو اتاترک اور ایک گریٹا گاربو — نمبر 21 — آئی تھی، جو بھائی کو اب تک نہیں ملی تھی۔ ان کو ملا کر اب میرے پاس نامور شخصیات کی 173 تصویریں ہو گئی تھیں، لیکن سیریز پوری کرنے کے لیے مجھے ابھی 27 تصویریں اور چاہیے تھیں۔ بھائی کو چار فیلڈ مارشل فوزی چقماق، پانچ اتاترک اور ایک ایڈیسن ہاتھ آئے۔ ہم نے چیونگ گمیں اپنے منھ میں ڈال لیں اور کارڈوں کے پیچھے چھپی ہوئی عبارتیں پڑھنے لگے۔

فیلڈ مارشل فوزی چقماق

جنگ آزادی کے سپہ سالار

(1876 - 1950)

ممبو سویٹ چیونگ گم کمپنی لمیٹڈ

تمام کی تمام 100 نامور شخصیات کی تصویریں جمع کرنے والے کو

چمڑے کی ایک فٹ بال انعام میں دی جائے گی۔

بھائی نے اپنی 165 تصویروں کی گڈی ہاتھ میں لے رکھی تھی۔ ''سب سے اوپر سب سے نیچے کا کھیل کھیلیں؟''

''نہیں۔''

''مجھے اپنی گریٹا گاربو دے دو اور میرے بارہ فوزی چقماق لے لو،'' بھائی بولا۔ ''اس طرح تمھارے پاس 184 کارڈ ہو جائیں گے۔''

Scanned with CamScanner

''نہیں۔''

''مگر تمھارے پاس دو گریٹا گاربو ہیں۔''

میں نے جواب نہ دیا۔

''جب کل اسکول میں ٹیکے لگیں گے تو بہت درد ہوگا،'' اس نے کہا۔ ''مجھ سے کسی مدد کی امید مت رکھنا، ٹھیک ہے؟''

''مجھے ویسے بھی کوئی امید نہیں رکھنی تھی۔''

شام کا کھانا ہم نے خاموشی سے کھایا۔ جب ریڈیو پر ''کھیلوں کی دنیا'' پروگرام شروع ہوا تو ہمیں پتا چلا کہ میچ دو دو گول سے برابر رہا تھا، اور پھر امی ہمیں سلانے کے لیے کمرے میں آ گئیں۔ بھائی اپنا اسکول کا بیگ تیار کرنے لگا اور میں دوڑ کر بیٹھک میں جا پہنچا۔ ابا کھڑکی کے پاس کھڑے باہر گلی میں دیکھ رہے تھے۔

''ابا، مجھے کل اسکول نہیں جانا ہے۔''

''ارے، یہ کیا کہہ رہے ہو!''

''کل ہمیں وہ ٹیکے لگائے جائیں گے۔ مجھے بخار چڑھ جاتا ہے اور سانس رکنے لگتی ہے۔ امی سے پوچھ لیجیے۔''

وہ میری طرف دیکھتے رہے اور کچھ نہ بولے۔ میں دوڑ کر دراز تک پہنچا اور قلم اور کاغذ نکال لایا۔

''تمھاری امی کو معلوم ہے؟'' انھوں نے کاغذ کو کیر کیگارد کی اس کتاب پر رکھتے ہوئے پوچھا جسے وہ ہمیشہ پڑھتے رہتے تھے اور کبھی ختم نہ کر پاتے تھے۔ ''تم اسکول جا رہے ہو لیکن ٹیکہ نہیں لگواؤ گے،'' انھوں نے کہا۔ ''میں یہی لکھوں گا۔''

انھوں نے اپنے دستخط کیے۔ میں نے روشنائی پر پھونک ماری اور کاغذ کو تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ دوڑتے ہوئے بیڈ روم میں واپس جا کر میں نے اسے اپنے بستے میں رکھ لیا۔ پھر میں اپنے بستر پر چڑھ کر اچھلنے لگا۔

''بس کرو،'' امی بولیں۔ ''چلو اب سونے کا وقت ہو گیا۔''

Scanned with CamScanner

2

میں اسکول میں تھا اور دوپہر کے کھانے کے فوراً بعد کا وقت تھا۔ پوری کلاس کو دو دو کی قطاروں میں کھڑا کر دیا گیا تھا اور ہم سب باری باری ٹیکہ لگوانے اسی بدبودار کیفے ٹیریا میں واپس جا رہے تھے۔ کچھ بچے رو رہے تھے؛ باقی گھبرائے ہوئے انتظار کر رہے تھے۔ جب آیوڈین کا ایک بھبکا سیڑھیوں پر چڑھتا ہوا آیا تو میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میں قطار سے نکل کر استانی کے پاس پہنچا جو زینے کے سرے پر کھڑی تھیں۔ پوری کلاس ہمارے برابر سے شور مچاتی ہوئی گزرتی رہی۔

میں نے اپنی جیب سے وہ کاغذ نکالا جس پر ابا کے دستخط تھے اور استانی کو تھما دیا۔ وہ تیوری چڑھا کر اسے پڑھنے لگیں۔ ''تمھارے ابا ڈاکٹر نہیں ہیں، سمجھے،'' وہ بولیں۔ پھر رک کر کچھ سوچنے لگیں۔ ''اوپر جاؤ۔ کمرہ نمبر 2-A میں جا کر انتظار کرو۔''

اس کمرے میں چھ یا سات اور بچے تھے جو میری طرح ٹیکے سے بچ نکلے تھے۔ ان میں سے ایک دہشت زدہ ہو کر کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ گھبراہٹ کی چیخیں راہداری میں تیرتی سنائی دے رہی تھیں؛ ایک موٹا لڑکا کدو کے بیج چباتے ہوئے کینوا کا مِک پڑھ رہا تھا۔ دروازہ کھلا اور ڈپٹی ہیڈ ماسٹر سیفی بے اندر داخل ہوئے۔

''غالباً تم میں سے کچھ بچے سچ مچ بیمار ہیں، اور اگر تم بیمار ہو تو تمھیں نیچے نہیں لے جایا جائے گا،'' وہ بولے۔ ''لیکن جن بچوں نے ٹیکے سے بچنے کے لیے جھوٹ بولا ہے ان کو میں ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔ ایک دن تم کو بڑا ہونا ہے، اپنے ملک کی خدمت کرنی ہے، اور شاید اس کے لیے جان بھی قربان کرنی ہے۔ آج تم محض ایک معمولی سے ٹیکے سے بچ کر بھاگ رہے ہو — لیکن اگر تم نے بڑے ہونے کے بعد اس قسم کی حرکت کرنے کی کوشش کی تو تم غداری کے قصوروار ٹھہرو گے۔ شرم آنی چاہیے تمھیں!''

بہت دیر تک خاموشی رہی۔ میں نے اتاترک کی تصویر کی طرف دیکھا، اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

بعد میں ہم آنکھ بچا کر کھسکے اور اپنے کلاس روم میں لوٹ آئے۔ دوسرے بچے ٹیکے لگوا کر

Scanned with CamScanner

واپس آنے لگے: کچھ کی قمیصوں کی آستینیں چڑھی ہوئی تھیں، کچھ کی آنکھوں میں آنسو تھے، کچھ منھ بسورتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

''جو بچے قریب رہتے ہیں وہ گھر جا سکتے ہیں،'' ٹیچر نے کہا۔ ''جن بچوں کو گھر لے جانے والا کوئی نہیں ان کو آخری گھنٹی تک انتظار کرنا ہوگا۔ ایک دوسرے کے بازو پر گھونسے مت مارنا! کل اسکول کی چھٹی ہے۔''

سب بچے چلّانے لگے۔ عمارت سے باہر نکلتے ہوئے بعض بچوں نے اپنے بازوؤں کو ہاتھ سے پکڑ رکھا تھا۔ بعض بچے رک کر اسکول کے چوکیدار حلمی آفندی کو اپنے بازوؤں پر آیوڈین کے نشان دکھانے لگے۔

باہر نکل کر سڑک پر آیا تو میں نے اپنے بستے کو لہرا کر کندھے کے پیچھے ڈال لیا اور دوڑنے لگا۔ قرابت کی گوشت کی دکان کے سامنے سڑک پر ایک گھوڑا گاڑی نے ٹریفک کو روک رکھا تھا، چنانچہ میں گاڑیوں کے بیچ کی خالی جگہوں میں لہراتا ہوا دوڑتا رہا اور دوسری سڑک پر اپنے گھر کی عمارت کے پاس پہنچ گیا۔ دوڑتے ہوئے میں حیری کی کپڑے کی دکان اور صالح کی پھولوں کی دکان کے سامنے سے گزرا۔ ہماری عمارت کے چوکیدار حازم آفندی نے میرے لیے دروازہ کھولا۔

''تم اس وقت یہاں اکیلے کیا کر رہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''آج اسکول میں ٹیکے لگے تھے۔ جلدی چھٹی ہوگئی۔''

''تمھارا بھائی کہاں ہے؟ تم اکیلے آ گئے؟''

''میں نے ٹرام کی پٹریاں اکیلے پار کرلیں۔ کل ہماری چھٹی ہے۔''

''تمھاری امی باہر گئی ہیں،'' وہ بولا۔ ''اوپر اپنی دادی کے ہاں چلے جاؤ۔''

''میری طبیعت خراب ہے،'' میں نے کہا۔ ''میں اپنے گھر جاؤں گا۔ دروازہ کھول دو۔''

اس نے دیوار پر ٹنگی چابی اتاری اور ہم لفٹ میں داخل ہو گئے۔ جب تک ہماری منزل آئی پوری لفٹ میں اس کے سگریٹ کا دھواں بھر چکا تھا اور میری آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ اس نے ہمارے گھر کا دروازہ کھولا۔ ''بجلی کے ساکٹوں سے مت کھیلنا،'' اس نے دروازہ کھینچ کر بند کرتے ہوئے کہا۔

گھر میں کوئی نہیں تھا، پھر بھی میں چلا کر بولا، ''کوئی ہے؟ گھر پر کوئی ہے؟ کوئی نہیں ہے؟''

Scanned with CamScanner

میں نے اپنا بستہ اتار پھینکا، اپنے بھائی کی دراز کھولی، اور اس کا فلمی ٹکٹوں کا ذخیرہ دیکھنے لگا جو اس نے مجھے کبھی نہیں دکھایا تھا۔ اس کے بعد میں نے فٹ بال میچوں کی ان تصویروں کو جی بھر کر دیکھا جو اس نے اخباروں سے کاٹ کاٹ کر ایک کاپی میں چپکائی تھیں۔ قدموں کی آہٹ سے مجھے پتا چل گیا کہ اس وقت داخل ہونے والی ہستی امی نہیں ہیں۔ یہ ابا تھے۔ میں نے بھائی کے ٹکٹ اور تصویروں والی کاپی واپس اپنی جگہ، بڑی احتیاط سے رکھ دی تاکہ اسے پتا نہ چلے کہ میں نے اس کی چیزوں کو چھیڑا ہے۔

ابا اپنے بیڈروم میں تھے؛ وہ اپنی کپڑوں کی الماری کھولے اس کے اندر دیکھ رہے تھے۔

''کیوں، تم ابھی سے گھر آ گئے؟''

''نہیں، میں پیرس میں ہوں،'' میں نے جواب دیا، جیسا کہ ہم اسکول میں کہا کرتے تھے۔

''تم آج اسکول نہیں گئے؟''

''آج ٹیکے لگے تھے۔''

''بھائی کہاں ہے؟ وہ نہیں آیا؟'' انھوں نے پوچھا۔ ''اچھا ٹھیک ہے، اب اپنے کمرے میں جاؤ اور مجھے پوری طرح خاموش رہ کر دکھاؤ۔''

میں نے وہی کیا جو انھوں نے کہا تھا۔ میں اپنی پیشانی کھڑکی کے شیشے سے ٹکا کر باہر دیکھنے لگا۔ بڑے کمرے سے جو آوازیں آ رہی تھیں ان کو سن کر میں بتا سکتا تھا کہ ابا نے وہاں کی الماری میں رکھے ہوئے سوٹ کیسوں میں سے ایک باہر نکالا ہے۔ پھر وہ اپنے کمرے میں واپس گئے اور اپنے کوٹ اور پتلونیں کپڑوں کی الماری سے نکالنے لگے؛ مجھے ہینگروں کے آپس میں ٹکرانے کی آوازوں سے پتا چل گیا۔ پھر وہ ان درازوں کو کھولنے بند کرنے لگے جن میں ان کی قمیصیں، زیرجامے اور جرابیں رکھی رہا کرتی تھیں۔ میں ان کو یہ سب چیزیں سوٹ کیس میں رکھتے ہوئے سنتا رہا۔ اس کے بعد وہ غسل خانے میں گئے اور وہاں سے واپس نکلے۔ انھوں نے سوٹ کیس کے کھٹکے بند کیے اور تالا لگایا۔ پھر وہ میرے پاس کمرے میں آئے۔

''تو پھر، تم یہاں کیا کرتے رہے؟''

''کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔''

Scanned with CamScanner

''اِدھر آؤ۔ چلو دونوں مل کر کھڑکی سے باہر دیکھتے ہیں۔''

انھوں نے مجھے گود میں اٹھا لیا اور ہم بہت دیر تک ایک ساتھ کھڑکی سے باہر دیکھتے رہے۔ ہماری اور سڑک کے اُس پار فلیٹوں کی ایک عمارت کے درمیان کھڑے صنوبر کے پیڑوں کی پھننگیں ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ ابا میں سے جو خوشبو نکل رہی تھی وہ مجھے اچھی لگی۔

''میں بہت دور جا رہا ہوں،'' وہ بولے۔ انھوں نے مجھے پیار کیا۔ ''اپنی امی سے مت کہنا۔ میں انھیں بعد میں خود بتا دوں گا۔''

''آپ ہوائی جہاز میں بیٹھ کر جائیں گے؟''

''ہاں،'' انھوں نے کہا۔ ''پیرس۔ یہ بھی کسی سے مت کہنا۔'' انھوں نے اپنی جیب سے ڈھائی لیرے کا بڑا سا سکہ نکال کر مجھے دیا اور پھر پیار کیا۔ ''اور یہ بھی مت کہنا کہ تم نے مجھے یہاں دیکھا تھا۔''

میں نے پیسے سیدھے جیب میں رکھ لیے۔ جب ابا نے مجھے گود سے اتار کر سوٹ کیس اٹھا لیا تو میں نے کہا، ''مت جایئے، ابا!'' انھوں نے ایک بار پھر مجھے پیار کیا، اور پھر وہ چلے گئے۔

میں انھیں کھڑکی میں سے دیکھتا رہا۔ وہ سیدھے چلتے ہوے علاءالدین کی دکان کے پاس پہنچے، اور وہاں سے گزرتی ایک ٹیکسی کو اشارہ کر کے روکا۔ سوار ہونے سے پہلے انھوں نے نظر اٹھا کر ہمارے فلیٹ کی طرف ایک بار پھر دیکھا اور ہاتھ لہرایا۔ میں نے بھی جواب میں ہاتھ لہرایا اور وہ روانہ ہو گئے۔

میں خالی سڑک کو بہت، بہت دیر تک دیکھتا رہا۔ ایک ٹرام گزری، پھر پانی بیچنے والے کی گھوڑا گاڑی۔ میں نے گھنٹی بجا کر حازم آفندی کو بلایا۔

''کیا گھنٹی تم نے بجائی تھی؟'' دروازے پر پہنچ کر اس نے پوچھا۔ ''گھنٹی سے مت کھیلا کرو۔''

''یہ ڈھائی لیرے کا سکہ لو، علاءالدین کی دکان پر جاؤ اور مجھے 'نامور شخصیات' والی دس چیونگ گمیں لا دو۔ باقی پچاس قروش کا سکہ واپس لانا مت بھولنا۔''

''یہ پیسے کیا تمھارے ابا نے تمھیں دیے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔ ''دیکھو، کہیں تمھاری امی خفا نہ ہوں۔''

میں نے کچھ نہ کہا اور وہ چلا گیا۔ میں کھڑکی میں کھڑا اسے علاءالدین کی دکان میں جاتے

Scanned with CamScanner

دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ باہر آیا۔ واپس آتے ہوئے اس کی مڈبھیڑ سامنے سے آتے مرمرہ اپارٹمنٹس کے چوکیدار سے ہوئی، اور دونوں رک کر باتیں کرنے لگے۔

واپس آ کر اس نے باقی بچے ہوئے پیسے مجھے دیے۔ میں نے چوننگ گمیں فوراً کھول لیں: تین اور فوزی چقماق، ایک اتاترک، اور ایک ایک لیونارڈو دا ونچی، سلیمان عالیشان، چرچل، جنرل فرانکو، اور ایک اور نمبر 21، یعنی گریٹا گاربو جو میرے بھائی کے پاس اب تک نہ تھی۔ تو اب میرے پاس کل ملا کر 183 تصویریں ہو گئیں۔ لیکن سو تصویروں کا پورا سیٹ مکمل کرنے کے لیے مجھے اب بھی چھبیس تصویریں اور درکار تھیں۔

میں اپنی پہلی 91 نمبر تصویر کو پرتحسین نظروں سے دیکھ رہا تھا، جس میں وہ جہاز دکھایا گیا تھا جس میں بیٹھ کر لنڈبرگ نے بحیرۂ اوقیانوس عبور کیا تھا، کہ دروازے کے سوراخ میں چابی کے گھومنے کی آواز سنائی دی۔ امی! میں نے جلدی جلدی چوننگ گم کے ریپر جمع کیے، جنھیں میں نے فرش پر بکھیر رکھا تھا، اور انھیں سمیت کر کوڑے دان میں ڈال دیا۔

''آج اسکول میں ٹیکے لگے تھے، اس لیے جلدی چھٹی ہو گئی،'' میں نے کہا۔ ''ٹائیفائیڈ، ٹائیفس ٹیٹنس۔''

''بھائی کہاں ہے؟''

''اس کی کلاس کے بچوں کو ابھی ٹیکے نہیں لگے تھے،'' میں نے کہا۔ ''ہماری چھٹی ہو گئی۔ میں نے بڑی سڑک اکیلے پار کی۔''

''کیا بازو دکھ رہا ہے؟''

میں کچھ نہ بولا۔ کچھ دیر بعد بھائی بھی آ گیا۔ اس کا بازو دکھ رہا تھا۔ وہ اپنے دوسرے بازو کی کروٹ لے کر بستر پر لیٹ گیا اور بہت تکلیف میں دکھائی دیتا رہا، یہاں تک کہ اسے نیند آ گئی۔ جب تک اس کی آنکھ کھلی، باہر خاصا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ''امی، بہت درد ہو رہا ہے،'' اس نے کہا۔

''بعد میں شاید تمھیں بخار بھی ہو،'' امی دوسرے کمرے سے، استری کرتے ہوئے، بولیں۔ ''علی، کیا تمھارا بازو بھی دکھ رہا ہے؟ لیٹ جاؤ، ہلو جلو مت۔''

ہم بستر پر جا کر ساکت لیٹ گئے۔ تھوڑی دیر سونے کے بعد بھائی اٹھ بیٹھا اور کھیلوں کا صفحہ

پڑھنے لگا، پھر مجھ سے کہنے لگا کہ کل میری وجہ سے ہم دونوں کو پورا میچ دیکھے بغیر واپس آنا پڑا، اور چونکہ ہم جلدی چلے آئے اس لیے ہماری ٹیم کے چار گول ضائع ہو گئے۔

''اگر ہم نہ بھی چلے آتے تو کیا پتا وہ گول نہ ہوتے؛'' میں نے کہا۔

''کیا؟''

کچھ دیر اور اونگھنے کے بعد بھائی نے مجھے ایک گریٹا گاربو کے بدلے چھ فوزی چقماق، چار اتاترک، اور تین اور ایسے کارڈ دینے کی پیشکش کی جو میرے پاس پہلے ہی سے تھے، مگر میں نے اس کی پیشکش رد کر دی۔

''سب سے اوپر سب سے نیچے والا کھیل کھیلیں؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''ٹھیک ہے، کھیلتے ہیں۔''

اس میں ہوتا یہ تھا کہ پوری گڈی کو اپنی دونوں ہتھیلیوں کے بیچ میں رکھ لو، اور پوچھو: ''سب سے اوپر یا سب سے نیچے؟'' اگر وہ کہے ''سب سے نیچے''، تو سب سے نیچے والی تصویر کو دیکھو، مثلاً 68 نمبر کی تصویر، ریٹا ہیورتھ کی۔ اب فرض کرو سب سے اوپر والی تصویر نمبر 18 ہے، یعنی شاعر دانتے کی۔ اگر ایسا ہے تو سب سے نیچے والی تصویر جیت گئی، اور تم اسے وہ تصویر دو گے جو تمھیں سب سے کم پسند ہو، وہ تصویر جو تمھارے پاس بڑی تعداد میں موجود ہو۔ فیلڈ مارشل فوزی چقماق کی تصویریں یوں ہم دونوں کے درمیان آتی جاتی رہیں، یہاں تک کہ شام ہو گئی اور کھانے کا وقت ہو گیا۔

''تم میں سے کوئی ایک اوپر جا کر دیکھے،'' امی بولیں، ''شاید تمھارے ابا واپس آ گئے ہوں۔''

ہم دونوں اوپر گئے۔ وہاں چچا دادی کے پاس بیٹھے تمباکو پی رہے تھے؛ ابا وہاں نہیں تھے۔ ہم ریڈیو پر خبریں سننے لگے، اخبار میں کھیلوں کا صفحہ دیکھنے لگے۔ جب دادی کھانا کھانے بیٹھیں تو ہم نیچے آ گئے۔

''کہاں رہ گئے تھے؟'' امی بولیں۔ ''اوپر کچھ کھایا تو نہیں ہو گا، کیوں؟ چلو، اب میں تمھیں تمھارا سوپ دے دوں۔ اسے آہستہ آہستہ کھانا، جب تک تمھارے ابا واپس آ جائیں۔''

''سکی ہوئی ڈبل روٹی نہیں ہے کیا؟'' بھائی نے پوچھا۔

جس وقت ہم خاموشی سے اپنا سوپ کھانے میں مشغول تھے، امی ہمیں دیکھ رہی تھیں۔ جس

Scanned with CamScanner

طرح ان کی گردن مڑی ہوئی تھی اور جس طرح ان کی آنکھیں تیزی سے گھوم کر دوسری طرف دیکھنے لگتی تھیں، اس سے میں سمجھ گیا کہ ان کے کان لفٹ کی آواز پر لگے ہوئے ہیں۔ ہم نے سوپ ختم کرلیا تو وہ بولیں، ''اور چاہیے؟'' انھوں نے سوپ کے بڑے پیالے میں جھانکا۔ ''میں بھی کھا ہی کیوں نہ لوں، اس سے پہلے کہ ٹھنڈا ہو جائے،'' انھوں نے کہا۔ لیکن پھر اس کے بجائے وہ کھڑکی کے پاس چلی گئیں اور نیچے نشانتاشی چوک کو دیکھنے لگیں؛ وہ وہیں کھڑی کچھ دیر دیکھتی رہیں۔ پھر واپس آ کر میز پر بیٹھ گئیں اور اپنا سوپ کھانے لگیں۔ ہم دونوں کل کے میچ کی باتیں کر رہے تھے۔

''چپ ہو جاؤ! دیکھو، یہ لفٹ کی آواز تھی نا؟''

ہم چپ ہو گئے اور غور سے سننے لگے۔ لفٹ کی آواز نہیں تھی۔ خاموشی کو ٹرام کی آواز نے توڑا، جس سے میز، اس پر رکھے گلاس، جگ، یہاں تک کہ اس کے اندر کا پانی بھی ہلنے لگا۔ جس وقت ہم نارنگیاں کھا رہے تھے، تب ہم نے یقیناً لفٹ کی آواز سنی۔ وہ قریب سے قریب تر آتی جا رہی تھی، لیکن ہماری منزل پر رکی نہیں؛ سیدھی دادی اماں والی منزل پر چلی گئی۔ ''اوپر چلی گئی،'' امی بولیں۔

جب ہم نے کھانا ختم کرلیا تو امی نے کہا، ''اپنی رکابیاں باورچی خانے میں لے جاؤ۔ اپنے ابا کی رکابی یہیں چھوڑ دو۔'' ہم نے میز صاف کی۔ ابا کی رکابی بہت دیر تک وہاں اکیلی رکھی رہی۔

امی اُس کھڑکی کے پاس چلی گئیں جہاں سے پولیس اسٹیشن دکھائی دیتا تھا؛ وہ وہاں کھڑی بہت دیر تک دیکھتی رہیں۔ پھر اچانک کسی بات کا ارادہ کرلیا۔ انھوں نے ابا کی رکابی، چمچہ اور کانٹا اٹھایا اور باورچی خانے میں لے گئیں۔ ''میں اوپر تمھاری دادی کے ہاں جا رہی ہوں،'' وہ بولیں۔ ''میرے جانے کے بعد آپس میں لڑنے مت لگنا۔''

بھائی اور میں دوبارہ اپنا سب سے اوپر، سب سے نیچے والا کھیل کھیلنے لگے۔

''سب سے اوپر،'' میں نے کہا، پہلی بار۔

اس نے سب سے اوپر والا کارڈ دکھایا۔ نمبر 34، قوجہ یوسف، مشہورِ عالم پہلوان۔ پھر اس نے گڈی میں سب سے نیچے والا کارڈ نکالا: نمبر 50، اتاترک۔ ''تم ہار گئے، اب مجھے ایک کارڈ دو۔''

ہم بہت دیر تک کھیلتے رہے اور وہ مسلسل جیتتا رہا۔ جلد ہی میرے بیس میں سے اٹھارہ فوزی چقماق اور دو اتاترک اس کے قبضے میں جا چکے تھے۔

Scanned with CamScanner

''میں نہیں کھیل رہا،'' میں نے ناراض ہو کر کہا۔ ''میں اوپر جا رہا ہوں۔ امی کے پاس۔''

''امی خفا ہوں گی۔''

''بزدل کہیں کے! تمھیں گھر پر اکیلے رہنے سے ڈر لگتا ہے۔''

دادی کے گھر کا دروازہ ہمیشہ کی طرح کھلا ہوا تھا۔ کھانا کھایا جا چکا تھا۔ باقر باورچی رکابیاں دھو رہا تھا؛ چچا اور دادی آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ امی کھڑکی میں کھڑی باہر نشانتاشی چوک کو دیکھ رہی تھیں۔

''آ جاؤ،'' وہ باہر دیکھتے دیکھتے ہی بولیں۔ میں سیدھا اس خالی جگہ میں پہنچ گیا جو معلوم ہوتا تھا میرے ہی لیے محفوظ رکھی گئی ہے۔ ان سے لگ کر میں بھی نیچے نشانتاشی چوک کو دیکھنے لگا۔ امی نے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔

''مجھے پتا چلا تمھارے ابا آج جلدی گھر آئے تھے۔ تم ان سے ملے تھے۔''

''جی۔''

''انھوں نے سوٹ کیس اٹھایا اور چلے گئے۔ حازم آفندی نے انھیں جاتے دیکھا تھا۔''

''جی۔''

''جانی، تمھیں انھوں نے بتایا تھا کہاں جا رہے ہیں؟''

''نہیں،'' میں نے کہا۔ ''انھوں نے مجھے ڈھائی لیرے دیے تھے۔''

نیچے سڑک پر ہر چیز — کنارے پر کی اندھیری دکانیں، گاڑیوں کی بتیاں، سڑک کے بیچ کی تنگ سی خالی جگہ جہاں ٹریفک پولیس والا کھڑا ہوتا تھا، فرش کی گیلی اینٹیں، پیڑوں سے لٹکتے اشتہاری بورڈوں پر لکھے لفظ — ہر چیز بے حد تنہا اور اداس تھی۔ پھر بارش ہونے لگی اور امی میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہیں۔

اس وقت مجھے احساس ہوا کہ ریڈیو جو چچا اور دادی کے درمیان رکھا تھا — ریڈیو جو کبھی بند نہ ہوتا تھا — خاموش ہے۔ میرے بدن میں سردی کی ایک لہر دوڑ گئی۔

''اس طرح وہاں مت کھڑی رہو، بیٹی،'' دادی نے امی سے کہا۔

بھائی بھی اوپر آ گیا تھا۔

''تم دونوں باورچی خانے میں چلے جاؤ،'' چچا بولے۔ ''باقر!'' انھوں نے آواز دی۔ ''ان

Scanned with CamScanner

دونوں لڑکوں کو ایک گیند بنا دو، یہ بڑے کمرے میں فٹ بال کھیلیں گے۔''

باورچی خانے میں باقر برتن دھونا ختم کر چکا تھا۔ ''اُدھر بیٹھ جاؤ،'' اس نے کہا۔ وہ شیشے کی دیوار والی بالکنی میں گیا جسے دادی اماں نے گرین ہاؤس بنا رکھا تھا، اور وہاں سے پرانے اخباروں کی کچھ ردی اٹھا لایا اور ان اخباروں کو موڑ توڑ کر ایک گیند بنانے لگا۔ جب وہ ایک مٹھی جتنی ہو گئی تو بولا، ''اتنی ٹھیک ہے؟''

''نہیں، تھوڑے اور اخبار لپیٹو اس پر،'' بھائی نے کہا۔

جب باقر اس پر چند اور اخباری کاغذ لپیٹ رہا تھا، تو میں نے دروازے سے جھانک کر دوسری طرف امی، چچا اور دادی کو دیکھا۔ باقر نے دراز میں سے ستلی نکالی اور اسے کس کر گیند پر ہر طرف باندھ دیا یہاں تک کہ وہ اتنی گول ہو گئی جتنی ہو سکتی تھی۔ اس کے نوکیلے سروں کو ہموار کرنے کے لیے اس نے پہلے اسے ایک گیلی صافی سے آہستہ سے پونچھا اور پھر اسے ہر طرف سے دبایا۔ بھائی اس کو چھو کر دیکھنے سے باز نہ رہ سکا۔

''ارے واہ! یہ تو بالکل پتھر کی طرح سخت ہو گئی۔''

''ذرا اپنی انگلی اس جگہ رکھو۔'' بھائی نے بڑی احتیاط سے اپنی انگلی اس نقطے پر رکھی جہاں ستلی میں آخری گرہ لگائی جانی تھی۔ باقر نے وہ گرہ لگائی اور یوں گیند مکمل ہو گئی۔ اس نے اسے اوپر اچھالا اور پھر اِدھر اُدھر کک لگانے لگا۔

''جاؤ، بڑے کمرے میں جا کر کھیلو،'' باقر نے کہا۔ ''یہاں کھیلو گے تو کوئی نہ کوئی چیز توڑ دو گے۔''

بہت دیر تک ہم نے اپنی تمام توجہ کھیل پر مرکوز رکھی۔ میں فینر باغچے ٹیم کا لیفٹر ہونے کی اداکاری کر رہا تھا، اور بالکل اُسی کی طرح دوڑتے ہوئے بدن کو موڑ اور سکیڑ رہا تھا۔ جب کبھی میں وال پاس کرتا تو گیند بھائی کے دُکھتے ہوئے بازو سے ٹکرا جاتی۔ وہ بھی میرے بازو پر مارتا تھا لیکن مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ ہم دونوں پسینے پسینے ہو رہے تھے۔ گیند بھی پرزہ پرزہ ہونے لگی تھی اور میں تین کے مقابلے میں پانچ سے جیت رہا تھا، کہ اچانک بھائی کے بازو پر بہت زور سے لگی۔ وہ دھڑ سے زمین پر لیٹ گیا اور رونے لگا۔

Scanned with CamScanner

''ایک بار میرا بازو ٹھیک ہو جانے دو، پھر تمھیں مار ڈالوں گا!'' وہ وہیں پڑے پڑے بولا۔

وہ ہار گیا تھا اس لیے غصے میں تھا۔ میں ہال سے نکل کر بیٹھک میں آ گیا؛ دادی، چچا اور امی، سب کے سب اسٹڈی میں چلے گئے تھے۔ دادی فون پر کوئی نمبر ملا رہی تھیں۔

''ہیلو، میری بیٹی،'' پھر انھوں نے کہا، اسی انداز میں جس انداز میں وہ امی کو انھی الفاظ میں پکارتی تھیں۔ ''کیا یہ یشل کوۓ ایرپورٹ ہے؟ سنو، میری بیٹی، ہمیں ایک مسافر کے بارے میں پتا کرنا ہے جو آج یوروپ روانہ ہوا ہے۔'' انھوں نے ابا کا نام لیا اور پھر انتظار کرتے ہوئے فون کے تار کو اپنی انگلی کے گرد لپیٹتی رہیں۔ اس کے بعد چچا سے کہنے لگیں، ''ذرا میرے سگریٹ لا دو۔'' جب چچا کمرے سے نکل گئے تو دادی نے ریسیور اپنے کان سے ہٹا لیا۔

''میری بیٹی، پلیز، بتاؤ،'' دادی نے امی سے کہا، ''تمھیں ضرور معلوم ہو گا۔ کیا کوئی دوسری عورت ہے؟''

امی کا جواب مجھے سنائی نہ دیا۔ دادی انھیں یوں دیکھتی رہیں جیسے انھوں نے جواب میں کچھ بھی نہ کہا ہو۔ پھر فون کے دوسرے سرے پر سے کسی نے کچھ کہا جس پر دادی کو غصہ آ گیا۔ ''وہ ہمیں کچھ نہیں بتانے والے،'' جب چچا سگریٹ اور ایش ٹرے لیے کمرے میں واپس آئے تو دادی نے ان سے کہا۔

امی نے چچا کو میری طرف دیکھتے ہوئے دیکھا اور تب انھیں میرے وہاں ہونے کا احساس ہوا۔ وہ مجھے بازو سے پکڑ کر واپس بڑے کمرے میں لے آئیں۔ جب انھوں نے میری پیٹھ اور گردن پر ہاتھ پھیرا تو انھیں معلوم ہوا کہ میں پسینے میں کس قدر بھیگا ہوا ہوں، لیکن وہ مجھ پر خفا نہیں ہوئیں۔

''امی، میرا بازو بہت دکھ رہا ہے،'' بھائی بولا۔

''تم دونوں اب نیچے چلو۔ میں آ کر تمھیں سلا دیتی ہوں۔''

نیچے، ہماری والی منزل پر آ کر، ہم تینوں بہت دیر تک خاموش رہے۔ بستر پر جانے سے پہلے میں پاجامہ پہنے دوڑتا ہوا باورچی خانے میں گیا، پانی پیا، اور پھر ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔ امی کھڑکی کے پاس کھڑی سگریٹ پی رہی تھیں، اور پہلے تو انھیں میری آہٹ سنائی نہیں دی۔

''ننگے پیر ہو، تمھیں سردی لگ جائے گی،'' وہ بولیں۔ ''بھائی لیٹ گیا؟''

Scanned with CamScanner

''سو گیا۔ امی، میں آپ کو ایک بات بتاؤں۔'' میں نے انتظار کیا کہ امی کھڑکی کے پاس اپنے پہلو میں میرے لیے جگہ بنا لیں۔ جب انھوں نے وہ پیاری جگہ میرے لیے وا کر دی تو میں سرک کر اس میں داخل ہو گیا۔ ''ابا پیرس گئے ہیں،'' میں نے کہا۔ ''اور آپ کو پتا ہے کون سا سوٹ کیس ساتھ لے گئے ہیں؟''

وہ کچھ نہ بولیں۔ رات کی خاموشی میں، ہم بارش سے گیلی سڑک کو بہت دیر تک دیکھتے رہے۔

3

میری نانی کا مکان ٹرام کی پٹری کے سرے پر، ششلی مسجد کے برابر میں تھا۔ اب تو وہ چوک منی بسوں اور میونسپلٹی کے بس اسٹاپوں اور بڑی بڑی بدہیئت عمارتوں اور سائن بورڈوں سے پٹے ہوئے ڈپارٹمنٹ اسٹوروں سے بھرا ہوا ہے، اور ان دفتروں سے جن میں کام کرنے والے لوگ دوپہر کے کھانے کے وقفے میں باہر نکل کر فٹ پاتھوں پر چیونٹیوں کی طرح پھیل جاتے ہیں، لیکن اُن دنوں یہ شہر کے یوروپی حصے کے سرے پر واقع تھا۔ ہمیں اپنے گھر سے نکل کر اینٹوں کے فرش والے اس وسیع چوک تک پہنچنے میں پندرہ منٹ لگتے تھے، اور جب ہم اپنی امی کا ہاتھ تھامے لیموں اور مل بیری کے پیڑوں کے نیچے چل رہے ہوتے تب یوں لگتا جیسے ہم دیہات میں نکل آئے ہوں۔

نانی پتھروں اور کنکریٹ کے بنے ایک چار منزلہ مکان میں رہتی تھیں جو پہلو کے بل کھڑی ماچس جیسا دکھائی دیتا تھا؛ اس کے سامنے کے رخ، مغرب کی سمت استنبول واقع تھا، اور پیچھے پہاڑیوں پر مل بیری کے باغ تھے۔ نانا کے انتقال اور تینوں بیٹیوں کی شادی کے بعد نانی اس مکان کے صرف ایک کمرے میں سمٹ گئی تھیں جو الماریوں، میزوں، سینیوں، پیانو اور دوسرے فرنیچر سے اٹا ہوا تھا۔ میری خالہ ان کے لیے کھانا پکا کر لاتیں یا دھات کے کٹوردان میں رکھ کر اپنے ڈرائیور کے ہاتھ بھجواتیں۔ بات صرف یہ نہیں تھی کہ نانی دوزینے اتر کر نیچے باورچی خانے میں جانے کو تیار نہ تھیں، بلکہ وہ اپنے کمرے سے نکل کر مکان کے دوسرے کمروں میں بھی قدم نہ رکھتی تھیں اور وہ کمرے گرد کی تہہ اور مکڑی کے ریشمی جالوں سے ڈھک گئے تھے۔ اپنی ماں کی طرح، جنھوں نے اپنے آخری برس ایک بڑے سے چوبی مکان میں تنہا گزارے تھے، نانی کو بھی تنہائی کا کوئی پراسرار روگ لگ گیا تھا اور

Scanned with CamScanner

وہ کسی نوکر یا جھاڑ پونچھ کرنے والے تک کو اندر نہ گھسنے دیتیں۔

جب ہم ان سے ملنے جاتے تو امی گھنٹی کے بٹن کو بہت دیر تک دبائے رکھتیں اور لوہے کے دروازے پر مکے مارتیں، تب کہیں نانی آخرکار دوسری منزل کی مسجد کے سامنے والی کھڑکی کے زنگ لگے آہنی تختے سرکا کر، نیچے جھانک کر ہماری طرف دیکھتیں، اور چونکہ وہ اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ کرتی تھیں — اب وہ زیادہ دور تک نہیں دیکھ پاتی تھیں — وہ ہمیں پکار کر اپنی جانب ہاتھ ہلانے کو کہتیں۔

''دریں سے ذرا باہر نکلو، بچو، تاکہ تمھاری نانی تمھیں دیکھ لیں،'' امی کہتیں۔ باہر نکل کر فٹ پاتھ کے بیچ میں پہنچتے ہوئے وہ پکارتیں، ''اماں جان، میں آئی ہوں، بچوں کے ساتھ... ہم لوگ ہیں، آپ کو سنائی دے رہا ہے؟''

ان کی ہلکی مسکراہٹ دیکھ کر ہم سمجھ جاتے کہ انھوں نے ہمیں پہچان لیا۔ تب وہ فوراً کھڑکی سے پیچھے ہٹتیں اور بڑی سی چابی نکال کر جو وہ تکیے کے نیچے رکھتی تھیں، اخباری کاغذ میں لپیٹتیں اور نیچے پھینک دیتیں۔ میں اور بھائی اسے کیچ کرنے کی کوشش میں ایک دوسرے کو دھکیلتے اور کہنیاں مارتے۔

بھائی کا بازو اب تک دکھ رہا تھا جس سے وہ سست پڑ گیا، اس لیے چابی پہلے میرے ہاتھ لگی جو میں نے امی کو دے دی۔ انھوں نے کچھ زور لگا کر آخر لوہے کے پھاٹک کا تالا کھول لیا۔ جب ہم تینوں نے زور لگایا تو وہ آہستہ آہستہ کھل گیا۔ اور اس کے پیچھے کے اندھیرے میں سے وہ بو آئی جس سے اس کے بعد میرا واسطہ کبھی نہیں پڑنے والا تھا: شکستگی، گلی ہوئی مٹی، گرد، کہنگی اور ٹھہری ہوئی ہوا کی ملی جلی بو۔ دروازے کے بالکل ساتھ کوٹ ٹانگنے کا اسٹینڈ کھڑا تھا — اکثر آ نکلنے والے چوروں کو یہ سوچنے پر مجبور کرنے کے لیے کہ گھر میں کوئی مرد موجود ہے — اس پر نانی نے نانا کی فیلٹ کی ٹوپی اور فر کے کالر والا کوٹ ٹانگ رکھا تھا، اور کونے میں وہ بوٹ رکھے تھے جن سے مجھے ہمیشہ ڈر لگتا تھا۔

کچھ دیر بعد، دو سیدھے چوبی زینوں کے اختتام پر، دور، بہت دور، سفید روشنی میں کھڑی نانی ہمیں دکھائی دیں۔ وہاں سایوں کے درمیان، جہاں آنے والی روشنی صرف پالے کے کھائے ہوئے آرٹ ڈیکو دروازوں میں سے چھن کر آ رہی تھی، اپنی چھڑی کا سہارا لیے بالکل ساکت کھڑی وہ کوئی بھوت معلوم ہو رہی تھیں۔

چرچراتے ہوئے زینے پر چڑھتے ہوئے امی نے نانی سے کوئی بات نہ کی۔ (کبھی کبھی وہ کہتی

تھیں، ''کیسی ہیں آپ، اماں جان؟'' یا ''اماں، میں نے آپ کو بہت یاد کیا؛ باہر بہت سردی ہے، اماں جان!'') جب میں زینے کے سرے پر پہنچا تو میں نے نانی کا ہاتھ چوما، اور کوشش کی کہ ان کے چہرے کی طرف، یا کلائی پر کے موٹے سے مسّے کی طرف نہ دیکھوں۔ لیکن اس کے باوجود ہم ان کے منھ میں موجود واحد دانت، ان کی لمبی ٹھوڑی اور چہرے پر دکھائی دینے والے رووں سے ڈر گئے، چنانچہ کمرے میں آنے کے بعد امی سے لگ کر سمٹ کر بیٹھ گئے۔ نانی اپنے بستر پر لوٹ گئیں جہاں وہ لمبا نائٹ گاؤن اور اونی شمیز پہنے اپنا زیادہ تر وقت گزارتی تھیں، اور ہمیں دیکھ کر مسکرائیں، جیسے کہہ رہی ہوں کہ لو، اب میرا دل بہلاؤ۔

''آپ کا آتشدان اتنا ٹھیک نہیں جل رہا، اماں،'' امی بولیں۔ انھوں نے سنسی سے انگاروں کو اِدھر اُدھر ہلایا۔

نانی کچھ دیر انتظار کرتی رہیں، پھر کہنے لگیں، ''اب اسے رہنے دو۔ کچھ سناؤ، کیا خبر ہے۔ دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟''

''کچھ بھی نہیں،'' امی ہمارے پاس بیٹھتے ہوئے بولیں۔

''تمھارے پاس کچھ نہیں ہے مجھے سنانے کو؟''

''کچھ بھی نہیں، اماں جان۔''

مختصر خاموشی کے بعد نانی نے پوچھا، ''کسی سے ملیں؟''

''آپ جانتی تو ہیں، اماں۔''

''خدا کے واسطے، کیا کوئی خبر نہیں ملی؟''

پھر خاموشی چھا گئی۔

''نانی، ہمیں اسکول میں ٹیکے لگے ہیں،'' میں نے کہا۔

''اچھا؟'' نانی نے اپنی بڑی بڑی نیلی آنکھیں جیسے حیرت میں کھولتے ہوئے کہا۔ ''درد ہوا؟''

''میرا بازو اب تک دکھ رہا ہے،'' بھائی بولا۔

''ارے ارے!'' نانی مسکراتے ہوئے بولیں۔

Scanned with CamScanner

پھر دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ بھائی اور میں اٹھ کر کھڑکی میں سے دور دکھائی دیتی پہاڑیوں کو، بل بیری کے درختوں کو اور پائیں باغ میں خالی پڑے مرغیوں کے دڑبے کو دیکھنے لگے۔

''کیا تم مجھے کوئی قصہ نہیں سناؤ گی؟'' نانی نے التجا کی۔ ''تم اپنی ساس سے ملنے اوپر کی منزل پر جاتی ہو۔ وہاں کوئی اور بھی آتا ہے؟''

''کل شام دلربا خانم آئی تھیں،'' امی بولیں۔ ''بچوں کی دادی کے ساتھ بیزیک (bezique) کھیلتی رہیں۔''

تب نانی نے اپنی مسرور آواز میں وہی کہا جس کی ہم توقع کر رہے تھے، ''آخر ہیں نا محل کی خاتون!''

ہم جانتے تھے وہ ان کریم رنگ کے محلوں کی بات نہیں کر رہی تھیں جن کے بارے میں ہم اُن دنوں پری کتھاؤں اور اخباروں میں پڑھا کرتے تھے، بلکہ دولما باغچے محل کا ذکر کر رہی تھیں؛ یہ تو ہمیں بہت بعد میں جا کر احساس ہوا کہ وہ دلربا خانم کو تحقیر سے دیکھتی تھیں — جو آخری سلطان کے حرم سے تھیں — کیونکہ وہ ایک تاجر سے شادی کرنے سے پہلے ان کی داشتہ رہ چکی تھیں، اور وہ ہماری دادی کو بھی تحقیر سے دیکھتی تھیں کیونکہ ان کا ایسی عورت سے دوستانہ تھا۔ پھر وہ دونوں ایک ایسے موضوع پر بات کرنے لگیں جو ہر بار جب امی وہاں آتی تھیں ان کے درمیان ضرور چھڑ جاتا تھا: ہفتے میں ایک بار، نانی بے اوغلو میں واقع ایک مشہور اور مہنگے ریستوراں ''عبداللہ آفندی'' میں تنہا دوپہر کا کھانا کھاتی تھیں، اور پھر بعد میں ان تمام چیزوں کے بارے میں تفصیل سے شکایتیں کرتیں جو انھوں نے وہاں کھائی ہوتی تھیں۔ اس کے بعد انھوں نے تیسرا تیار موضوع اس سوال سے چھیڑا: ''بچو، تمھاری دادی تمھیں پودینہ تو نہیں کھلاتیں؟''

ہم نے، ایک آواز ہو کر، وہی جواب دیا جو امی نے ہمیں سکھا رکھا تھا، ''نہیں نانی اماں، نہیں کھلاتیں۔''

ہمیشہ کی طرح نانی نے ہمیں وہی قصہ سنایا کہ کس طرح انھوں نے ایک باغ میں ایک بلی کو پودینے کے ایک ڈھیر پر پیشاب کرتے دیکھا تھا اور کس طرح یہ عین ممکن تھا کہ اسی ڈھیر کا کچھ حصہ تھوڑا بہت دھل کر کسی احمق کے کھانے میں شامل ہو گیا ہو، اور یہ کہ کس طرح اس بارے میں ان کی

Scanned with CamScanner

ششلی اور نشانتاشی محلوں کے دکانداروں سے بحث چلتی رہتی ہے۔

''اماں جان،'' امی بولیں۔ ''بچے بور ہو رہے ہیں؛ وہ دوسرے کمروں کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں برابر والا کمرہ کھول دیتی ہوں۔''

نانی مکان کے سارے کمروں کو باہر سے تالا لگا کر رکھتی تھیں تاکہ اگر کوئی چور کھڑکی کے راستے اندر آ بھی جائے تو کسی دوسرے کمرے میں داخل نہ ہو سکے۔ امی نے وہ بڑا سا ٹھنڈا کمرہ کھولا جس کا رخ اس سڑک کی طرف تھا جس پر ٹرام چلتی تھی، اور ایک پل کے لیے وہ ہمارے ساتھ کھڑی گرد پوشوں سے ڈھکی آرام کرسیوں اور دیوانوں، زنگ اور گرد سے ڈھکی سینیوں، چراغوں اور کرسیوں، اور ردی اخباروں کے بنڈلوں؛ اور کونے میں کھڑی لڑکیوں کی بائیسکل کی گھسی ہوئی گدی اور جھکے ہوئے ہینڈل کو تکتی رہ گئیں۔ لیکن انھوں نے صندوق کھول کر اس میں سے کوئی چیز نکال کر ہمیں نہیں دکھائی، جیسا کہ وہ مسرور دنوں میں کیا کرتی تھیں۔ (''دیکھو بچو، تمھاری امی جب چھوٹی سی تھیں تو یہ سینڈل پہنتی تھیں؛ تمھیں تمھاری امی کی بچپن کی گلگ دکھاؤں، بچو؟'')

''سردی لگنے لگے تو آ کر مجھے بتا دینا،'' انھوں نے یہ کہا اور چلی گئیں۔

بھائی اور میں دوڑ کر کھڑکی کے پاس پہنچے تاکہ مسجد اور چوک میں چلتی ٹرام کو دیکھ سکیں۔ پھر ہم اخباروں میں پرانے فٹبال میچوں کا ذکر پڑھنے لگے۔ ''میں بور ہو رہا ہوں،'' میں نے کہا۔ ''تم سب سے اوپر سب سے نیچے والا کھیل کھیلنا چاہتے ہو؟''

''ہارا ہوا پہلوان اب بھی کشتی لڑنے پر آمادہ ہے،'' بھائی نے اخبار سے نظر ہٹائے بغیر کہا۔ ''میں اخبار پڑھ رہا ہوں۔''

ہم نے یہ کھیل اُس دن صبح پھر کھیلا تھا اور بھائی پھر جیت گیا تھا۔

''پلیز!''

''میری ایک شرط ہے۔ اگر میں جیتوں تو تم مجھے دو تصویریں دو گے، تم جیتے تو میں صرف ایک تصویر دوں گا۔''

نہیں، میں بھی ایک دوں گا۔''

''پھر میں نہیں کھیلتا،'' بھائی نے کہا۔ ''تم دیکھ رہے ہو میں اخبار پڑھ رہا ہوں۔''

Scanned with CamScanner

اس نے اخبار کو ٹھیک اس انداز میں تھام رکھا تھا جیسے اس بلیک اینڈ وائٹ فلم کا جاسوس ہیرو تھامتا تھا جو ہم نے اینجل تھیٹر میں انھی دنوں دیکھی تھی۔ کچھ دیر کھڑکی میں سے باہر دیکھتے رہنے کے بعد میں نے بھائی کی شرط مان لی۔ ہم نے جیبوں سے نامور شخصیات والے کارڈ نکالے اور کھیلنے لگے۔ پہلے میں جیتا، لیکن پھر سترہ اور تصویریں ہار گیا۔

''جب ہم اس طرح کھیلتے ہیں تو میں ہمیشہ ہارتا ہوں،'' میں نے کہا۔ ''پرانی طرح کھیلنا ہے تو کھیلو، نہیں تو میں نہیں کھیلتا۔''

''چلو ٹھیک ہے،'' بھائی اُسی جاسوس کے انداز کی نقل کرتے ہوئے بولا۔ ''ویسے بھی میں یہ اخبار پڑھنا چاہتا تھا۔''

میں کچھ دیر کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ میں نے اپنی تصویروں کو احتیاط سے گنا: میرے پاس اب 121 تصویریں باقی رہ گئی تھیں۔ دو دن پہلے، جب ابا گئے تھے، میرے پاس 183 تصویریں تھیں! لیکن میں اس بارے میں نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ میں خود ہی بھائی کی شرط پر رضامند ہوا تھا۔

شروع میں میں جیت رہا تھا، لیکن پھر وہ دوبارہ جیتنے لگا۔ اس نے اپنی خوشی چھپالی، میرے کارڈ اپنے قبضے میں لیتے اور اپنی گڈی میں شامل کرتے وقت مسکرانے سے باز رہا۔

''اگر تم چاہو تو ہم کسی اور طرح کھیل سکتے ہیں،'' کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ''جو بھی جیتے گا اسے ایک کارڈ ملے گا۔ اگر میں جیتا تو تم سے اپنی مرضی کا کارڈ لوں گا۔ کیونکہ میرے پاس کچھ تصویریں کم ہیں، اور تم وہ والی مجھے کبھی نہیں دیتے ہو۔''

یہ سوچ کر کہ میں جیت جاؤں گا، میں راضی ہو گیا۔ لیکن پتا نہیں یہ کیسے ہوا۔ ایک کے بعد ایک تین دفعہ میں اپنا ایک نہ ایک خاص کارڈ کھو بیٹھا، اور دیکھتے ہی دیکھتے میں اپنی دونوں گریٹا گاربو (21) اور اپنے واحد شاہ فاروق (78) سے محروم ہو چکا تھا۔ میں اپنی یہ سب تصویریں فوراً واپس لینا چاہتا تھا، اس لیے کھیل بڑھتا گیا: نتیجہ یہ کہ بہت سے دوسرے کارڈ جو میرے پاس تھے اور بھائی کے پاس نہیں تھے— آئن اسٹائن (63)، رومی (3)، ممبو چونگ گم کینڈی فروٹ کمپنی کا بانی سارکس نزاریان (100) اور قلوپطرہ (51)— صرف دو بازیوں میں اس کے پاس پہنچ چکے تھے۔

مجھ سے تھوک تک نہیں نگلا جا رہا تھا۔ چونکہ مجھے ڈر تھا کہ میں رونے لگوں گا، اس لیے میں دوڑ

Scanned with CamScanner

کر کھڑکی کے پاس پہنچ گیا اور باہر دیکھنے لگا: صرف پانچ منٹ پہلے ہر چیز کیسی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ ٹرمینس پر پہنچتی ہوئی ٹرام، پتے گراتی شاخوں میں سے دور نظر آتی فلیٹوں کی عمارتیں، گلی کے فرش کی اینٹوں پر لیٹا، کاہلی سے انگڑائی لیتا ہوا کتا! کاش وقت رک گیا ہوتا۔ کاش ہم پانچ خانے پیچھے جا سکتے، جیسے گھڑ دوڑ لوڈو کھیلتے ہوئے کرتے تھے۔ آئندہ میں کبھی بھائی کے ساتھ سب سے اوپر سب سے نیچے نہیں کھیلوں گا۔

''پھر کھیلیں؟'' میں نے اپنا ماتھا کھڑکی کے شیشے سے ہٹائے بغیر کہا۔

''میں نہیں کھیلتا،'' بھائی نے کہا۔ ''تم پھر رونے لگو گے۔''

''جواد، وعدہ، اب نہیں روؤں گا،'' میں اس کے برابر میں پہنچ کر اصرار کرنے لگا۔ ''لیکن ہم اُس طرح کھیلیں گے جیسے پہلے کھیلتے تھے، پرانے طریقے سے۔''

''مجھے اخبار پڑھنے دو۔''

''اچھا ٹھیک ہے،'' میں نے کہا۔ میں نے اپنی گڈی کو پھینٹا جو ہمیشہ سے زیادہ پتلی ہو چکی تھی۔ ''پرانے طریقے سے۔ سب سے اوپر یا سب سے نیچے؟''

''رونے کی نہیں،'' وہ بولا۔ ''ٹھیک ہے، سب سے اوپر۔''

میں جیت گیا اور اس نے مجھے اپنا ایک فیلڈ مارشل فوزی چقماق دے دیا۔ میں اسے لینے کو تیار نہ تھا۔ ''مجھے 78 نمبر دے دو نا، شاہ فاروق۔''

''نہیں،'' وہ بولا۔ ''ایسی کوئی بات طے نہیں ہوئی تھی۔''

ہم نے دو بازیاں اور کھیلیں، اور اس کی مانگی ہوئی تصویریں اسے دینے کے بجائے میں نے اپنی ساری بچی ہوئی تصویریں اس کے سر کے اوپر ہوا میں اچھال دیں: یہ وہ کارڈ تھے جنھیں میں ڈھائی مہینے سے ایک ایک کر کے جمع کرتا رہا تھا اور ان میں سے ایک ایک پر بنی ہوئی تصویر کے بارے میں روزانہ پہروں سوچا کرتا تھا، انھیں چھپا کر رکھتا اور نہایت احتیاط اور بے تابی سے گڈی کی شکل میں اکٹھا کرتا آیا تھا — نمبر 28 مے ویسٹ، نمبر 82 جیول ورن، نمبر 7 محمد فاتح، اور نمبر 70 ملکہ الزبتھ، نمبر 41 کمیونسٹ جلال سالک، نمبر 42 والتیر — اب یہ سب کے سب ہوا میں اچھل کر فرش پر اِدھر اُدھر

بکھر رہے تھے۔

کاش میں کسی اور جگہ ہوتا، کاش میں کسی اور زندگی میں ہوتا! نانی کے کمرے میں واپس جانے سے پہلے زینہ اترتے ہوئے مجھے اپنے ایک دور کے رشتہ دار کا خیال آ رہا تھا جو بیمہ کمپنی میں کام کرتے تھے اور جنھوں نے خودکشی کر لی تھی۔ دادی نے مجھے بتایا تھا کہ خودکشی کرنے والا ہمیشہ ایک زیرزمین تاریک جگہ میں رہتا ہے اور کبھی جنت میں داخل نہیں ہوتا۔ جب میں بہت ساری سیڑھیاں اتر چکا، تو رک کر اندھیرے میں کھڑا رہ گیا۔ پھر مڑ کر واپس گیا اور سب سے اوپر کی سیڑھی پر، نانی کے کمرے کے بالکل ساتھ، بیٹھ گیا۔

''میں تمھاری ساس کی طرح مالدار تو ہوں نہیں،'' میں نے نانی کو کہتے سنا۔ ''بس تم اپنے بچوں کی دیکھ بھال کرو اور انتظار کرتی رہو۔''

''پلیز اماں، میں آپ سے التجا کرتی ہوں۔ میں بچوں کو لے کر یہاں واپس آنا چاہتی ہوں،'' امی کہہ رہی تھیں۔

''تم دو بچوں کے ساتھ یہاں نہیں رہ سکتیں، اتنے گرد و غبار، جن بھوتوں اور چوروں کے درمیان،'' نانی نے کہا۔

''اماں جان،'' امی بولیں، ''کیا آپ کو یاد نہیں کہ ہم یہاں کتنے ہنسی خوشی رہا کرتے تھے، آپ اور میں، ابا کے انتقال اور بہنوں کی شادی کے بعد؟''

''میری پیاری مبرور، تم دن بھر بیٹھی صرف اپنے ابا کے 'مصور' کے پرانے شماروں کی ورق گردانی کیا کرتی تھیں۔''

''اگر میں نیچے والا آتشدان جلا لوں تو یہ گھر دو دن کے اندر اندر گرم اور رہنے کے قابل ہو جائے گا۔''

''میں نے تمھیں اس سے شادی کرنے سے منع کیا تھا، کیا تھا یا نہیں؟'' نانی بولیں۔

''میں نوکرانی کو لے آؤں گی تو دو دن میں سارا گرد و غبار صاف ہو جائے گا،'' امی نے کہا۔

''میں کسی چور نوکرانی کو گھر میں گھسنے نہیں دوں گی،'' نانی نے کہا۔ ''ویسے بھی اس تمام گرد اور مکڑی کے جالوں کی صفائی میں کم سے کم چھ مہینے لگیں گے۔ اس وقت تک تمھارا گمراہ شوہر گھر واپس آ

Scanned with CamScanner

چکا ہوگا۔''

''کیا یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے، اماں جان؟''

''مبرور، میری پیاری بیٹی، اگر تم اپنے دونوں بچوں کے ساتھ یہاں چلی آئیں تو ہم چاروں کیا کھا کر جییں گے؟''

''اماں جان، میں نے آپ سے کتنی بار کہا ہے، درخواست کی ہے کہ بابک میں پڑا ہوا مال بیچ ڈالیں، اس سے پہلے کہ کوئی اس پر قبضہ کر لے۔''

''میں اس رجسٹری دفتر میں جا کر ان غلیظ بابوؤں کو اپنے دستخط اور اپنی تصویر نہیں دینے والی۔''

''کیا بات کرتی ہیں اماں جان! بڑی آپا اور میں اس وکیل کو یہاں گھر کی دہلیز پر لے آئے تھے،'' امی نے اونچی آواز میں کہا۔

''میں نے اس وکیل کا کبھی اعتبار نہیں کیا،'' نانی بولیں۔ ''شکل ہی سے نوسرباز معلوم ہوتا تھا۔ شاید وہ وکیل تھا بھی نہیں۔ اور مجھ پر یوں چلاؤ مت!''

''اچھا ٹھیک ہے، اماں جان، نہیں چلاؤں گی!'' امی نے کہا۔ انھوں نے ہم دونوں کو پکار کر کمرے میں بلایا۔ ''بچو، بچو، چلو اپنی چیزیں سمیٹو، ہم گھر جا رہے ہیں۔''

''جلدی مت کرو!'' نانی نے کہا۔ ''ابھی تو ہم نے دو باتیں بھی نہیں کیں۔''

''آپ ہمیں چاہتی ہی نہیں اماں جان،'' امی نے سرگوشی کی۔

''یہ لو، بچوں کو تھوڑی سی مٹھائی تو کھا لینے دو۔''

''نہیں، انھیں دوپہر کے کھانے سے پہلے مٹھائی نہیں کھانی چاہیے،'' امی بولیں اور میرے پیچھے سے ہو کر سامنے والے کمرے میں چلی گئیں۔ ''یہ تصویریں کس نے فرش پر پھیلا دیں؟ چلو سمیٹو ان کو فوراً! اور تم اس کی مدد کرو!'' انھوں نے بھائی سے کہا۔

ہم خاموشی سے تصویریں سمیٹنے لگے اور امی پرانے صندوقوں کے ڈھکنے اٹھا اٹھا کر اپنے بچپن کے کپڑے، بیلے کا لباس، اور ڈبے دیکھنے لگیں۔ پائیدان والی سلائی مشین کے نیچے سے اٹھتی گرد میرے نتھنوں میں گھسنے لگی، آنکھوں سے پانی بہنے لگا اور ناک بھر گئی۔

جس وقت ہم چھوٹے سے غلسخانے میں ہاتھ دھو رہے تھے، نانی آہستہ آواز میں زور دے کر

کہہ رہی تھیں، ''مبرور، یہ چائے دانی لے جاؤ۔ یہ تمھیں اتنی پسند ہے، اور اس پر تمھارا حق بھی ہے۔ میرے نانا اسے میری اماں کے لیے لائے تھے جب وہ دمشق کے گورنر تھے۔ چین کی بنی ہوئی ہے۔ لے جاؤ!''

''اماں جان، آج کے بعد میں آپ سے کچھ نہیں چاہتی،'' امی بولیں۔ ''اور اسے واپس الماری میں رکھ لیجیے، ورنہ ٹوٹ جائے گی۔ آؤ، بچو، نانی کا ہاتھ چومو!''

''میری ننھی مبرور، میری پیاری بیٹی، اپنی غریب ماں سے خفا مت ہو،'' نانی اپنا ہاتھ چومے جانے کے لیے آگے بڑھاتے ہوئے بولیں۔ ''مجھے یہاں تنہا مت چھوڑ دینا، کہ مجھ سے ملنے آنے والا ہی کوئی نہ ہو۔''

ہم زینے پر دوڑتے ہوئے اترے اور جب تینوں نے زور لگا کر لوہے کا دروازہ کھول لیا تو باہر صاف ہوا میں پہنچتے ہی روشن دھوپ نے ہمارا استقبال کیا۔

''دروازہ اچھی طرح بند کر کے جانا!'' نانی نے پکار کر کہا۔ ''مبرور، اس ہفتے تم مجھ سے ملنے پھر آؤ گی نا؟''

جب ہم امی کا ہاتھ پکڑے چل رہے تھے، تو ہم میں سے کسی نے کوئی بات نہ کی۔ جس وقت دوسرے مسافر کھانستے ہوئے ٹرام کے چلنے کا انتظار کر رہے تھے، ہم خاموشی سے سنتے رہے۔ جب آخر کار وہ چلی تو بھائی اور میں یہ کہہ کر دوسری قطار میں جا بیٹھے کہ ہمیں کنڈکٹر کو دیکھنا ہے، اور پھر سب سے اوپر سب سے نیچے کا کھیل کھیلنے لگے۔ پہلے میں نے کچھ کارڈ ہارے، پھر کچھ واپس جیت لیے۔ جب میں نے داؤ بڑھایا تو بھائی خوشی سے رضامند ہو گیا، اور میں دوبارہ تیزی سے ہارنے لگا۔ جب ہم عثمان بے کے اسٹاپ تک پہنچے تو بھائی نے کہا، ''تمھاری ان سب تصویروں کے بدلے میں، یہ رہی نمبر پندرہ، جس کے لیے تم مرے جا رہے تھے۔''

میں کھیلتا رہا اور ہارتا رہا۔ گڈی بھائی کے حوالے کرتے ہوئے میں نے اس کی نگاہ بچا کر دو کارڈ نکال لیے۔ پھر پیچھے کی سیٹ پر امی کے پاس جا بیٹھا۔ میں رو نہیں رہا تھا۔ بس اداس نظروں سے ٹرام کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا اور وہ کراہتی ہوئی اپنی رفتار بڑھا رہی تھی۔ میں ان تمام لوگوں اور جگہوں کو گزرتے دیکھتا رہا جو اب ہمیشہ کے لیے جا چکی ہیں: درزیوں کی چھوٹی دکانیں، بیکریاں، آگے

کو نکلے چھجوں والی حلوے کی دکانیں، تان سینما جہاں ہم نے قدیم روم کے بارے میں وہ ساری فلمیں دیکھی تھیں، اس کے پیش رخ کی ساتھ والی دیوار کے پاس کھڑے بچے جو کامک بیچ رہے تھے، نائی جس کی تیز قینچیوں سے مجھے اس قدر ڈر لگتا تھا، اور محلے میں گھومتا ادھ ننگا پاگل جو ہمیشہ اس نائی کی دکان کے دروازے پر کھڑا رہتا تھا۔

ہم حربیہ پر اترے۔ گھر کی طرف چلتے ہوئے بھائی کی مطمئن خاموشی مجھے پاگل کیے دے رہی تھی۔ میں نے لنڈبرگ کی تصویر نکالی جسے میں نے جیب میں چھپا رکھا تھا۔

اس نے اس تصویر کی پہلی بار جھلک دیکھی۔ ''نمبر 91، لنڈبرگ!'' اس نے تحسین آمیز انداز سے پڑھا۔ ''اس جہاز کے ساتھ جس میں بیٹھ کر اس نے بحیرۂ اوقیانوس کو عبور کیا! یہ تمھیں کہاں سے مل گئی؟''

''کل میں نے اسکول میں ٹیکہ نہیں لگوایا تھا،'' میں نے اسے بتایا۔ ''میں جلدی گھر آ گیا تھا، اور ابا کے جانے سے پہلے ان سے ملا بھی تھا۔ انھوں نے ہی مجھے دلائی تھی۔''

''پھر تو یہ آدھی میری ہے،'' وہ بولا۔ ''بلکہ جب ہم نے آخری بازی کھیلی تھی تو یہ طے ہوا تھا کہ تمھارے پاس جتنی تصویریں بچی ہیں سب مجھے ملیں گی۔'' اس نے میرے ہاتھ سے وہ تصویر چھیننے کی کوشش کی لیکن نہ چھین سکا۔ اس نے میری کلائی پکڑ لی اور اسے اتنے زور سے موڑا کہ میں نے اس کی ٹانگ پر ٹھوکر ماری۔ میں ایک دوسرے سے گتھ گئے۔

''ٹھہرو!'' امی نے کہا۔ ''رک جاؤ! دیکھتے نہیں، ہم سڑک پر چل رہے ہیں؟''

ہم رک گئے۔ سوٹ پہنے ایک آدمی اور ہیٹ لگائے ایک عورت ہمارے برابر سے نکلی۔ مجھے سڑک کے بیچوں بیچ لڑنے پر شرمندگی ہونے لگی۔ بھائی دو قدم چل کر زمین پر گر پڑا اور اپنی ٹانگ پکڑ کر چلانے لگا، ''بہت زور سے دکھ رہی ہے!''

''کھڑے ہو جاؤ!'' امی نے دبی ہوئی آواز میں کہا۔ ''چلو، اٹھ کھڑے ہو! سب لوگ دیکھ رہے ہیں۔''

بھائی اٹھ کھڑا ہوا اور سڑک پر یوں لنگڑاتا ہوا چلنے لگا جیسے کسی فلم میں زخمی سپاہی چلتا ہے۔ مجھے خوف تھا کہ شاید اسے واقعی بہت زور سے لگی ہے، لیکن اسے اس حالت میں دیکھ کر خوشی بھی ہو رہی

Scanned with CamScanner

تھی۔ کچھ دیر خاموشی سے چلنے کے بعد وہ بولا، ''گھر پہنچ کر دیکھنا کیا ہوتا ہے۔ امی، علی نے کل ٹیکہ نہیں لگوایا!''

''لگوایا تھا، امی!''

''چپ رہو!'' امی چلائیں۔

اب ہم گھر کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ ہم ماچکا سے آتی ہوئی ٹرام کے سامنے سے گزر جانے کے انتظار میں رک گئے۔ اس کے گزرنے کے بعد ایک ٹرک آیا، پھر پیشکتاش کی کھڑکھڑاتی ہوئی بس دھوئیں کے بادل چھوڑتی ہوئی گزری، اور اس کی مخالف سمت سے ایک ہلکی جامنی ڈی سوتو کار۔ تب میں نے چچا کو دیکھا جو کھڑکی میں سے جھانک کر نیچے سڑک کو دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے مجھے نہیں دیکھا؛ وہ گزرتی ہوئی کاروں کو دیکھ رہے تھے۔ میں بہت دیر تک انھیں دیکھتا رہا۔

سڑک کب کی خالی ہو چکی تھی۔ میں امی کی طرف مڑا، یہ سوچ کر کہ وہ ہمارا ہاتھ پکڑ کر سڑک پار کیوں نہیں کر رہیں، تو دیکھا کہ وہ خاموش کھڑی رو رہی تھیں۔

❋❋

اورحان پامک

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

میرا ابا کا کتب خانہ

میرے کتب خانے کے قلب میں میرے ابا کا کتب خانہ ہے۔ جب میں سترہ اٹھارہ سال کا تھا اور اپنا بیشتر وقت پڑھنے پر صرف کرنے لگا تھا، تب میں استنبول کے کتب فروشوں سے حاصل ہونے والی کتابوں کے علاوہ ان کتابوں کو بھی چاٹ جایا کرتا جو ابا ہمارے گھر کے دیوان خانے میں رکھتے تھے۔ اُن دنوں اگر مجھے ابا کے کتب خانے کی کوئی کتاب پسند آجاتی تو میں اسے اپنے کمرے میں لے جا کر اپنی کتابوں میں رکھ لیتا تھا۔ ابا، جو میرا پڑھنے کا شوق دیکھ کر بہت خوش تھے، اپنی بعض کتابوں کی میرے کتب خانے کی جانب نقل مکانی دیکھ کر بھی خوش ہوتے تھے، اور جب وہ اپنی کسی پرانی کتاب کو میرے شیلف میں دیکھتے تو مجھے چھیڑنے کے لیے کہتے، "آہا! تو گویا یہ کتاب بھی ترقی پا کر اوپر کی منزل پر پہنچ گئی!"

1970 میں، جب میری عمر اٹھارہ سال تھی، میں نے — کتابوں سے دلچسپی لینے والے تمام ترک نوعمروں کی طرح — نظمیں لکھنی شروع کر دیں۔ میں مصوری کرتا تھا اور آرکیٹکچر پڑھ رہا تھا، لیکن ان دونوں مشاغل سے مجھے حاصل ہونے والی مسرت غائب ہوتی جا رہی تھی؛ میں راتوں کو سگریٹ پیتا اور نظمیں لکھتا، جنھیں میں سب سے چھپا کر رکھتا تھا۔ انھی دنوں میں نے شاعری کے وہ مجموعے پڑھنے شروع کیے جو ابا نے (جو نوجوانی کے دنوں میں خود بھی شاعر بننے کے خواہشمند تھے) اپنے شیلف میں سجا رکھے تھے۔

Scanned with CamScanner

مجھے ان پتلی، رنگ اڑی کتابوں سے محبت ہو گئی جو ان شاعروں کی لکھی ہوئی تھیں جو ترکی ادب میں ''پہلی لہر'' (1940 اور 1950 کے عشروں) اور ''دوسری لہر'' (1960 اور 1970 کے عشروں) کے شاعروں کے طور پر جانے جاتے ہیں؛ انھیں پڑھنے کے بعد مجھے اسی انداز میں نظمیں لکھنے کی خواہش ہوئی۔ پہلی لہر کے شاعر — اورحان ولی، ملیح جودت اور اوکتائے رفعت — اس پہلے شعری مجموعے کے عنوان سے پہچانے جاتے ہیں جسے انھوں نے مشترکہ طور پر شائع کیا تھا — غریب، بمعنی عجیب۔ انھوں نے ترکی شاعری میں گلی کوچوں کی زبان کو متعارف کرایا، وہ اس زبان کے مزاج پر فخر کرتے اور سرکاری طور پر مستند زبان کے ضوابط کو، اور ان سے وابستہ جبر اور آمریت پر مبنی دنیا کو، مسترد کرتے تھے۔ ابا کبھی کبھی اس پہلے ایڈیشن کو کھول کر ان میں سے کسی شاعر کی ایک آدھ نظم بلند آواز میں پڑھ کر سناتے اور ہمیں اس کی متلون مزاجی اور اس کے انوکھے پن سے محظوظ کرتے تھے، اور ان کے اختیار کیے ہوئے انداز سے ہماری سمجھ میں آتا کہ ادب زندگی کے حیران کن خزانوں میں سے ایک ہے۔

میں دوسری لہر کے شاعروں سے بھی متاثر ہوا جنھوں نے اختراع کے اس جذبے کو اگلی پیڑھی تک پہنچایا اور شاعری میں ایک بیانیہ، اظہاریت پسند (expressionistic) آواز پیدا کی، اور اس کے علاوہ اپنی نگارشات میں جابجا ڈاڈائسٹ (Dadaist)، سرریلسٹ اور آرائشی موتیفوں کا ایک آمیزہ شامل کرتے گئے؛ جب میں ان شاعروں (جمال ثریا، تُرگت اویار، اِجان برق) کو، جو اب دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں، پڑھتا تو مجھے یقین ہو جاتا کہ میں خود بھی ان کی طرح لکھ سکتا ہوں۔ میرا یہ احساس کچھ کچھ کسی ایک شخص کا سا تھا جو کسی تجریدی پینٹنگ کو دیکھ کر معصومیت سے یہ سمجھتا ہے کہ اس قسم کی پینٹنگ وہ خود بھی بنا سکتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہو گا کہ میرا احساس کسی مصور کے احساس سے ملتا جلتا تھا جو کسی پسندیدہ پینٹنگ کو دیکھ کر یہ سوچتا ہے کہ اس نے اس فن پارے کی تخلیق کا راز پا لیا ہے۔ جس طرح وہ مصور اپنے اس خیال کو درست ثابت کرنے کے لیے سیدھا اپنے اسٹوڈیو کا رخ کرتا ہے، کم وبیش اسی طرح میں بھی فوراً اپنی میز پر پہنچ جاتا کہ نظم لکھ سکوں۔

ان دو لہروں کے شاعروں کے سوا، باقی ترکی شاعروں کی تحریریں، چند اکا دکا مستثنیات کو چھوڑ کر، مصنوعی قسم کی اور روزمرہ زندگی سے بہت دور ہوتی تھیں، چنانچہ مجھے ان میں نظموں کے طور پر کوئی

Scanned with CamScanner

دلچسپی محسوس نہ ہوتی؛ مجھے اگر دلچسپی تھی تو بس ان کے دانشورانہ مضمرات سے۔ مغربیت، جدیدیت اور یوروپ کے بے حدوزنی اثرات سے جوجھتا ہوا مقامی شاعر دورِ عثمانیہ کی ترکی ادبی روایات میں سے، جو شکستہ ہو کر تیزی سے غائب ہوتی جا رہی تھیں، کیا کچھ بچا لا سکتا ہے، اور کس طرح؟ اس 'دیوان' شاعری کا کیا ہوگا جو عثمانی اشراف فارسی ادب کے زیرِ اثر تخلیق کیا کرتے تھے؟ اُس شاعری کی، جس کے حسن اور ادبی استعاروں کو سمجھنا بعد کی پیڑھیوں کے پڑھنے والوں کے لیے لغات اور شرحوں کی مدد کے بغیر ممکن نہ تھا، آج کی جدید شاعری کے لیے کیا معنویت ہے؟

''روایت سے وابستگی'' کے تصور سے جڑے ہوئے پریشان کن سوالوں نے مجھ سے پہلے والی پیڑھی کے، بلکہ میرے، ہم نسل لکھنے والوں کو بھی بہت مشغول رکھا تھا۔ چونکہ عثمانی شاعری کئی صدیوں سے پھل پھول رہی تھی، اور مغربی اثرات سے قطعی بیگانہ رہی تھی، چنانچہ اس میں ایک قسم کے تسلسل کا احساس موجود تھا، جس کے باعث شاعری کے حوالے سے ادبی اور فلسفیانہ سوالات پر گفتگو کرنا آسان اور آرام دہ تھا۔ ناول چونکہ یوروپ سے درآمد کی ہوئی شے تھی، اس لیے ناول نگار اور نثر کی دیگر اصناف کے لکھنے والے ہماری اپنی روایت سے جڑنے کے خیال سے شاعری ہی کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔

1970 کے عشرے کے ابتدائی برسوں میں، جب شاعری کی بابت میرا جوش بھڑک کر تیزی سے ٹھنڈا پڑ چکا تھا اور میں ناول نگار بننے کا فیصلہ کر چکا تھا، ترکی میں اس وقت تک شاعری ہی کو اصل ادب تصور کیا جاتا تھا جبکہ ناول کو کمتر درجے کی مقبولِ عام صنف سمجھا جاتا تھا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ناول کو نسبتاً زیادہ سنجیدگی سے برتا جانا پچھلے پینتیس سال کے دوران شروع ہوا، جبکہ شاعری نے رفتہ رفتہ اپنی اہمیت ایک حد تک کھو دی ہے۔ اسی عرصے کے دوران اشاعتی صنعت میں بے پناہ تیزی سے پھیلاؤ آیا ہے اور اس نے پڑھنے والوں کی پہلے سے کہیں بڑی تعداد کو پہلے سے کہیں زیادہ تنوع پیش کیا ہے۔

جب میں نے ادیب بننے کا فیصلہ کیا، اُن دنوں شاعری یا ناول کسی بھی صنف کی قدر تخلیقی احساس کے انفرادی اظہار، اچھوتے طرزِ احساس، یا انفرادی روح کی بنیاد پر متعین نہیں ہوتی تھی؛ اس کے برعکس یہ تصور غالب تھا کہ سنجیدہ لکھنے والے اجتماعی طور پر کام کرتے ہیں، اور ان کے کام کی

قدر شناسی اس لحاظ سے ہوتی تھی کہ وہ سماجی یوٹوپیا میں کس طرح اضافہ کرتا ہے اور ایک مشترکہ وژن (مثلاً جدیدیت، سوشلزم، اسلام پسندی، قوم پرستی یا سیکولر جمہوریت پسندی) کی کس طور عکاسی کرتا ہے۔ ادبی حلقوں میں انفرادی تخلیقی ادیب کے ان مسائل سے کوئی دلچسپی نہ پائی جاتی تھی کہ وہ تاریخ اور روایت سے کس طرح اخذ کرے اور اس ادبی ہیئت کو کس طرح حاصل کرے جو اس کی اپنی آواز کو بہترین طریقے سے سمو سکے۔

اس کے بجائے ادب کا اتحاد مستقبل سے تھا: اس کا وظیفہ یہ تھا کہ ریاست کے اس کام میں ہاتھ بٹائے جو وہ ایک مسرور اور ہم آہنگ معاشرے، بلکہ قوم، کی تشکیل کے مقصد سے کر رہی تھی۔ یوٹوپیائی جدیدیت — خواہ اس کی بنیاد سیکولرازم ہو یا جمہوریت پسندی یا سوشلسٹ مساوات — اپنی نگاہیں اس قدر مضبوطی سے مستقبل پر جمائے ہوئے تھی کہ، میں بعض اوقات سوچتا ہوں، پچھلی ایک صدی میں استنبول کی گلیوں اور گھروں میں جو کچھ پیش آ تا رہا تھا اس کے قلب اور روح کو اس نے اپنی نگاہوں سے قطعی اوجھل کر رکھا تھا۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ جو ادیب اس سوال سے گہری جذباتی وابستگی رکھتے ہیں کہ ترکی کو ایک درخشاں مستقبل تک کیونکر پہنچایا جائے، وہ ہماری زندگیوں کے بارے میں اتنی سچی کہانی نہیں سناتے جیسے احمت حمدی تنپنار اور عبدالحق شناسی حصار، جنھوں نے ہماری روایتی ثقافت کے زوال کا ماتم کیا، یا جیسے سعید فائق اور عزیز نیسن، جو استنبول کی گلیوں کی شعریت سے آگاہ تھے اور اس شہر سے کسی شرط کے بغیر محبت کرتے تھے۔

مغربیت اور تیز رفتار جدیدیت کے دور میں مرکزی سوال — صرف ترکی ادب کے لیے نہیں بلکہ مغرب سے باہر کے تمام ادب کے لیے — یہ ہے کہ آج کے رنگوں میں کل کے خوابوں کو کس طرح پینٹ کیا جائے، جدید اقدار والے جدید ملک کا خواب کیونکر دیکھا جائے جبکہ روزمرہ روایت کی مسرت بھی محو نہ ہو۔ ایسے ادیب جن کے انقلابی مستقبل کے خواب انھیں سیاسی تنازعات میں الجھا دیتے ہیں، اکثر قید میں ڈال دیے جاتے ہیں، اور ان کے جھیلے ہوئے مصائب ان کی آواز اور ان کے نقطۂ نظر میں ایک سخت اور تلخ کاٹ پیدا کر دیتے ہیں۔

میرے ابا کے کتب خانے میں ناظم حکمت — ترکی کے اہم ترین شاعر — کی اولین کتابیں بھی موجود تھیں جو 1930 کے عشرے میں، انقلابی خیالات کے باعث اس کے قید کیے جانے سے

پہلے، شائع ہوئیں۔ ان نظموں کے غصے اور امید سے بھرے لہجے، ان کے یوٹوپیائی وژن اور روسی مستقبلیاتی فکر کے زیر اثر کی گئی ہیئتی اختراعات نے مجھے جس قدر متاثر کیا اتنا ہی اثر مجھ پر ان مصائب کا ہوا جو شاعر نے برداشت کیے تھے؛ قید میں گزارے ہوئے سال جن کی داستان اورحان کمال اور کمال طاہر جیسے حقیقت پسند ناول نگاروں کی، جو خود بھی انھی قید خانوں میں رہے تھے، یادداشتوں اور خطوں میں ملتی ہے۔ صرف ان ترک دانشوروں اور صحافیوں کی یادداشتوں، ناولوں اور کہانیوں کو جمع کر کے ایک پورا کتب خانہ تیار کیا جا سکتا ہے جنھیں قید میں ڈالا گیا۔

ایک زمانے میں میں قید کا ادب اتنا زیادہ پڑھا کرتا تھا کہ مجھے وارڈوں کے روزمرہ معمول، اور قیدیوں کے دلیری کے مظاہرے اور تیز بیانی سے (اور قید خانوں کے مخصوص محاورے سے، جس کا میں بہت شائق تھا) اتنی واقفیت ہو گئی تھی جیسے میں نے خود بھی قید میں وقت گزارا ہو۔ اُن دنوں ادیب کے بارے میں میرا تصور ایک ایسے شخص کا تھا جس کے دروازے کے باہر پولیس کا پہرہ رہتا ہو، سڑک پر چلتے ہوئے سادہ لباس میں خفیہ پولیس کے کارندے جس کا تعاقب کرتے ہوں، جس کا ٹیلیفون ٹیپ کیا جاتا ہو، جسے پاسپورٹ ملنا ممکن نہ ہو اور جو قید خانے سے اپنی محبوبہ کے نام پرتاثیر خطوط لکھا کرتا ہو۔ اس طرز زندگی کی، جس سے میں صرف کتابوں کے ذریعے واقف تھا، مجھے خود اپنے لیے خواہش نہ تھی، لیکن یہ مجھے بڑی رومان انگیز لگتی تھی۔ جب تیس برس بعد مجھے اس قسم کی بعض دشواریاں پیش آئیں تو میں نے خود کو یہ یاد دلا کر تسلی دی کہ یہ ان ادیبوں کے برداشت کیے ہوئے مصائب کے مقابلے میں بہت ہلکی ہیں جن کے بارے میں میں نے اپنی نوعمری میں پڑھا تھا۔

مجھے تاسف کے ساتھ اقرار ہے کہ میں اب تک روشن خیالی کے دور کے اُس افادیت پسندانہ خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک نہیں پایا کہ کتابیں اس لیے وجود رکھتی ہیں کہ ہمیں زندگی کے لیے تیار کر سکیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ترکی میں کسی ادیب کی زندگی اسی بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ لیکن اس کا تعلق اس حقیقت سے بھی ضرور ہے کہ اُن دنوں ترکی میں ایسا کوئی وسیع کتب خانہ موجود نہ تھا جس میں آپ جو کتاب چاہیں آسانی سے پا سکیں۔ بورخیس کی تخیلاتی لائبریری میں ہر کتاب ایک رمزیانہ روپ اختیار کر لیتی ہے اور لائبریری بجائے خود، باہر وجود رکھنے والی دنیا کی پیچیدگی کو دہراتے ہوئے، ایک شاعرانہ اور مابعدالطبیعیاتی لامتناہیت کے اشارے فراہم کرتی ہے: اس خواب کے پیچھے

Scanned with CamScanner

حقیقی کتب خانے ہیں جن میں موجود تمام کتابوں کو گننا یا پڑھنا ناممکن ہے۔ بورخیس خود بیونس آئرس میں ایسے ہی ایک کتب خانے کا ڈائرکٹر تھا۔ لیکن جب میں نوعمر تھا تو استنبول یا پورے ترکی میں ایسا کوئی کتاب خانہ موجود نہ تھا جس کا اُس حقیقی کتب خانے سے موازنہ کیا جا سکتا۔ جہاں تک غیر ملکی زبانوں کی کتابوں کا تعلق ہے تو وہ کسی ایک بھی عوامی کتب خانے میں موجود نہ تھیں۔ اگر مجھے وہ سب کچھ سیکھنا تھا جو سیکھے جانے کے لیے ہے، اور ایک دانشمند شخص بن کر قومی ادب کے محدود حصار سے — جو ادبی گروہ بندیوں اور ادبی منافقت نے کھینچ رکھا تھا اور جسے دم گھونٹنے والی پابندیوں کے ذریعے نافذ کیا جاتا تھا — باہر نکلنا تھا تو اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں اپنا عظیم کتب خانہ خود تعمیر کروں۔

1970 اور 1990 کے درمیان، لکھنے کو چھوڑ کر، میری سب سے بڑی سرگرمی اپنے کتب خانے کے لیے کتابیں خریدنا تھا؛ میں چاہتا تھا اس میں وہ تمام کتابیں موجود ہوں جو میرے خیال میں اہم یا کارآمد تھیں۔ ابا مجھے خاصا زیادہ جیب خرچ دیتے تھے۔ اٹھارہ برس کی عمر سے مجھے ہر ہفتے پرانے شہر کے بایزید علاقے میں واقع پرانی کتابیں بیچنے والوں کے بازار صحاف لار جانے کی عادت پڑ گئی۔ میں نے ان چھوٹی چھوٹی دکانوں میں بے شمار گھنٹے اور دن گزارے جنھیں بجلی کے چھوٹے، غیر موثر ہیٹروں سے گرم کیا جاتا تھا، اور جہاں ہر موضوع کی ملی جلی کتابوں کے اونچے اونچے مینار ایک دوسرے کے پاس پاس کھڑے رہتے تھے، اور جہاں ہر شخص — دکان کے ملازم سے مالک تک، کبھی کبھار چکر لگانے والوں سے مستقل گاہکوں تک — غریب دکھائی دیتا تھا۔

میں سیکنڈ ہینڈ کتابوں کی ایک دکان میں داخل ہوتا، ہر شیلف میں رکھی کتابوں کا باریک بینی سے جائزہ لیتا، کتابوں کی ورق گردانی کرتا، ایک ایک کر کے ہر کتاب اٹھاتا — اٹھارویں صدی میں سویڈن اور سلطنت عثمانیہ کے تعلقات کی تاریخ؛ باقر کوئے ہسپتال کے بڑے معالج کی یادداشتیں؛ کسی اخبار نویس کے قلم سے ایک ناکام فوجی انقلاب کا آنکھوں دیکھا احوال؛ مقدونیہ میں عثمانی یادگاری عمارتوں کے بارے میں ایک تحقیقی مقالہ؛ ساتویں صدی میں استنبول آنے والے ایک جرمن سیاح کی تحریروں کی ترکی تلخیص؛ مینک ڈپریشن کی بیماری اور شیزوفرینیا کے رجحان کے موضوع پر چاپا میڈیکل فیکلٹی کے ایک پروفیسر کے خیالات؛ عثمانی دور کے ایک فراموش کردہ شاعر کی نظموں کا مختصر مجموعہ جسے حواشی کے ساتھ ہمارے زمانے کی ترکی زبان میں شائع کیا گیا؛ 1940 میں استنبول کے گورنر کے دفتر

Scanned with CamScanner

کی شائع کردہ ایک مصور تشہیری کتاب جس میں تمام عمارتیں اور باغ بلیک اینڈ وائٹ تصویروں میں دکھائے گئے تھے۔

دکان کے ملازم سے بھاؤ تاؤ کرنے کے بعد میں ان سب کو اٹھالے جاتا۔ ابتدا میں میں نے عالمی اور ترکی ادب کے کلاسیک جمع کیے — یا یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ وہ کتابیں جو ترکی ادب کے لیے ''اہم'' تھیں۔ میرا خیال تھا کہ جس طرح میں کلاسیک پڑھتا ہوں ویسے ہی دوسری کتابیں بھی یقیناً پڑھوں گا۔ لیکن جب امی، جو میرے بارے میں فکر مند رہتی تھیں کیونکہ ان کے خیال میں میں بے تحاشا پڑھتا تھا، مجھے اتنی بڑی تعداد میں مزید کتابیں لاتا دیکھتیں کہ میرے لیے انھیں پڑھنا ممکن ہی نہ تھا، تو وہ تھکے ہوئے لہجے میں کہتیں، ''اب جب تک یہ سب نہ پڑھ ڈالو، اور کتابیں مت خریدنا۔''

میرا کتابیں خریدنا کسی کتابیں جمع کرنے والے جیسا نہ تھا بلکہ ایک اُتاولے شخص کا سا تھا جو یہ جاننے کے لیے بے تاب ہو کہ ترکی آخر کیوں افلاس اور مسائل کا شکار ہے۔ جب میری عمر بیس بائیس کی تھی اور میرے دوست مجھ سے اس گھر میں ملنے آتے جہاں میں اپنے والدین کے ساتھ رہتا تھا اور وہ مجھ سے دریافت کرتے کہ میں یہ کتابیں کیوں خریدتا ہوں جو مکان کو بہت تیزی سے بھرتی جارہی ہیں، تو میں انھیں اپنے جواب سے کبھی مطمئن نہ کرسکا۔ گمش خانے کی داستانوں میں بار بار آنے والا مکان کا موتیف؛ اتاترک کے خلاف بغاوت کا پس پردہ احوال، اسٹم جرکسی کی زبانی؛ دوسرے دستوری دور (1908-1922) میں، جب ''نوجوان ترک''(Young Turks) اقتدار میں تھے، ہونے والی سیاسی قتل کی وارداتوں کی فہرست؛ شرمیلے نوجوانوں کے لیے نمونے کے عاشقانہ خطوط کا مجموعہ؛ اس طوطے کی کہانی جو لندن میں مقیم سفیر نے سلطان عبدالحمید کو تحفے میں پیش کیا تھا؛ ترکی کا پہلا سینی ٹوریم قائم کرنے والے ڈاکٹر کی سیاسی یادداشتیں؛ ایک کمیسار کے لیکچر نوٹس جس میں پولیس اسکول کے طالب علموں کو سڑکوں پر جیب کتروں، نوسربازوں، اٹھائی گیروں وغیرہ کے ہاتھوں ہونے والے چھوٹے موٹے جرائم کے بارے میں آگاہ کیا گیا تھا۔

پھر ایک سابق صدر کی، چھ جلدوں پر مشتمل اور بے شمار دستاویزوں سے اٹی ہوئی، یادداشتیں؛ ایک کتاب جس میں یہ تفصیل درج تھی کہ عثمانی تجارتی انجمنوں کے اخلاقی ضابطوں نے جدید کاروباری افعال کو کس طرح متاثر کیا؛ 1930 کے عشرے کے ایک فراموش کردہ مصور کی پیرس کی

یادیں؛ بادام کی قیمتوں میں اضافے کی غرض سے کی جانے والی تاجروں کی چابکدستیوں کے بارے میں ایک کتاب؛ چین اور البانیہ سے وابستگی رکھنے والے مارکسسٹوں کے بارے میں روس نواز مارکسسٹوں کی لکھی ہوئی تنقیدوں کا، پانچ سو صفحوں پر مشتمل، بھاری بھرکم مجموعہ؛ لوہے اور فولاد کی صنعتیں قائم ہونے کے بعد اریگلی (Eregli) شہر میں ہونے والے تغیر کی کہانی؛ سو مشہور ترک کے عنوان سے بچوں کے لیے لکھی گئی ایک کتاب؛ 1911 میں آک سرائے (Aksaray) شہر میں لگنے والی زبردست آگ کی کہانی؛ دونوں عالمی جنگوں کے درمیانی عرصے میں ایک ایسے صحافی کے لکھے ہوئے کالموں کا مجموعہ جسے ان تیس برسوں میں بالکل بھلایا جا چکا ہے؛ دو سو صفحوں پر مشتمل تاریخ جس میں وسطی اناطولیہ کے ایک بہت چھوٹے شہر کا، جسے نقشے پر تلاش کرنا بھی دشوار ہے، گزشتہ دو ہزار برس کا احوال درج تھا؛ اور ایک ریٹائرڈ استاد کے دعووں پر مشتمل کتاب جس نے، انگریزی سے مکمل ناواقفیت کے باوجود، اور صرف ترکی اخبارات پڑھ کر، یہ معما حل کر لیا تھا کہ کینیڈی کا قاتل کون تھا۔ کیا میں ان کتابوں کے مصنفوں سے اتنی دلچسپی رکھتا تھا کہ ان کتابوں کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک چاٹ جاؤں؟ بعد کے سالوں میں جب کبھی کوئی شخص مجھ سے سوال کرتا، ''مسٹر پامک، کیا آپ نے وہ ساری کتابیں پڑھی ہیں جو آپ کے کتب خانے میں موجود ہیں؟'' تو میں، اس سوال کو ہلکے پن سے لیے بغیر، جواب دیتا، ''ہاں۔ لیکن اگر میں نے ان سب کو نہ بھی پڑھا ہوتا، تب بھی ان کے کارآمد ثابت ہونے کا امکان تھا۔''

اور میرا واقعی یہی خیال تھا۔ جب میں نوعمر تھا تب میرے کتابوں سے رشتے کی بیرونی حد کسی ناقابلِ علاج اثباتیت پرست کی امید پرستی تھی جو یہ سمجھتا ہو کہ وہ علم کے زور پر پوری دنیا پر حکمرانی کر سکتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ میں اس تمام وسیع مطالعے کو ایک روز ایک ناول لکھنے کے کام میں لاؤں گا۔ مجھ میں ژاں پال سارتر کے ناول متلی کے ہیرو کی، جو اپنا استاد خود تھا اور ایک عوامی کتب خانے میں دستیاب ہر کتاب الف سے ے تک پڑھا کرتا تھا، کچھ کچھ خصوصیت پائی جاتی ہے، اور ایلیاس کانیتی کے ناول Auto da Fé کے مرکزی کردار پیٹر کلائن کی بھی جو اپنی کتابوں پر ویسا ہی جارحانہ ناز کرتا ہے جیسا کوئی سپاہی اپنی رجمنٹ پر۔ بورخیس کی تخیلاتی لائبریری میرے نزدیک ایک لامتناہی دنیا کی مابعدالطبیعیاتی فینٹسی نہیں ہے۔ بلکہ یہ وہ کتب خانہ ہے جسے میں، ایک ایک کتاب کر

Scanned with CamScanner

کے، استنبول میں، اپنے مکان میں، تعمیر کرتا رہا ہوں۔ میں نے پندرھویں اور سولھویں صدی میں عثمانی دور کی زرعی معیشت کی قانونی بنیادوں کے بارے میں ایک کتاب جھپٹ کر اٹھالی، اور اس کتاب میں چیتوں کی کھالوں پر عائد ہونے والے محصول کا ذکر پڑھنے ہی سے مجھے معلوم ہوا کہ اُس زمانے میں اناطولیہ میں چیتے دندناتے پھرتے تھے۔ انیسویں صدی کے رومانوی، سیاسی کارکن، محبِ وطن اور ناصحانہ انداز کے شاعر نامق کمال (ترکی کے وکٹر ہیوگو!) کے جلاوطنی میں لکھے ہوئے خطوں کے ضخیم مجموعے کے مطالعے سے مجھے پہلی بار پتا چلا کہ ہمارا داستانی شاعر، اسکول کی کتابوں اور اسکول کے لڑکوں کے مہماتی تصورات کا ہرجا موجود ہیروکس پائے کا گلیر (بدزبان) تھا۔ ایک قیدی پارلیمنٹیرین کی پُرلطف سیاسی یادداشتیں؛ ایک انشورنس بروکر کی زبانی دلچسپ ترین آتش زدگیوں اور کار حادثوں کی روداد؛ ایک رنگین مزاج سفارت کار کی یادداشتیں جس کی بیٹی کبھی میری ہم جماعت رہی تھی — اگر ایسی کوئی بھی کتاب مجھے دکھائی دے جاتی تو میں اسے فوراً خرید لیتا تھا۔

میں کتابوں میں دفن ہو کر زندگی سے دور ہو گیا تھا — لیکن جب مجھے اس کا احساس ہوا تب بھی، گویا جس زندگی سے میں بھاگ رہا تھا اسی سے انتقام لینے کے لیے، میں نے کتابیں خریدنا جاری رکھا۔ اب، اتنے برس گزر جانے کے بعد، میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ وقت کیسی خوشی کا تھا جب میں پرانی کتابوں کی ان سرد دکانوں میں کھڑا دکان کے ملازموں سے دوستی گانٹھا کرتا تھا اور ان کی پیش کی ہوئی چائے پیتے ہوئے کتابوں کے ان اونچے، گردآلود میناروں کا اوپر سے نیچے تک بغور معائنہ کیا کرتا تھا۔

استنبول کے صحاف لار بازار میں واقع قدیم کتب فروشوں کے شیلفوں کا دس برس تک باریک بینی سے جائزہ لینے کے بعد میں نے طے کیا کہ جمہوریہ کے قیام سے 1970 کے عشرے تک لاطینی رسم خط میں چھپی ہوئی ہر کتاب میرے ہاتھ سے گزر چکی ہے۔ کبھی کبھی میں تخمینہ لگاتا کہ اتاترک کے 1928 کے اس فیصلے کے بعد کہ پورے ملک سے عربی رسم خط ہٹا کر لاطینی رسم خط رائج کر دیا جائے، پچاس برس میں کوئی پچاس ہزار کتابیں شائع ہوئی ہوں گی۔ 2008 تک یہ تعداد ایک لاکھ سے ذرا سا آگے پہنچی ہے۔ شاید ایک خفیہ منصوبہ مجھے تحریک دے رہا تھا کہ ان تمام کتابوں کو اپنے کتب خانے میں جمع کروں۔

Scanned with CamScanner

لیکن میرا انتخاب زیادہ تر فوری اور اضطراری نوعیت کا ہوتا تھا۔ ایک ایک کر کے کتابیں خریدنے کا عمل کچھ کچھ ایک ایک اینٹ رکھ کر مکان تعمیر کرنے سے ملتا جلتا ہے۔ 1980 کے عشرے میں میں نے اپنے جیسے کئی افراد کو دیکھا، نہ صرف قدیم کتابوں کی دکانوں میں بلکہ استنبول کے بڑے کتب فروشوں کی دکانوں پر بھی۔ میں اُن لوگوں کی بات کر رہا ہوں جو شام پانچ یا چھ بجے کتابوں کی دکانوں پر آتے ہیں اور پوچھتے ہیں، ''کوئی نئی چیز آئی ہے آج؟'' اور پھر ایک ایک کر کے ان تمام کتابوں کا جائزہ لیتے ہیں جو گزشتہ روز سے اس وقت تک دکان پر آئی ہوں۔

2008 میں تیس برس پہلے کے مقابلے میں کوئی تین گنا تعداد میں کتابیں شائع ہوتی ہیں، لیکن 1980 کے عشرے میں ترکی میں ہر سال اوسطاً ہر سال تین ہزار کتابیں شائع ہوتی تھیں۔ میں ان سب کو دیکھ چکا ہوں، اور ان میں سے نصف ترجمے ہوتے تھے۔ چونکہ بیرون ملک سے منگوائی جانے والی کتابیں نہایت کم ہوتی تھیں، اس لیے میں ان جلد بازی میں اور بے پروائی سے کیے گئے ترجموں ہی کو پڑھ کر یہ سمجھنے کی کوشش کرتا تھا کہ عالمی ادب میں کیا ہو رہا ہے۔

1970 کے عشرے میں ہر کتب فروش کے ہاں سب سے نمایاں مقام ان ضخیم تاریخی جلدوں کو حاصل ہوتا تھا جن میں ترکی کے افلاس اور ''پسماندگی'' اور اس کے معاشرتی اور سیاسی مدوجزر کے اصل اسباب جاننے کی کوشش کی جاتی تھی۔ یہ بلند عزائم رکھنے والی جدید تاریخیں ایک خفگی بھرا لہجہ رکھتی تھیں؛ قدیم عثمانی دور کی تاریخوں کے بالکل برعکس، جنھیں اب جدید ترکی ایڈیشنوں میں کثیر تعداد میں شائع کیا جانے لگا تھا— اور میں ان سب کو بھی خریدتا تھا— جدید تاریخوں میں ہمیں پیش آنے والے المیوں کے لیے خود ہمیں کبھی کچھ زیادہ ذمے دار نہیں ٹھہرایا جاتا تھا۔ بلکہ ہمارے افلاس، ہمارے تعلیم کے فقدان، اور ہماری ''پسماندگی'' کے لیے بیرونی طاقتوں یا ہمارے درمیان موجود چند بداندیش اور بدعنوان افراد کو قصوروار ٹھہرانے کو ترجیح دی جاتی تھی، اور شاید ان کے اس قدر وسیع پیمانے پر پڑھے جانے اور بے صبری سے قبول کیے جانے کی یہی وجہ تھی۔

میں کبھی ایسی کسی تاریخ، ناول یا یادداشت کو پڑھنے سے باز نہ رہ سکا جس میں ہمارے زمانے کی فوجی بغاوتوں اور سیاسی تحریکوں کا، یا سلطنت عثمانیہ کے آخری برسوں میں پیش آنے والی پے در پے فوجی شکستوں کا، یا ہمارے ہاں نمایاں سیاسی افراد کے قتل کے غیر مختتم سلسلے کا (ان میں سے ہر قتل کی

پشت پر کارفرما خفیہ گھناؤنی سازش کے منبع تک)، یا بڑی عالمی طاقتوں کے درمیان ہونے والے بین الاقوامی کھیل کا تجزیہ کیا گیا ہو۔ ریٹائرڈ استادوں کی لکھی ہوئی مختلف شہروں کی تاریخیں، جنھیں ان شہروں کی بلدیہ یا خود مصنف شائع کرتے تھے؛ آدرش پسند ڈاکٹروں، انجینئروں، ٹیکس کلکٹروں، سفارت کاروں اور سیاست دانوں کی یادیں؛ فلمی ستاروں کی سوانح عمریاں؛ شیخوں اور صوفی فرقوں کے بارے میں کتابیں؛ میسن کے بارے میں انکشاف انگیز کتابیں جن میں باقاعدہ نام درج تھے۔ میں ان سب کو خریدتا کیونکہ ان میں ایک قسم کے طربیے کی رمق، زندگی کی جھلک اور حقیقت کا ہلکا سا پرتو، یا اگر یہ سب نہ بھی ہو تو ترکی کا ایک چھوٹا سا جز، ضرور ہوتا تھا۔

جب میں بچہ تھا تو اتاترک کے بارے میں اس کے دوستوں اور قریبی ساتھیوں کی لکھی ہوئی کتابیں پڑھنے کا بہت شوقین تھا۔ یہ اُن لوگوں کی لکھی ہوئی تھیں جو اتاترک کو بہت نزدیک سے جانتے اور اس سے واقعی محبت کرتے تھے؛ اتاترک کی یاد کے تحفظ سے متعلق قانون کے باعث بعد کی پیڑھیوں کے لیے اس کی شخصیت کے انسانی پہلو کے بارے میں کچھ لکھنا نہایت دشوار ہو گیا، چنانچہ اتاترک کی شخصیت کا تاثر تبدیل کر کے اسے ایک مطلق العنان غلبہ پسند حکمران کے روپ میں ڈھال دیا گیا، اور اس کے محترم نام کا، سیاسی جبر اور خوفناک قوانین کو جواز دینے کے لیے، غلط استعمال کیا گیا۔ اس کی ذات کو ایک نارمل انسان کے طور پر کسی ناول کا کردار بنانا یا اس کی کوئی مستند سوانح لکھنا، نتیجے کے طور پر قید میں ڈال دیے جانے کے بغیر، ممکن نہیں۔ اس کے باوصف ہر سال اس کے بارے میں سیکڑوں کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ — اسلام کے متعلق لکھی جانے والی کتابوں کی طرح — عائد کردہ پابندیاں ایک دشوار اور پیچیدہ مسئلے کو سادہ بنا دیتی ہیں اور ان کے مصنفوں کو بڑی سہولت محسوس ہوتی ہے۔

1970 کے عشرے کے وسط میں، جب میں مصور اور آرکیٹیکٹ بننے کے خواب سے دستبردار ہو کر ناول نگار بننے کا فیصلہ کر چکا تھا، ترکی میں ہر سال چالیس سے پچاس تک ناول شائع ہوتے تھے۔ میں ان سب کو دیکھتا اور ان میں سے بیشتر کو یہ سوچ کر خرید لیتا کہ آئندہ کبھی یہ میرے کام آئیں گے؛ اگر میں ان کی ورق گردانی کرنے میں وقت صرف کرتا تو اس لیے نہیں کہ ان میں کوئی ادبی خوبی ہوتی تھی، بلکہ اس لیے کہ میں ان میں ترکی کے گاؤں اور قصبوں کی زندگی کے بیان اور استنبول کی زندگی کی

Scanned with CamScanner

قاشیں پا سکتا تھا۔ 1950 کے عشرے کے ہمارے ممتاز تنقید نگار نوراللہ اُتاچ نے (جو مغربی تہذیب سے، بالخصوص فرانسیسی ثقافت سے، استفادہ کرنے کے ہمارے حق کی ہمیشہ پرزور وکالت کرتا تھا، لیکن اُن نیم خواندہ ادیبوں کی حماقتوں کا مذاق اڑانے سے بھی باز نہ رہتا جو فرانسیسیوں کی نقالی کرتے ہوے ان سے سرزد ہوتی تھیں) ایک بار کہا تھا کہ ہمارے جیسے ملک میں ضروری ہے کہ بازار میں آنے والی کتابوں میں سے کچھ ضرور خریدی جائیں تاکہ مصنفوں اور ناشروں کو سہارا ملے۔ میں نے اس کی اس نصیحت کو گرہ میں باندھ لیا۔

ان کتابوں کو الٹتے پلٹتے ہوے میں خود کو ایک ثقافت، ایک تاریخ کا حصہ محسوس کرتا؛ میں ان کتابوں کے بارے میں سوچا کرتا جو میں آگے چل کر لکھنے والا تھا، اور بہت خوش ہوتا۔ لیکن کبھی کبھی ایک خطرناک بے کیفی مجھے آلیتی۔ کسی کتاب میں ٹائپ کی غلطیوں کی بھرمار، یا مصنف یا ناشر کے بے پروائی کے مظاہرے سے آزردہ ہو کر میری توجہ اِدھر اُدھر بھٹکنے لگتی: میں کوئی ایسی کتاب پڑھ رہا ہوتا جس کا موضوع جزویاتی، حساس اور زیرک تجزیے کا مستحق ہوتا، مگر جب میں دیکھتا کہ مصنف نے عجلت یا غصے یا بے تابی کے ذریعے اس موضوع کو گویا قتل کر ڈالا ہے، تو مجھے بڑی تکلیف ہوتی، اور خود وہ موضوع بھی کسی قدر احمقانہ اور پیش پا افتادہ دکھائی دینے لگتا۔۔۔ مجھ پر اس وقت بھی اداسی طاری ہو جاتی جب کسی احمقانہ، بے وقعت کتاب کو زبردست پذیرائی حاصل ہوتی، یا کوئی نہایت دلچسپ اور مسحورکن کتاب قطعی نظرانداز کر دی جاتی۔۔۔

ایسے واقعات میرے لیے ایک وسیع تر اور زیادہ گہری تشویش کا سبب بن جاتے اور آہستہ آہستہ میں اس گھنے بادل کی تکلیف دہ ٹھنڈک محسوس کرنے لگتا جو مغرب سے باہر کے تمام ادبی ذہن رکھنے والے لوگوں پر، زندگی بھر، چھائی رہتی ہے: اس بات کی بھلا کیا معنویت ہوسکتی ہے کہ پندرھویں اور سولھویں صدی میں اناطولیہ میں چیتے گھوما کرتے تھے؟ آصف خالد چلیبی کی شاعری پر — جس سے ترکی پڑھنے والے بھی بمشکل واقف ہیں — ہندوستانی ادب کے اثرات کی تحقیق سے کیا حاصل ہے؟ پھر میری نظر میں یہ جاننے کی بھی کوئی خاص اہمیت نہ رہتی کہ 6 اور 7 ستمبر 1955 کو استنبول کی گلیوں میں بے قابو ہو کر گھومنے اور یونانی، آرمینی اور یہودی اقلیتوں کے گھروں کو لوٹنے والے ہجوم کو نہ صرف ترکی کی خفیہ ایجنسیوں کی درپردہ حمایت اور عملی مدد حاصل تھی بلکہ برطانیہ بھی، جو قبرص کو یونان

میں شامل ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا تھا، اس کی پشت پناہی کر رہا تھا؛ اور نہ یہ جاننے کی کوئی اہمیت رہتی کہ اتاترک اور شاہ ایران کے درمیان ان کے باسفورس کے سفر کے دوران کیا بات چیت ہوئی۔ مجھے خیال ہوتا کہ جن لوگوں نے ان موضوعات پر تحقیق کر کے ناول اور تاریخ کی کتابیں تحریر کیں انھوں نے محض اپنا وقت ضائع کیا۔

اپنے تاریک ترین دنوں میں میری کیفیت اپنے دوسرے ناول The Silent House کے ہیرو فاروق کی سی ہوتی، جس نے عثمانی دستاویز خانے میں صدیوں پر محیط کاغذات کا مطالعہ کیا تھا اور انھیں اپنے سر میں لیے گھوما کرتا تھا، اس طرح کہ ان میں موجود حقائق میں سے کچھ بھی اس کے ذہن سے محو نہ ہوتا، لیکن اس کے باوجود وہ ان میں سے کسی ایک بھی حقیقت سے کوئی رشتہ قائم نہ کر پاتا: میں اس بارے میں سوچا کرتا کہ ایک پوری تاریخ، ایک پوری تہذیب، ایک پوری زبان کی تفصیلات کو کامیابی سے محفوظ کر لینے کی آخر کیا ''اہمیت'' ہوئی۔ یہ جاننا کتنی اہمیت رکھتا ہے کہ سمرنا میں 1922 میں ہونے والی آتش زنی کا کون ذمے دار تھا؟ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میرے علاوہ صرف چار یا پانچ افراد ایسے ہیں جنھیں 27 مئی 1960 کو فوج کے اقتدار پر قبضے کی اصل وجوہ یا دوسری جنگ عظیم کے بعد جمہوریت پارٹی کے قیام کے حقیقی اسباب جاننے سے دلچسپی ہے۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ ترکی ثقافت پر سیاست کے اثرات بہت زیادہ ہیں؟ یا یہ کہ یہ ملک اپنا بیشتر اظہار سیاست کے ذریعے سے کرتا ہے؟ یا اس کا سبب ہمارا یہ احساس ہے کہ ہم مرکز سے بہت دور ہیں — حاشیے پر رہ رہے ہیں — جس کے باعث ہماری نظر میں اپنے قومی کتب خانے کی کوئی قدر نہیں رہی؟

جب میں ان حقائق پر غور کرتا جو میں نے اتنے شوق سے گھر میں لائی ہوئی کتابوں سے حاصل کیے تھے، اور محسوس کرتا کہ باقی دنیا کے لیے ان حقائق کی ذرا بھی اہمیت نہیں، تو مجھے اپنا آپ خالی اور بے مصرف معلوم ہوتا اور میری ساری مسرت زائل ہو جاتی۔ لیکن اگرچہ بیس بائیس برس کی عمر میں میں اس خیال کے باعث اذیت میں گرفتار رہتا تھا کہ میں اشیا کے مرکز سے بہت دور رہ رہا ہوں، اس کے باوجود یہ امر مجھے اپنے کتب خانے سے بے حد محبت کرنے سے باز نہ رکھ سکتا تھا۔ جب میں تیس برس کی عمر کو پہنچا اور پہلی بار امریکہ گیا، تاکہ دوسرے کتب خانے دیکھوں اور عالمی ثقافت کی پُرمایگی کے روبرو ہو سکوں، تب مجھے یہ دیکھ کر بہت رنج ہوا کہ ترکی ثقافت اور ترکی ادب کے متعلق

واقفیت کتنی کم ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس رنج نے میرے اندر کے ناول نگار کو وہ نظر بخشی کہ وہ کسی ثقافت کے عبوری پہلوؤں اور اس کے اصل جوہر کے درمیان فرق کو زیادہ واضح طور پر دیکھنے کے قابل ہوا، اور میں نے اسے ایک قسم کی تنبیہ کے طور پر قبول کیا: کہ مجھے زندگی پر، اور اپنے کتب خانے پر، زیادہ گہرائی کے ساتھ نظر ڈالنی ہوگی۔

میلان کنڈیرا کے ناول Slowness میں، ایک چیک کردار ہے جو، ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کے دوران کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا جب وہ ''میرے ملک میں کیا حالات ہیں'' کے موضوع پر بات کر سکے؛ نتیجے کے طور پر لوگ اس کا مذاق اڑانے لگتے ہیں۔ اس بات پر ان لوگوں کا تحقیری رویہ اس اعتبار سے درست ہے کہ وہ شخص اپنے ملک کے سوا کسی چیز کے بارے میں نہیں سوچتا اور اپنی انسانیت اور باقی دنیا کی انسانیت کے درمیان کوئی رشتہ دریافت کرنے سے قاصر ہے۔ لیکن جب میں Slowness پڑھ رہا تھا، تب خود کو ان لوگوں کے ساتھ شناخت نہیں کر رہا تھا جو ایک ایسے شخص کے ساتھ حقارت سے پیش آ رہے تھے جو ''میرے ملک'' کے بارے میں بات کرنے سے خود کو باز نہیں رکھ پا رہا تھا— میں خود کو اسی حقارت کا ہدف بننے والے شخص کے ساتھ شناخت کر رہا تھا۔ اس لیے نہیں کہ میں خود وہ مضحک کردار بننے کا خواہش مند تھا، بلکہ اس لیے کہ میں اس کا قطعی خواہش مند نہ تھا۔ یہ بات میری سمجھ میں کہیں 1980 کے عشرے میں آئی کہ اگر میں— اپنے ناول The Black Book کے ہیرو سے چند لفظ مستعار لیتے ہوئے— ''اپنا آپ بننے'' کی آرزو رکھتا ہوں، تو یہ وی ایس نائپال کے نقلچی شخص (mimic man) کی، جو اپنے صوبائی طور طریقوں پر، یا اپنے ڈپریشن پر، قابو پانے کے لیے عجیب حرکتیں کرتا ہے، تضحیک کرنے سے ممکن نہیں ہوگا بلکہ خود کو اس کے ساتھ شناخت کرنے سے ممکن ہوگا۔

ترکی کبھی کوئی مغربی ملک نہیں تھا، چنانچہ جب اتاترک کی ہدایت پر ترکوں نے مغرب کی پیروی شروع کی تو یہ اس قسم کا اذیت ناک، تحقیر انگیز عمل ہرگز نہیں تھا جس قسم کے عمل کا نقشہ کنڈیرا، نائپال اور ایڈورڈ سعید نے کھینچا ہے— یہ عمل ترکی شناخت کا ایک اہم جز بن گیا تھا۔ جہاں تک افروز بے کی حماقتوں کا تعلق ہے— افروز بے محبت اور نفرت کا یکساں ہدف بننے والا ایک کردار ہے جسے ہر مغربی چیز کی آرزو رکھنے کو دکھاوے اور شیخی خوری کے طور پر پیش کرنے کے مقصد سے تخلیق کیا گیا تھا

Scanned with CamScanner

— ترکی قارئین کے لیے یہ کردار ترکی ادب کے وفور کی نمائندگی نہیں کرتا — یہ ہمیں صرف یہ دکھاتا ہے کہ اس کردار کا خالق، ہمارا قوم پرست، مناظرہ باز کہانی کار، عمر سیف الدین (1920-1884)، جو اپنی تحریروں میں بعض مقامات پر نسلی خالص پن جیسے تصورات سے بھی فلرٹ کرتا دکھائی دیتا ہے، مغربیت کو بالائی طبقے کی ایک تحریک کے طور پر دیکھتا تھا جس کا اس کے خیال میں عام لوگوں سے کوئی ربط نہ تھا۔

جب میرا سامنا اس قسم کے تصنع آمیز طرزِ عمل سے ہوتا ہے تو میں خود کو دستوئیفسکی کا ہم خیال پاتا ہوں، جو اُن روسی دانشوروں پر طیش میں آ جاتا تھا جو روس کی بہ نسبت یوروپ سے زیادہ آشنا تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے اُس غصے کا کوئی جواز نظر نہیں آتا جس نے دستوئیفسکی کو ترگنیف کا مخالف بنا دیا تھا۔ اس زاویے سے خود اپنے تجربے کا جائزہ لیتے ہوئے مجھے معلوم ہوتا ہے کہ دستوئیفسکی کی روسی ثقافت اور آرتھوڈوکس رمزیت (mysticism) کی — کیوں نہ ہم اسے روسی کتب خانہ کہہ لیں — مدافعت کی پشت پر ایک غصہ تھا جو صرف مغرب پر نہ تھا بلکہ ان روسی دانشوروں پر بھی تھا جو خود اپنی ثقافت سے آشنائی نہ رکھتے تھے۔

ناول نگاری کے کام میں گزارے ہوئے پینتیس برسوں کے دوران میں نے سیکھا ہے کہ دوسروں کی لکھی ہوئی کتابوں پر، خواہ وہ کتنی ہی احمقانہ، فرسودہ، از کار رفتہ، بے وقوفانہ، خام خیالی پر مبنی یا عجیب وغریب کیوں نہ ہوں، ہنسنا مناسب نہیں، اور نہ انھیں ایک طرف ڈال دینا ٹھیک بات ہے۔ ان کتابوں سے میرے محبت کرنے کا راز شاید یہ نہیں تھا کہ ان کو ٹھیک اسی طرح پڑھا جائے جیسا ان کے مصنفوں کا خیال تھا۔ . . اصل بات یہ تھی کہ ان کتابوں کو — جو عجیب وغریب اور ادنیٰ معیار کی تھیں اور جن میں کہیں کہیں حسن کی حیران کن جھلک بھی دکھائی دے جاتی تھی — اس طرح پڑھا جائے گویا پڑھنے والے نے ان کے مصنف کا سیاق وسباق اختیار کر لیا ہو۔ صوبائیت سے پیچھا چھڑانا اس سے دور بھاگنے سے ممکن نہیں ہوتا، بلکہ اسے اپنا لینے سے۔ اسی طریقے سے میں نے خود کو اپنے رفتہ رفتہ پھیلتے ہوئے کتب خانے میں گم کر دینا سیکھا، اور اسی طریقے سے خود کو اس سے فاصلے پر رکھنا بھی سیکھا۔ چالیس برس کی عمر کو پہنچنے کے بعد ہی مجھے علم ہوا کہ اپنے کتب خانے سے محبت کرنے کی سب سے طاقتور وجہ یہ تھی کہ ترک اور مغرب والے، دونوں اس سے بے خبر تھے۔

Scanned with CamScanner

لیکن اب وہ کہتے ہیں، ''آپ کو نوبیل انعام مل گیا ہے، اور اس سال ترکی فرینکفرٹ کے کتاب میلے کا مہمان خصوصی ہے۔ تو کیا آپ ہمارے لیے اپنے ترکی کتب خانے کو بیان کرنا پسند کریں گے؟'' میں ایسا کرنے پر آمادہ ہوں، تاکہ دوسرے لوگ بھی میرے ترکی کتب خانے سے محبت کرنے لگیں، لیکن جب میں اس فرمائش کی تکمیل کی طرف قدم بڑھاتا ہوں تو مجھے یہ خوف محسوس ہوتا ہے کہ کہیں ایسا کرنے سے میں اس سے خود اپنی محبت نہ کھو بیٹھوں۔ . .

❄❄

پاکستانی اردو کتابیں

خطوط کے آئینے میں (تنقید)
ڈاکٹر انور سدید
قیمت: 250 روپے

خورشید کا سامانِ سفر
(شعرِ اقبال پر کچھ تحریریں)
شمس الرحمٰن فاروقی
قیمت: 195 روپے

منٹو افسانے (جلد اول و دوم)
سعادت حسن منٹو
قیمت: 750 روپے (سیٹ)

فغانِ دلّی
محمد اکرام چغتائی
قیمت: 500 روپے

اس آباد بیاباں میں (کہانیاں)
مظہر الزماں خان
قیمت: 220 روپے

محبت کا محلِ وقوع (نظمیں)
سید کاشف رضا
قیمت: 150 روپے

سرخ رو (آپ بیتی)
ایما گولڈن، ترجمہ: محمد مظاہر
قیمت: 750 روپے

جہاں گرد کی واپسی
(ہومر کے ناول ODYSSEY کا ترجمہ)
ترجمہ: محمد سلیم الرحمٰن
قیمت: 280 روپے

غلام باغ (ناول)
مرزا اطہر بیگ
قیمت: 600 روپے

داستانِ غدر
ظہیر دہلوی، ترجمہ: خواجہ حمید یزدانی
قیمت: 300 روپے

غالب کے چند پہلو (تنقید)
شمس الرحمٰن فاروقی
قیمت: 100 روپے

چوب دار (کہانیاں)
محمد حامد سراج
قیمت: 140 روپے

Scanned with CamScanner

پاکستانی اردو کتابیں

خاک کا رتبہ (کہانیاں)

حسن منظر

قیمت: 120 روپے

گنجفہ (کہانیاں)

نیر مسعود

قیمت: 200 روپے

جو کہانیاں لکھیں (کہانیوں کی کلیات)

اسد محمد خاں

قیمت: 600 روپے

سفید قلعہ (ناول)

اورحان پامک

ترجمہ: محمد عمر میمن

قیمت: 160 روپے

یادوں کی سرگم (خاکے)

مظفر علی سیّد

قیمت: 200 روپے

یادگارِ زمانہ ہیں جو لوگ (شخصی خاکے)

انوار احمد

قیمت: 180 روپے

العاصفہ (کالم)

حسن منظر

قیمت: 180 روپے

تیز بارش کے دوران (نظمیں)

احمد آزاد

قیمت: 150 روپے

دھنی بخش کے بیٹے (ناول)

حسن منظر

قیمت: 600 روپے

پہچان (ناول)

میلان کنڈیرا

ترجمہ: محمد عمر میمن

قیمت: 160 روپے

ادبستان (شخصی خاکے)

نیر مسعود

قیمت: 140 روپے

اردو ادب کی جستجو

رالف رسل

ترجمہ: محمد سرور رجا

قیمت: 350 روپے

Scanned with CamScanner

آج کا اگلا حصہ ارن دھتی رائے (Arundhati Roy) کے ایک لیکچر اور تین مضامین کے ترجموں پر مشتمل ہے۔ ارن دھتی رائے سے آج کے پڑھنے والے بخوبی واقف ہیں؛ ان کے مضامین کئی گزشتہ شماروں میں شائع ہو چکے ہیں۔ موجودہ شمارے میں شامل پہلا مضمون ان کے اس لیکچر کے متن پر مشتمل ہے جو 26 جنوری 2008 کو استنبول میں دیا گیا اور جو ہرانت دنک یادگاری لیکچروں کے سلسلے میں پہلا تھا۔ ہرانت دنک (Hrant Dink) ترکی کی آرمینی برادری سے تعلق رکھنے والے ایک صحافی، کالم نگار اور مدیر تھے جنھیں 19 جنوری 2007 کو استنبول ہی میں سرعام حملہ کر کے قتل کر دیا گیا تھا کیونکہ وہ 1915 میں عثمانی ترکوں کے ہاتھوں آرمینیوں کے قتل عام کے بارے میں ترکی میں خاموشی کی پالیسی پر اظہار خیال کرتے تھے۔ اس قتل عام اور اس سے انکار یا چشم پوشی کرنے کے رویے پر تنقید کرنے کے نتیجے میں ترکی کے معروف ادیب اورحان پامک کو بھی ایک عدالتی مقدمے کا سامنا کرنا پڑا۔ ارن دھتی رائے کی اس تقریر کا متن آؤٹ لک نامی رسالے کے 4 فروری 2008 کے شمارے میں شائع ہوا۔ موجودہ شمارے میں شامل ارن دھتی رائے کے باقی تین مضامین بھی آؤٹ لک ہی کے مختلف شماروں (بالترتیب 30 اکتوبر 2006، یکم ستمبر 2008، اور 22 دسمبر 2008) میں شائع ہوئے۔ یہ چاروں مضامین آج کی دنیا، بالخصوص برصغیر، کے سنگین ترین مسائل کا احاطہ کرتے ہیں اور ان کے بارے میں ایک جامع اور جرأت مندانہ نقطۂ نظر کو سامنے لاتے ہیں، جن سے کسی پڑھنے والے کو مکمل اتفاق نہ ہو تب بھی وہ ان مسائل اور انسانی زندگیوں پر پڑنے والے ان کے نتائج کے بارے میں سوچنے پر ضرور مجبور ہو جاتا ہے۔

Scanned with CamScanner

ارن دھتی رائے

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

ٹڈی دل کی آہٹ
نسل کشی، تردید اور جشن

میں ہرانت ڈنک (Hrant Dink) سے کبھی نہیں ملی۔ یہ ایک ایسی بدقسمتی ہے جو آنے والے وقت میں میرے ساتھ رہے گی۔ اُس کے بارے میں، اس کی تحریروں کے بارے میں، اس نے جو کچھ کہا اور کیا، جس طرح وہ جیا اس کے بارے میں، میں جو کچھ جانتی ہوں، اس سے مجھے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر میں ایک سال پہلے یہاں استنبول میں ہوتی تو ان ایک لاکھ لوگوں میں شامل ہوتی جو اس کا تابوت اٹھائے موت کی خاموشی میں شہر کی سرمائی گلیوں سے گزر رہے تھے، اور ان کے ہاتھوں میں جو بینر تھے ان پر تحریر تھا: ''ہم سب آرمینی ہیں''، ''ہم سب ہرانت ڈنک ہیں''۔ شاید میں نے اپنے ہاتھوں میں جو بینر اٹھا رکھا ہوتا اس پر لکھا ہوتا: پندرہ لاکھ اور ایک۔'' [پندرہ لاکھ ان آرمینی باشندوں کی تعداد ہے جنھیں سلطنت عثمانیہ نے 1915 کے موسم بہار کے دوران اناطولیہ میں ہونے والی منظم نسل کشی میں ہلاک کر دیا تھا۔ آرمینی، جو اس علاقے میں ترک اسلامی اقتدار کے تحت بسنے والی سب سے بڑی عیسائی اقلیت تھے، اناطولیہ میں ڈھائی ہزار برس سے رہ رہے تھے۔]

میں سوچتی ہوں اُس وقت، تابوت کے ساتھ ساتھ چلتے ہوے، کون سے خیالات میرے ذہن سے گزر رہے ہوتے۔ شاید میں اپنے دوست ڈیوڈ برسامیان کی اماں اراکسی برسامیان

(Araxie Barsamian) کی آواز کی گونج میں یہ کہانی سن رہی ہوتی کہ اس پر اور اس کے کنبے پر کیا بیتی تھی۔ 1915 میں وہ دس سال کی تھی۔ اسے ٹڈیوں کا وہ دَل یاد ہے جو ان کے گاؤں دیوبنے میں آ پہنچا تھا۔ یہ گاؤں 'دیکارنا گرت' کے تاریخی شہر کے، جو اَب 'دیار باقر' کہلاتا ہے، شمال میں واقع تھا۔ گاؤں کے عمر رسیدہ لوگ خوفزدہ ہو گئے تھے، اس نے بتایا، کیونکہ وہ اپنی ہڈیوں میں یہ جانتے تھے کہ ٹڈیوں کا آنا برا شگون ہے۔ ان کا خوف درست نکلا؛ انجام چند مہینوں میں سامنے آ گیا، جب کھیتوں میں گیہوں کی فصل کٹائی کے لیے تیار تھی۔

''جب ہم چلے تو ہمارا کنبہ پچیس افراد کا تھا،'' اراکسی برسامیان کہتی ہے۔ ''وہ لوگ سارے مردوں کو لے گئے۔ میرے باپ سے انھوں نے پوچھا، تمھارا اسلحہ کہاں ہے؟ وہ بولا، میں نے بیچ ڈالا۔ اس پر انھوں نے کہا، جاؤ اسے واپس لے کر آؤ۔ تو وہ اسے لینے گرد قصبے میں گیا، وہاں اسے مارا گیا اور اس کے سارے کپڑے لے لیے گئے۔ جب وہ واپس لوٹا —یہ مجھے میری اماں نے بتایا— جب وہ واپس لوٹا، بالکل ننگا، تو اسے قید میں ڈال دیا گیا۔ اس کے بازو کاٹ دیے گئے۔ وہ جیل ہی میں مر گیا۔ اور وہ کھیتوں سے سارے مردوں کو لے گئے، ان کے ہاتھ باندھ دیے، اور گولیاں چلا کر ان میں سے ایک ایک کو مار ڈالا۔''

اراکسی اور اس کے کنبے کی دوسری عورتوں کو جلاوطن کر دیا گیا۔ اراکسی کے سوا ساری عورتیں مر گئیں۔ وہ اکیلی جیتی بچی۔

ظاہر ہے، یہ محض ایک گواہی ہے، اُس تاریخ سے نکل کر آنے والی جس کی ترک حکومت تردید کرتی ہے، اور بہت سے ترک باشندے بھی۔

میں یہاں عالمی دانشور کا روپ دھار کر آپ لوگوں کو لیکچر دینے نہیں آئی ہوں، نہ میں یہاں اس خاموشی کو بھرنے آئی ہوں جو اس ملک میں اُن واقعات کی یاد (یا فراموشی) کے گرد چھائی ہوئی ہے جو 1915 میں اناطولیہ میں پیش آئے تھے۔ ہرانت دِنک نے یہی کرنے کی کوشش کی تھی، اور اس کی قیمت اپنی جان سے ادا کی۔

جس روز میں استنبول پہنچی، اس روز میں نے کئی گھنٹے شہر کی گلیوں میں پیدل چلنے میں گزارے، اور جب میں اپنے اردگرد دیکھتے ہوئے استنبول کے شہریوں پر رشک کر رہی تھی جو اس حسین، پُراسرار،

Scanned with CamScanner

جوش سے بھر دینے والے شہر میں رہتے ہیں، اسی وقت ایک دوست نے اشارے سے مجھے سفید ٹوپیاں پہنے ان نوعمر لڑکوں کی طرف متوجہ کیا جو شہر کے بدن پر اچانک کسی خارش کی طرح ابھر آئے ہیں۔ میرے دوست نے وضاحت کی کہ وہ اس کمسن قاتل کے ساتھ اپنی یک جہتی کا اظہار کر رہے ہیں جس نے ہرانت دنک کو قتل کرتے وقت سفید ٹوپی پہن رکھی تھی۔

استنبول کے، ترکی کے، ان ٹوپی والوں کے ساتھ لڑائی میری لڑائی نہیں ہے — یہ آپ کی لڑائی ہے۔ میری اپنی لڑائیاں ہیں جو مجھے اپنے ملک میں اَور طرح کے ٹوپی والوں اور مشعل والوں کے خلاف لڑنی ہیں۔ ایک لحاظ سے میری اور آپ کی لڑائیاں اتنی مختلف بھی نہیں ہیں۔ لیکن ان دونوں میں ایک نہایت اہم فرق ضرور ہے۔ ترکی میں خاموشی چھائی ہوئی ہے، ہندوستان میں جشن برپا ہے، اور میں نہیں کہہ سکتی کہ ان میں سے کون سی شے دوسری سے بدتر ہے۔

گجرات کی ریاست میں 2002 میں مسلمانوں کی نسل کشی کی گئی تھی۔

میں نسل کشی کا لفظ سوچ سمجھ کر استعمال کر رہی ہوں، اس تعریف کے مطابق جو اقوام متحدہ کے نسل کشی کے جرم کی روک تھام اور سزا کے بارے میں کنونشن کی شق 2 میں درج ہے۔

یہ نسل کشی ایک ریل کے ڈبے کی آتش زنی کے اس ناحل شدہ جرم کی، جس میں 58 ہندو یاتری جل کر ہلاک ہو گئے تھے، اجتماعی سزا دینے کے لیے شروع کی گئی۔ اس جرم کے مفروضہ ردعمل کے محتاط منصوبہ بند قتل عام میں، دن دہاڑے، فاشسٹ ملیشیاؤں کے منظم کردہ مسلح قاتلوں کے ٹولوں نے، جن کو گجرات حکومت اور اس وقت کی انتظامیہ کی پشت پناہی حاصل تھی، دو ہزار مسلمانوں کو ہلاک کر ڈالا۔ مسلمان عورتوں کو گینگ ریپ کرنے کے بعد زندہ جلایا گیا۔ مسلمانوں کی دکانوں اور تجارتی اداروں اور مسجدوں کو منظم طور پر تباہ کیا گیا۔ ڈیڑھ لاکھ کے قریب لوگوں کو ان کے گھروں سے کھدیڑ نکالا گیا۔ ان میں سے بہت سے لوگ اب تک مفلوک الحال بستیوں میں رہ رہے ہیں — جن میں سے بعض کچرے کے ڈھیروں پر بنائی گئی ہیں — جہاں انھیں پانی کی فراہمی اور نکاس، سڑک کی روشنیوں اور علاج معالجے کی کوئی سہولت دستیاب نہیں۔ وہ دوسرے درجے کے شہریوں کی طرح زندہ ہیں اور سماجی اور اقتصادی بائیکاٹ کے شکار ہیں۔ اس دوران قاتلوں کو، جن میں پولیس والے اور شہری دونوں شامل ہیں، گلے لگایا گیا ہے، اور انعامات اور ترقیاں دی گئی ہیں۔ اس صورت حال کو اب 'نارمل'

Scanned with CamScanner

سمجھا جاتا ہے۔ اس 'نارمل پن' پر تصدیق کی مہر لگانے کی غرض سے ہندوستان کے نمایاں ترین صنعت کاروں، رتن ٹاٹا اور مکیش امبانی نے بر سر عام گجرات کو مالی سرمایہ کاری کے لیے نہایت موزوں مقام قرار دیا۔

قومی پریس میں ہونے والا ابتدائی شوروغوغا اب تھم چکا ہے۔ گجرات میں اس نسل کشی کا جشن گجرات کے غرور، ہندو ہونے بلکہ ہندوستانی ہونے کی نمایاں ترین علامت کے طور پر منایا جاتا ہے۔ زہر کے اس آمیزے کو دو بار ریاستی اسمبلی کے انتخابات جیتنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے، اور ان انتخابات کی مہم میں جدیدیت اور جمہوریت کی زبان کو چالاکی کے ساتھ کام میں لایا گیا ہے۔ اس مہم کا قائد، نریندر مودی، ایک قسم کے لوک سورما کا روپ اختیار کر چکا ہے اور بھارتیہ جنتا پارٹی اسے دوسری ریاستوں میں اپنی مہم چلانے کے لیے مدعو کرتی ہے۔

جہاں تک نسل کشی کا تعلق ہے، بلاشبہ گجرات کی نسل کشی کا کانگو، روانڈا اور بوسنیا سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا جہاں ہلاک کیے جانے والوں کی تعداد دسیوں لاکھ تھی، اور اسے ہندوستان میں ہونے والی پہلی نسل کشی بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ (مثال کے طور پر 1984 میں تین ہزار سکھوں کو دلّی کی سڑکوں پر اسی طرح، سزا کے خوف سے آزاد ہو کر، قتل کیا گیا تھا اور قاتلوں کی سرپرستی کانگریس پارٹی نے کی تھی۔) لیکن گجرات میں ہونے والی نسل کشی ایک وسیع تر، زیادہ مفصل اور منظم وژن کا ایک حصہ ہے۔ یہ ہمیں اس بات کا اشارہ دیتی ہے کہ گیہوں کی فصل پکنے والی ہے اور ٹڈیوں کا دل ہندوستان کی سرزمین میں آ پہنچا ہے۔

یہ نسل کشی، یہ ایک قدیم انسانی عادت ہے۔ اس نے تہذیب کے مارچ میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ قدیم ترین ریکارڈ شدہ نسل کشی 149 ق م میں تیسری پیونک جنگ کے خاتمے پر کارتھیج کی تباہی کو سمجھا جاتا ہے۔ یہ لفظ نسل کشی (genocide) 1943 میں رافیل لیمکن (Rafael Lemkin) نے وضع کیا، اور اقوام متحدہ نے اسے 1948 میں، نازیوں کے ہاتھوں ہونے والے ہولوکاسٹ کے بعد اختیار کیا۔ نسل کشی کے جرم کی روک تھام اور سزا کے بارے میں اقوام متحدہ کے کنونشن کی شق 2 میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے:

''کسی قومی، نسلی، یا مذہبی گروہ کو مکمل یا جزوی طور پر ختم کرنے کے ارادے سے درج ذیل

کارروائیوں میں سے کوئی بھی کارروائی کرنا: اس گروہ کے ارکان کو ہلاک کرنا؛ اس گروہ کے ارکان کو سنگین جسمانی یا ذہنی نقصان پہنچانا؛ اس گروہ پر زندگی کے ایسے حالات عائد کرنا جن کا لازمی نتیجہ اس کے مکمل یا جزوی خاتمے کی صورت میں نکلے؛ ایسے اقدامات کرنا جن کے ذریعے سے اس گروہ میں بچوں کی پیدائش کو روکا جائے؛ [یا] اس گروہ کے بچوں کو زبردستی دوسرے کسی گروہ میں منتقل کرنا۔''

چونکہ اس تعریف میں سیاسی اختلاف رکھنے والوں کے ساتھ کی جانے والی حقیقی یا تصوراتی بدسلوکی (persecution) شامل نہیں ہے، اس لیے تاریخ میں کیے جانے والے کئی قتل عام اس کے اطلاق سے باہر رہ جاتے ہیں۔ ذاتی طور پر میں سمجھتی ہوں کہ The History and Sociology of Genocide کے مصنفین فرینک چاک (Frank Chalk) اور کرٹ جوناسون (Kurt Jonassohn) کی وضع کردہ نسل کشی کی تعریف زیادہ موزوں ہے:

نسل کشی، ان دونوں کے مطابق، ''یک طرفہ اجتماعی ہلاکت کی ایسی شکل ہے جس میں کوئی ریاست یا اور کوئی حاکم طاقت کسی گروہ کو ختم کرنے کی دانستہ کارروائی کرتی ہے، اور اس گروہ اور اس کے ارکان کی تعریف نسل کشی کرنے والے متعین کرتے ہیں۔'' اگر اس تعریف کے اعتبار سے دیکھا جائے تو مثال کے طور پر انڈونیشیا میں سوہارتو کے جرائم (دس لاکھ لوگوں کی ہلاکت)، کمبوڈیا میں پول پاٹ کے (پندرہ لاکھ لوگوں کی ہلاکت)، سوویت یونین میں اسٹالن کے (چھ کروڑ لوگوں کی ہلاکت)، اور چین میں ماؤ کے جرائم (سات کروڑ لوگوں کی ہلاکت) کو بھی نسل کشی قرار دیا جائے گا۔

تمام پہلوؤں کو ذہن میں رکھا جائے تو 'صفایا کرنے' (extermination) کا لفظ، جس سے کیڑے مکوڑوں کو بڑی تعداد میں ہلاک کرنے کا تاثر قائم ہوتا ہے، شاید زیادہ ایماندارانہ، زیادہ برمحل ہے۔ جب نسل کشی کا ارتکاب کرنے والے افراد اپنے شکاروں کے روبرو ہوتے ہیں، تو بے دریغ ہلاک کرنے کی کارروائی شروع کرنے سے پہلے، ان کو ضرورت پڑتی ہے کہ ہلاک کیے جانے والوں کے ساتھ اپنا ہر انسانی رابطہ منقطع کر لیں۔ ان کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے شکاروں کو انسانی درجے سے کمتر، کسی طفیلیے کے روپ میں دیکھ سکیں جس کو ختم کرنا سماج کی خدمت قرار دیا جا سکے۔ یہاں مثال کے طور پر 1636 میں جان میسن (John Mason) کی سرکردگی میں کنکٹی کٹ کے

علاقے میں کیے جانے والے پیکوٹ (Pequot) انڈین باشندوں کے قتل عام کی بابت اس بیان پر غور کیجیے:

Those that escaped the fire were slaine with the sword; some hewed to peeces, others rune throw with their rapiers, so they were quickly dispatchte, and very few escaped. It was conceived they thus destroyed about 400 at this time. It was a fearful sight to see them thus frying in the fyre, and the streams of blood quenching the same, and horrible was the stincke and sente thereof, but the victory seemed a sweete sacrifice....

''جو آگ سے بچ نکلے انھیں تلوار سے کاٹا گیا؛ کچھ کو ٹکڑے ٹکڑے کیا گیا، کچھ کو انھیں کی پتلی دودھاری تلواروں سے بیندھ دیا گیا، اس طرح ان کا بہت جلد خاتمہ ہو گیا اور ان میں سے بہت کم باقی بچے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس موقعے پر تقریباً 400 کو ہلاک کیا گیا۔ انھیں آگ میں بھنتے ہوئے دیکھنا، جبکہ ان کا بہتا ہوا خون اسی آگ کو بجھائے دے رہا تھا، خوفزدہ کر دینے والا نظارہ تھا اور وہاں سے اٹھتا ہوا تعفن اور بدبو ناقابل برداشت، لیکن یہ فتح کی خاطر دی جانے والی خوشگوار قربانی معلوم ہوتی تھی۔ . .''

اور اب، تقریباً چار صدیوں بعد، گجرات میں ہونے والی نسل کشی کے مرکزی کرداروں میں سے ایک، بابو بجرنگی کا یہ بیان دیکھیے جو چند ماہ پہلے ہندوستانی رسالے تہلکہ نے خفیہ کیمرے کی مدد سے ریکارڈ کیا تھا:

''ہم نے میاں کی ایک دکان نہیں چھوڑی تھی، سب کو جلا دیا تھا۔ اور ان کو سب کو جلایا تھا، کاٹا تھا۔ . . ہمارا ماننا ہے کہ ان کو جلانا چاہیے، کیونکہ یہ حرامی جلنا نہیں چاہتے، ڈرتے ہیں جلنے سے۔ . . میری بس ایک آخری خواہش ہے۔ . . پھر چاہے پھانسی پر چڑھا دو۔ . . مجھے صرف دو دن چاہییں، میں جوہاپورہ میں جاؤں گا جہاں سات آٹھ لاکھ میاں لوگ رہتے ہیں۔ . . ان سب کو ختم کر دوں گا۔ . . اور مریں، کم سے کم 25000 سے 50000

تک مرنے چاہییں۔۔۔''

مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بابو بجرنگی کو نریندر مودی کا آشیرواد، پولیس کا تحفظ اور عام لوگوں کی محبت حاصل تھی۔ وہ آج بھی گجرات میں ایک آزاد شہری کے طور پر کام کر رہا ہے اور پھل پھول رہا ہے۔ اگر کوئی جرم ہے جس کا اسے قصوروار نہیں ٹھہرایا جاسکتا تو وہ نسل کشی کی تردید ہے۔

نسل کشی کی تردید قدیم، کھلم کھلا نسل پرست اور خون کی پیاسی فتح مندی کے تصور کا بنیادی طور پر بدلا ہوا روپ ہے۔ اسے غالباً اس کسی قدر پارہ پارہ دوہری اخلاقیات کا جواب دینے کے لیے وضع کیا گیا تھا، جو انیسویں صدی میں اس وقت ابھری جب یوروپ جمہوریت، اور اندرون ملک شہریوں کے حقوق کی محدود مگر نئی شکلیں پیدا کر رہا تھا جبکہ اس کے ساتھ ساتھ اپنی نوآبادیوں میں دسیوں لاکھ لوگوں کا صفایا کرنے میں مصروف تھا۔ اچانک ملکوں اور حکومتوں نے اپنی برپا کی ہوئی نسل کشیوں کی تردید کرنا یا انھیں چھپانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ کتاب Hiroshima and America: Fifty Years of Denial کے مصنف پروفیسر رابرٹ جے لفٹن (Robert Jay Lifton) کے لفظوں میں ''تردید کا مطلب دراصل یہ کہنا ہے کہ قاتلوں نے قتل نہیں کیے، ہلاک ہونے والے ہلاک نہیں ہوے۔ تردید کا براہ راست نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس سے مزید نسل کشی کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔''

بلاشبہ آج، جب نسل کشی کی تردید کی سیاست کھلی منڈی سے جاملتی ہے تو ہولوکاسٹ یا نسل کشی کا سرکاری طور پر تسلیم کیا جانا، یا اس کی تردید، ایک کثیر قومی تجارتی معاملہ بن چکا ہے۔ اس کا تعلق تاریخی حقائق یا تفتیشی شہادتوں سے خال خال ہی ہوتا ہے۔ اخلاقیات تو خیر اس معاملے میں داخل ہی نہیں ہوتی۔ یہ انتہائی درجے کی سوداکاری کا جارحانہ عمل ہے جس کا تعلق اقوام متحدہ سے کہیں زیادہ ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن (WTO) سے ہے۔

اس کا سکہ جغرافیائی سیاست ہے، یعنی قدرتی وسائل کی چڑھتی اترتی منڈی، وہ عجیب شے جسے مستقبل کی سودابازی کہا جاتا ہے، اور وہی قدیم خالص معاشی اور فوجی طاقت۔

دوسرے لفظوں میں نسل کشیوں کی تردید کے اسباب بھی وہی ہوتے ہیں جو نسل کشی کے الزام پر قانونی کارروائی کرنے کے۔ یعنی اقتصادی جبریت (determinism) جسے نسلی، مذہبی یا قومی

امتیاز کا لبادہ پہنایا جاتا ہے۔ بھدے لفظوں میں بیان کیا جائے تو تیل کے ایک پیپے (یا ایک ٹن یورینیم) کی قیمت کا چڑھنا یا گرنا، یا کسی فوجی اڈے کے قیام کی منظوری ملنا، یا کسی ملک کی منڈی کا کھولا جانا فیصلہ کن عنصر ہو سکتا ہے۔ جس وقت حکومتوں کو یہ طے کرنا ہو کہ نسل کشی کا ارتکاب واقعی کیا گیا تھا یا نہیں۔

یا یہ کہ نسل کشی کا ارتکاب کیا جائے گا یا نہیں۔ اگر کیا جائے گا تو اس کی رپورٹنگ کی جائے گی یا نہیں، اور اگر رپورٹنگ کی جائے گی تو اسے کون سے زاویے سے پیش کیا جائے گا۔ مثال کے طور پر کانگو میں بیس لاکھ لوگوں کے قتل عام کی تقریباً کوئی رپورٹنگ نہیں کی گئی۔ کیوں؟ اور کیا امریکی حملے سے پہلے عراق پر عائد کی گئی پابندیوں کے نتیجے میں دس لاکھ عراقی بچوں کی ہلاکت نسل کشی تھی (جیسا کہ عراق میں اقوام متحدہ کے انسانی امور کے رابطہ کار ڈینس ہالیڈے کا کہنا ہے) یا یہ امریکی پالیسی کی ''مناسب قیمت'' تھی، جیسا کہ میڈلین آلبرائٹ نے، جو آج کل اقوام متحدہ میں امریکی سفیر ہے، دعویٰ کیا تھا؟ اس سوال کا جواب اس بات پر منحصر ہے کہ اصول کون بنائے گا۔ بل کلنٹن؟ یا وہ عراقی ماں جس کا بچہ ہلاک ہوا؟

چونکہ امریکہ دنیا کا سب سے مالدار اور طاقتور ملک ہے، اس لیے اس نے دنیا کے سب سے بڑے نسل کشی کی تردید کرنے والے (Holocaust-denier) کا اعزاز بھی اپنے قبضے میں کر لیا ہے۔ وہاں آج بھی یومِ کولمبس منایا جاتا ہے، یعنی اس دن کی یاد جب کرسٹوفر کولمبس نے امریکی براعظموں میں قدم رکھا تھا، جو اس ہولوکاسٹ کا آغاز تھا جس نے دسیوں لاکھ مقامی انڈین باشندوں کو، اس براعظم کی اصل آبادی کے تقریباً نوے فیصد حصے کو، مٹا ڈالا۔ (لارڈ ایمبرسٹ وہ شخص تھا جس نے انڈین باشندوں میں چیچک کے جراثیم سے آلودہ کمبل تقسیم کرنے کا خیال پیش کیا تھا، اور اس کے نام پر میساچوسٹس میں ایک یونیورسٹی ٹاؤن آباد ہے، اور لبرل آرٹس کا ایک کالج اس سے موسوم ہے۔)

امریکہ کے دوسرے ہولوکاسٹ میں تقریباً تین کروڑ افریقی باشندوں کو اغوا کر کے غلاموں کے طور پر بیچ ڈالا گیا۔ ان میں سے نصف کے قریب لوگ منتقلی کے دوران ہلاک ہو گئے۔ لیکن اس کے باوجود 2002 میں ڈربن میں نسل پرستی کی مخالفت میں ہونے والی کانفرنس سے امریکی وفد یہ کہہ کر واک آؤٹ کر گیا کہ غلامی اور غلاموں کی تجارت کوئی جرم نہیں تھی۔ ان کا اصرار تھا کہ غلامی اُن

دنوں قانونی طور پر جائز تھی۔ امریکہ نے ٹوکیو، ہیروشیما، ناگاساکی، ڈریسڈن اور ہمبرگ پر کی جانے والی بمباری کو — جس میں لاکھوں شہری ہلاک ہوئے — نسل کشی تو کجا، جرم تک تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ (دلیل یہ دی جاتی ہے کہ حکومت کا ارادہ شہریوں کو ہلاک کرنے کا نہیں تھا۔ یہ دلیل collatoral damage یا "ضمنی تباہی" کے تصور کی تیاری کا ابتدائی مرحلہ تھی۔) دوسری عالمی جنگ کے بعد سے امریکی حکومت نے کھلم کھلا فوجی اقدام کے ذریعے 100 ملکوں میں 400 سے زیادہ مرتبہ، اور خفیہ طور پر چھ ہزار سے زیادہ بار دخل اندازی کی ہے۔ اس تعداد میں ویت نام پر حملہ اور، بلاشبہ نہایت نیک ارادوں کے ساتھ، تیس لاکھ ویت نامی باشندوں کو (یعنی اس ملک کی کل آبادی کے تقریباً دس فیصد حصے کو) ہلاک کرنا بھی شامل ہے۔

ان میں سے کسی بھی کارروائی کو جنگی جرائم یا نسل کشی کے طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا۔

"سوال یہ ہے،" رابرٹ میکنمارا — جس کے کیریئر کا گراف 1945 میں ٹوکیو پر کی جانے والی بمباری سے شروع ہوا جس میں رات بھر میں ایک لاکھ لوگوں کو ہلاک کیا گیا، پھر اسے ویت نام کی جنگ کے منصوبہ ساز کی حیثیت حاصل ہوئی، پھر وہ ورلڈ بینک کا صدر بنا، اور اب اپنے آرام دہ ملک میں اپنے آرام دہ مکان کی آرام دہ کرسی پر بیٹھتا ہے — دریافت کرتا ہے، "سوال یہ ہے، کہ بھلائی کرنے کی غرض سے آپ کو کس حد تک برائی کرنی ہوگی؟"

کیا رابرٹ جے لفٹن کے بیان کردہ نکتے کی — کہ نسل کشی کی تردید مزید نسل کشی کی حوصلہ افزائی کرتی ہے — اس سے زیادہ موزوں مثال مل سکتی ہے؟

اور جب نسل کشی کا شکار ہونے والے لوگ خود دوسروں کی نسل کشی پر اتر آئیں تو؟ (روانڈا میں، کانگو میں؟) اسرائیل کے بارے میں، جسے انسانی تاریخ کی ایک سفاک ترین نسل کشی کے ملبے پر تخلیق کیا گیا تھا، کہنے کو کیا باقی ہے؟ مقبوضہ علاقوں میں اس کے کیے ہوئے اقدامات کے بارے میں کیا کہا جائے؟ اور اس کی روز بروز بڑھتی ہوئی نئی یہودی بستیاں، اس کا پانی پر قبضہ، اس کی نئی 'حفاظتی فصیل' جو فلسطینیوں کو ان کے کھیتوں سے، ان کے روزگار سے، ان کے عزیزوں سے، ان کے بچوں کے اسکولوں سے، اسپتالوں اور علاج کی سہولتوں سے الگ کرتی ہے؟ ماہی خانے میں کی جانے والی یہ سست رفتار نسل کشی اقوام متحدہ کے کنونشن کی شق 2 کی اس ذیلی شق کی مثال پیش کرتی ہے جس میں کہا

گیا ہے کہ کسی بھی ایسی کارروائی کو نسل کشی کہا جائے گا جس کا مقصد کسی ''گروہ پر زندگی کے ایسے حالات عائد کرنا [ہو] جن کا لازمی نتیجہ اس کے مکمل یا جزوی خاتمے کی صورت میں نکلے۔''

نسل کشی کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ یہ کسی معمول سے ہٹی ہوئی شے، کسی انحراف، انسانی نظام کے کسی نقص کا نام نہیں۔

پندرھویں صدی کے بعد سے پیش آنے والی نسل کشی پر مبنی بیشتر ہلاکتیں یوروپ کی جانب سے اُس شے کی تلاش کے عمل کا ناگزیر حصہ رہی ہیں جسے جرمنوں کے استعمال میں آنے والے مشہور لفظ lebensraum یعنی 'رہنے کی گنجائش' کے ذریعے بیان کیا جاتا ہے۔ یہ لفظ ایک جرمن جغرافیہ داں اور ماہر حیاتیات فریڈرک ریٹزل (Freidrich Ratzel) نے اُس شے کو بیان کرنے کے لیے وضع کیا تھا جو اس کے خیال میں دوسروں پر غالب آنے والی انسانی نسل کی فطری خواہش تھی، کہ وہ اپنے علاقے کو توسیع دے، صرف وسیع تر جغرافیائی رقبے کی تلاش میں نہیں بلکہ پھیلنے پھولنے اور پنپنے کی گنجائش کی تلاش میں۔ ایک غالب انسانی نسل کی اس خواہش کی قیمت فطری طور پر کسی نہ کسی مغلوب، کمزور انسانی نسل کو چکانی ہوتی ہے، اور نازی نظریہ سازوں کا خیال تھا کہ ایسی مغلوب، کمزور نسل کو غالب، طاقتور نسل کے لیے جگہ خالی کر دینی چاہیے، یا اسے جگہ خالی کرنے پر مجبور کر دیا جانا چاہیے۔

لیبن سراؤم کے تصور کے مخصوص معنی 1901 میں متعین کیے گئے، لیکن یوروپ اس گنجائش کی تلاش 400 برس پہلے شروع کر چکا تھا جب کولمبس براعظم امریکہ پہنچا۔ یہی تلاش یوروپ والوں کو افریقہ لے کر گئی جہاں ایک کے بعد ایک ہولوکاسٹ برپا کیے گئے۔ جرمنوں نے جنوب مغربی افریقہ میں پوری کی پوری ہیریرو (Herero) آبادی کو ٹھکانے لگا دیا، جبکہ کانگو میں بیلجیم والوں کے ''تجارتی توسیع کے تجربات'' کی قیمت ایک کروڑ جانوں سے ادا کی گئی۔ انیسویں صدی کے آخری چوتھائی حصے تک آتے آتے انگریزوں نے تسمانیہ اور بیشتر آسٹریلیا کے اصل (aboriginal) باشندوں کا صفایا کر دیا تھا۔

Exterminate the Brutes نامی کتاب کے مصنف سوین لنڈکوِسٹ (Sven Lindqvist) کا کہنا ہے کہ ایک ایسی دنیا میں جو اس وقت تک دوسرے یوروپی ملکوں کے درمیان

بانٹی جا چکی تھی، لیبن سراؤم کی تلاش ہی تھی جس نے ہٹلر کو مشرقی یوروپ میں گھسنے اور اس سے آگے روس کی جانب پیش قدمی کرنے پر آمادہ کیا۔ مشرقی یوروپ اور مغربی روس میں آباد یہودی ہٹلر کے ان نوآبادیاتی عزائم کی راہ میں حائل تھے، چنانچہ افریقہ، ایشیا اور شمالی و جنوبی امریکہ کے اصل باشندوں کی طرح انھیں بھی غلام بنانا یا ختم کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ، لنڈکوسٹ کہتا ہے، نازیوں کے ہاتھوں یہودیوں کو انسانوں سے کمتر ثابت کرنے کی نسل پرستانہ کوشش کو محض دیوانگی پر مبنی شرانگیزی کا دورہ قرار دے کر نمٹایا نہیں جا سکتا۔ ایک بار پھر یہ چند جانے پہچانے اجزا پر مشتمل آمیزے کا نتیجہ تھا: اقتصادی جبریت جو پرانے دور کے نسل پرستی کے غلاف میں اچھی طرح لپیٹی گئی تھی، بالکل اسی طرح جیسی اس وقت کی مضبوط یوروپی روایت تھی۔

یہ کوئی اتفاق نہیں کہ جس سیاسی پارٹی نے سلطنت عثمانیہ کے دور میں آرمینیائیوں کی نسل کشی کی کارروائی کی، اس کا نام کمیٹی فار یونین اینڈ پروگریس (یعنی ''انجمن اتحاد و ترقی'') تھا۔

''یونین''، یعنی نسلی/لسانی/مذہبی/قومی اتحاد اور ''پروگریس''، یعنی اقتصادی جبریت — یہ دونوں طویل عرصے سے نسل کشی کو متعین کرنے والے دو زاویے رہے ہیں۔

تاریخ کے مطالعے سے لیس ہو کر اس امر پر فکرمند ہونا معقول بات ہے کہ کوئی ملک جو ''ترقی'' کی دہلیز پر کھڑا ہو، کیا وہ نسل کشی کی دہلیز پر بھی کھڑا ہوتا ہے؟ کیا ایسا ممکن ہے کہ ہندوستان، جسے دنیا بھر میں ترقی اور جمہوریت کے معجزے کے طور پر سراہا جا رہا ہے، نسل کشی کا ارتکاب کرنے کی دہلیز پر کھڑا ہو؟ ایسا کوئی بھی خیال نہایت عجیب و غریب معلوم ہوگا اور وقت کے اِس مقام پر نسل کشی کا لفظ کرنا یقیناً نامناسب ہوگا۔ لیکن اگر ہم مستقبل پر نگاہ ڈالیں، اور اگر ترقی کے شہنشاہ اپنے ہی پروپیگنڈے پر یقین کرتے ہوں، اگر وہ واقعی سمجھتے ہوں کہ ان کے منتخب کردہ ترقی کے ماڈل کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں، تب انھیں ناگزیر طور پر لوگوں کو ہلاک کرنا ہوگا، اور بڑی تعداد میں ہلاک کرنا ہوگا، تاکہ وہ اس راستے پر آگے بڑھ سکیں۔

چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں جوں جوں خبریں پہنچتی جا رہی ہیں، یہ بات واضح ہوتی جا رہی ہے کہ لوگوں کو ہلاک کرنے اور ان کے دم توڑنے کا عمل شروع ہو چکا ہے۔

1989 میں، سوویت یونین کے انہدام کے کچھ ہی عرصے بعد، ہندوستان کی حکومت نے

Scanned with CamScanner

ناوابستہ ملکوں کی تحریک (Non-Aligned Movement) کی رکنیت ترک کر کے ''مکمل طور پر وابستہ'' (Completely Aligned) اتحاد کی رکنیت حاصل کرنے کے ارادے کا اظہار کر دیا اور خود کو اکثر موقعوں پر اسرائیل اور امریکہ کا ''فطری حلیف'' قرار دینا شروع کر دیا۔ (ان تینوں میں کم از کم ایک چیز ضرور مشترک ہے: تینوں کھلم کھلا، نئے نوآبادیاتی انداز کے فوجی قبضے میں ملوث ہیں — ہندوستان کشمیر میں، اسرائیل فلسطین میں اور امریکہ عراق میں۔)

بالکل گھڑی کی دو سوئیوں کی طرح دونوں قومی سیاسی پارٹیوں، بھارتیہ جنتا پارٹی اور کانگریس، نے اتحاد اور ترقی کے ہندوستانی روپ پر مبنی مشترکہ پروگرام پر عمل درآمد شروع کر دیا، جس کا جدید، مہذب نام نیشنلزم اور ڈویلپمنٹ ہے۔ ہر کچھ عرصے بعد، خاص طور پر انتخابات کے دوران، دونوں پارٹیاں آپس میں خاندانی جھگڑے کرنے کا پُرشور ناٹک رچاتی ہیں، لیکن اب اپنے ناراض رشتہ داروں، مثلاً کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (مارکسسٹ) تک کو اپنے گروہ میں شامل کرنے میں کامیاب ہو چکی ہیں۔

یونین یعنی اتحاد کا منصوبہ ہندو قوم پرستی کے نظریے کو سامنے لاتا ہے (جس کا مقصد ہندو ووٹ کو متحد کرنا ہے جو، آپ بھی مانیں گے، ہندوستان جیسی عظیم جمہوریت کے لیے نہایت ضروری ہے)۔ پروگریس یعنی ترقی کے منصوبے کا ہدف سالانہ دس فیصد کی شرح نمو حاصل کرنا ہے۔ لیکن یہ دونوں منصوبے نسل کشی کے امکانات سے پُر ہیں۔

یونین والا منصوبہ زیادہ تر آر ایس ایس کو سونپا گیا ہے، جو بی جے پی اور اس کی مسلح ملیشیاؤں (وشو ہندو پریشد اور بجرنگ دَل) کا نظریاتی قلب، ان کی ہولڈنگ کمپنی ہے۔ آر ایس ایس 1925 میں قائم کی گئی تھی۔ 1930 تک آتے آتے اس کے بانی ڈاکٹر ہیڈ گیور نے، جو بینیٹو مسولینی کا پرستار تھا، اس تنظیم کو کھلم کھلا اطالوی فاشزم کی صورت پر ڈھالنا شروع کر دیا تھا۔ ہٹلر کے بھی اثرات موجود تھے، اور ہیں۔ آر ایس ایس کی انجیل، یعنی 1940 میں آر ایس ایس کے سربراہ کے طور پر ہیڈ گیور کی جگہ لینے والے ایم ایس گولوالکر کی کتاب We or Our Nationhood Defined سے چند اقتباسات:

اس منحوس دن سے لے کر جب مسلمانوں نے ہندوستان میں قدم رکھا، آج اس وقت

تک، ہندو قوم دلیری کے ساتھ ان ملیچھوں (despoilers) کا مقابلہ کرتی آ رہی ہے۔ نسلی جذبہ ہمیشہ بیدار رہا ہے۔

اور پھر:

ہندوستان، یعنی ہندوؤں کے دیس میں، ہندو قوم بستی ہے اور اسی کو بسنا چاہیے۔۔۔ باقی سب قومی مقصد کے دشمن اور غدار ہیں، یا اگر نرم دلی کی نظر سے دیکھا جائے تو احمق ہیں۔۔۔

ہندوستان میں بیرونی نسلیں۔۔۔ ملک میں صرف اسی صورت میں رہ سکتی ہیں جب وہ ہندو قوم کے غلبے تلے ہوں، کسی شے پر دعویٰ نہ کریں، ترجیحی سلوک تو کجا، کسی رعایت کی بھی مستحق نہ ہوں، یہاں تک کہ شہریوں کے حقوق بھی انھیں حاصل نہ ہوں۔

اور آگے چل کر:

اپنی نسل اور تہذیب کا خالص پن قائم رکھنے کے لیے، جرمنی نے اپنے ملک کو سامی نسل والوں یعنی یہودیوں سے پاک کر کے دنیا کو چونکا دیا ہے۔ یہاں نسلی تفاخر اپنے بلند ترین درجے میں ظاہر ہوا ہے۔۔۔ ہم ہندوستانیوں کو اس مثال سے سیکھنا اور فائدہ اٹھانا چاہیے۔

(آپ اس قسم کی منظم نفرت کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں؟ سیکولر محبت کی سادہ ذہن تلقینوں سے تو ہرگز نہیں۔)

سنہ 2000 تک آتے آتے آر ایس ایس کی پینتالیس ہزار سے زیادہ شاکھائیں قائم ہو چکی تھیں اور ستر لاکھ سویم سیوکوں کی فوج پورے ہندوستان میں اس کے نظریے کا پرچار کرنے میں مصروف تھی۔ سابق وزیر اعظم ہندوستان اٹل بہاری واجپائی، سابق وزیر داخلہ اور موجودہ قائد حزب اختلاف ایل کے آڈوانی، اور بلاشبہ تین مرتبہ گجرات کا وزیر اعلیٰ بننے والا نریندر مودی بھی ان سویم سیوکوں میں شامل تھے۔ ان میں ذرائع ابلاغ، پولیس، فوج، انٹیلی جنس ایجنسیوں، عدلیہ اور انتظامی سروسز کے سینئر افراد بھی شامل تھے جو آر ایس ایس کے نظریے یعنی ہندتو (Hindutva) پر غیر رسمی عقیدہ رکھتے ہیں۔ سیاست دانوں کے برخلاف، جو آتے جاتے رہتے ہیں، یہ لوگ سرکاری مشینری کا

Scanned with CamScanner

مستقل حصہ ہیں۔

لیکن آر ایس ایس کی اصل طاقت اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ اس نے کئی دہائیوں تک سخت محنت کی ہے اور سماج کی ہر سطح پر مختلف قسم کی تنظیموں کا جال پھیلا دیا ہے، اور یہ وہ کام ہے جسے کرنے کا کوئی اور تنظیم دعویٰ نہیں کر سکتی۔

بی جے پی اس کا سیاسی بازو ہے۔ اس کے پاس ایک ٹریڈ یونین تنظیم (بھارتیہ مزدور سنگھ)، ایک عورتوں کی تنظیم (راشٹریہ سیوِکا سمیتی)، ایک طلبہ تنظیم (اکھل بھارتیہ وِدیارتھی پریشد)، اور ایک اقتصادی بازو (سودیشی جاگرن منچ) ہے۔ اس کی فرنٹ تنظیم وِدیا بھارتی ہندوستان کے غیر سرکاری شعبے میں قائم سب سے بڑی تعلیمی تنظیم ہے۔ یہ تنظیم تیرہ ہزار تعلیمی ادارے چلاتی ہے جن میں سرسوتی ودیامندر نامی اسکول بھی شامل ہیں جن میں ستر ہزار استاد سترہ لاکھ سے زیادہ شاگردوں کو تعلیم دیتے ہیں۔ اس کی تنظیموں میں آدی واسی قبائلیوں کے ساتھ کام کرنے والی وَن واسی کلیان آشرم، ادبی میدان میں سرگرم اکھل بھارتیہ ساہتیہ پریشد، دانشوروں میں کام کرنے والی پراگیہ بھارتی اور دین دیال ریسرچ انسٹیٹیوٹ، تاریخ دانوں میں کام کرنے والی بھارتیہ اِتہاس سنکلن یوجنالیہ، زبان کے میدان میں سرگرم سنسکرت بھارتی، پسماندہ بستیوں میں رہنے والوں کے ساتھ کام کرنے والی سیوا بھارتی، ہندو سیوا پرتشٹھان، صحت کے شعبے میں سرگرم سوامی وویکانند میڈیکل مشن اور نیشنل میڈیکوز آرگنائزیشن، جذام کے مریضوں میں کام کرنے والی بھارتیہ کشٹھا توارن سنگھ، کوآپریٹوز میں کام کرنے والی سہکار بھارتی، اخبارات اور پروپیگنڈا کا دیگر مواد شائع کرنے والی بھارت پرکاشن، سُروچی پرکاشن، لوک ہت پرکاشن، گیان گنگا پرکاشن، ارچنا پرکاشن، بھارتیہ وکاس سادھنا، سادھنا پستک اور آکاش وانی سادھنا، ذات پات کی ہم آہنگی کے سلسلے میں کام کرنے والی ساماجک سمرست منچ، دھرم اور دھرم پرچار سے متعلق وویکانند کیندر، وشو ہندو پریشد، ہندو جاگرن منچ، بجرنگ دل) شامل ہیں۔ اور یہ فہرست آگے، اور آگے چلتی جاتی ہے...

11 جون 1989 کو کانگریسی وزیر اعظم راجیو گاندھی نے آر ایس ایس کو ایک تحفہ دیا۔ اس نے سخاوت دکھاتے ہوئے ایودھیا کی متنازع بابری مسجد کے، جو آر ایس ایس کے دعوے کی رو سے رام کا جنم استھل تھی، دروازوں پر لگے تالے کھلوا دیے۔ بی جے پی کی نیشنل ایگزیکٹو کے اجلاس میں

Scanned with CamScanner

پارٹی نے ایودھیا کی اس مسجد کو مسمار کر کے اس کی جگہ مندر تعمیر کرنے کے حق میں ایک قرارداد منظور کی۔ ''مجھے یقین ہے کہ اس قرارداد کا نتیجہ ووٹوں کی صورت میں نکلے گا'' ایل کے آڈوانی نے کہا۔ 1990 میں وہ اپنے آتشیں رتھ پر سوار ہو کر پورے ملک کو روندتا ہوا گزرا اور اپنے پیچھے فسادات اور خونریزی چھوڑتا ہوا گیا۔ 1991 کے لوک سبھا کے انتخابات میں پارٹی نے 120 نشستیں حاصل کیں (1984 میں اسے دو نشستیں ملی تھیں)۔ آڈوانی کا پیدا کیا ہوا ہسٹیریا 1992 میں اس وقت اپنے عروج کو پہنچا جب مسجد کو ایک منظم غارت گر ہجوم نے مسمار کر دیا۔ 1998 تک پارٹی مرکز میں اقتدار میں آ چکی تھی۔ اقتدار حاصل کرنے کے بعد اس کے اولین اقدامات میں سے ایک نیوکلیئر اسلحے کی آزمائشوں کا ایک سلسلہ تھا۔ ملک کے طول و عرض میں فاشسٹوں اور کارپوریٹوں نے، مالداروں اور مفلسوں نے مل کر ہندوستان کے ہندو بم کا جشن منایا۔ ہندوتوا اب نچلے درجے کی پارٹی سیاست سے بلند ہو چکا تھا۔

2002 میں نریندر مودی کی حکومت نے گجرات میں مسلمانوں کی نسل کشی کا منصوبہ بنا کر اس پر عمل درآمد کیا۔ اس نسل کشی کے چند ماہ بعد منعقد ہونے والے ریاستی اسمبلی کے انتخابات میں اسے بھاری اکثریت سے منتخب کیا گیا۔ اس نے نسل کشی کے ارتکاب میں حصہ لینے والوں کو کوئی گزند نہ پہنچنے دی۔ اکا دکا معاملوں میں جہاں کہیں کسی کو سزا سنائی بھی گئی تو کٹہرے میں کھڑے ہونے والے بلاشبہ نہایت نچلے درجے کے کارکن تھے نہ کہ منصوبہ ساز۔

سزا سے آزادی نسل کشی کے دوران ہونے والی ہلاکتوں کی ضروری شرط ہے۔

ہندوستان میں لوگوں کو کثیر تعداد میں قتل کرنے والوں کو سزا سے محفوظ رکھنے کی ایک عظیم روایت موجود رہی ہے۔ اس کی مثالیں اتنی ہیں کہ میں ان سے کئی جلدیں بھر سکتی ہوں۔

کسی جمہوری ملک میں نسل کشی کے مجرموں کو سزا سے محفوظ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ''تھرو پراپر چینل'' کام کیا جائے۔ مقررہ ضابطے کی پابندی ہی سب کچھ ہے۔ قتل عام کے کئی معاملوں میں گجرات حکومت نے جو سرکاری وکیل مقرر کیے وہ دراصل پہلے ہی ملزموں کی طرف سے پیش ہو چکے تھے۔ ان وکیلوں میں سے بہت سوں کا تعلق آر ایس ایس یا وی ایچ پی سے تھا اور وہ ان لوگوں سے کھلی مخاصمت رکھتے تھے جن کی نمائندگی ان کے ذمے ڈالی گئی تھی۔ قتل عام میں زندہ بچ جانے والے

گواہوں نے پایا کہ جب وہ رپورٹ لکھوانے پولیس کے پاس گئے تو پولیس نے ان کے بیانات درست طور پر درج نہیں کیے یا قتل عام میں شریک لوگوں کے نام درج کرنے سے انکار کر دیا۔ کئی معاملوں میں جبکہ زندہ بچنے والوں نے اپنے خاندان کے افراد کو قتل ہوتے دیکھا تھا (یا زندہ جلائے جاتے ہوئے تاکہ ان کی لاشیں نہ مل سکیں)، پولیس نے قتل کے مقدمے درج کرنے سے انکار کر دیا۔

کانگریس کے سیاست داں اور شاعر احسان جعفری کو، جن کا قصور یہ تھا کہ انھوں نے نریندر مودی کے خلاف راجکوٹ کے انتخابات میں مہم چلائی تھی، سرعام بہیمانہ طور پر قتل کیا گیا۔ (اور قاتل ہجوم کی قیادت ان کا کانگریس ہی کا ایک ساتھی سیاست داں کر رہا تھا۔) اس بہیمیت میں حصہ لینے والے ایک شخص کے لفظوں میں:

> پانچ آدمیوں نے اسے پکڑ رکھا تھا، ایک نے تلوار ماری... اس کا ہاتھ کاٹ ڈالا، پھر ٹانگیں کاٹیں... پھر ٹکڑے ٹکڑے کر کے لکڑیوں کے ڈھیر پر ڈال کر جو انھوں نے جمع کر رکھا تھا آگ لگا دی۔ اسے زندہ جلا دیا۔

احمد آباد کے پولیس کمشنر پی سی پانڈے نے موقع واردات کا دورہ کرنے کی مہربانی اس وقت کی جب ہجوم جعفری کو ٹکڑے ٹکڑے کر چکا تھا، ستر اور لوگوں کو قتل کر چکا تھا اور بارہ عورتوں کو گینگ ریپ کے بعد زندہ جلا چکا تھا۔ مودی کے دوبارہ منتخب ہونے کے بعد پانڈے کو ترقی دے کر گجرات پولیس کا ڈائرکٹر جنرل بنا دیا گیا۔ قتل عام کی مرتکب پوری مشینری اپنی جگہ اب بھی موجود ہے۔

دلّی میں سپریم کورٹ نے کچھ دھمکی آمیز آوازیں ضرور نکالیں، لیکن آخرکار پورے معاملے کو سردخانے میں ڈال دیا۔ کانگریس اور کمیونسٹ پارٹیوں نے شور بہت مچایا لیکن کیا کچھ نہیں۔

تہلکہ رسالے کی تیار کی ہوئی خفیہ وڈیو ریکارڈنگز میں، جو حال ہی میں ایک ٹی وی چینل پر نشر کی گئیں، بابو بجرنگی کے علاوہ دوسرے قاتلوں نے بھی ایک کے بعد آکر بتایا کہ نسل کشی کا منصوبہ کیسے تیار کیا گیا اور کس طرح اس پر عمل درآمد کیا گیا، کیسے مودی اور سینئر سیاست کار اور پولیس افسر اس میں ذاتی طور پر ملوث رہے۔ ان میں سے کوئی بھی اطلاع نئی نہیں تھی، لیکن اب یہ قاتل افراد ٹی وی نیوز نیٹ ورک پر آکر نہ صرف اپنے جرائم کا اعتراف کر رہے تھے بلکہ انھیں فخر سے بیان کر رہے تھے۔ اس پر ہونے والا عوامی ردعمل اشتعال کا نہیں تھا بلکہ ان ریکارڈنگز کے سامنے آنے کے وقت کے

Scanned with CamScanner

بارے میں شبہات پر مشتمل تھا۔ بہت سے لوگوں کو یقین تھا کہ اس انکشاف سے مودی کو اگلے انتخابات جیتنے میں مدد ملے گی۔ کچھ لوگ اس نہایت عجیب وغریب خیال پر بھی یقین کر رہے تھے کہ اس انکشاف کے پیچھے مودی ہی کا ہاتھ ہے۔ انتخابات بلاشبہ اسی نے جیتے۔ اور اس بار یونین اور پروگریس کے ٹکٹ پر۔ وہ خود اپنی ذات میں پوری انجمنِ اتحاد و ترقی ہے۔ بی جے پی کے جلسوں میں مودی کے ہزاروں پرستار اب پلاسٹک کے بنے مودی کی شکل کے ماسک پہنے موت کے نعرے لگاتے ہیں۔ یہ فاشسٹ ڈیموکریٹ اب حقیقی معنوں میں لاکھوں چھوٹے چھوٹے فاشسٹوں میں منقلب ہو چکا ہے۔ یہ جمہوریت کی مسرتیں ہیں — نازی جرمنی میں ہٹلر کی شکل کا ماسک پہننے کی کس کو مجال ہو سکتی تھی؟

کئی ریاستوں میں جہاں بی جے پی کی حکومت ہے، اڑیسہ، چھتیس گڑھ، جھارکھنڈ، راجستھان، مدھیہ پردیش اور کرناٹک، وہاں گجرات کے منصوبے کو دہرانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

نسل کشی کا ارتکاب کرنے کے لیے، امریکی نسل کشی کے عالم پیٹر بالکیان (Peter Balkian) کا کہنا ہے، ضروری ہے کہ نشانہ بنائے جانے والے ذیلی گروہ کو بہت طویل عرصے تک حاشیے پر رکھا جائے۔ ہندوستان میں یہ شرط اچھی طرح پوری کی جا چکی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کو منظم طور پر حاشیے پر رکھا گیا ہے، اور وہ اب آدی واسیوں اور دلتوں میں شامل ہو چکے ہیں جن کو ذات پات کے نظام میں شامل ہندوؤں کے سماج اور اس کے مذہبی متون نے برسوں، صدیوں نہ صرف حاشیے پر رکھا بلکہ انسانوں سے کمتر درجہ دیا۔ (ایک وقت تھا جب ان کو انسانوں سے کمتر درجہ اس غرض سے دیا جاتا تھا تاکہ وہ ایسے کام انجام دینے پر مجبور کیے جا سکیں جو اونچی ذات کے ہندو کرنے پر تیار نہ تھے۔ اب، ٹیکنالوجی کے ترقی کے نتیجے میں، وہ مزدوری بھی فالتو ہو گئی ہے۔) آر ایس ایس کے کام کا ایک حصہ دلتوں کو مسلمانوں کے سامنے صف آرا کرنا ہے۔

جس وقت 'عوام' اتحاد کے منصوبے اور اس سے منسلک نفرت کے نظریے کے ساتھ مشغول تھے، ہندوستان کا ترقی کا منصوبہ بھی قدم بہ قدم آگے بڑھ رہا تھا۔ پرائیویٹائزیشن اور لبرلائزیشن کی نئی پالیسیوں کا نتیجہ ملک کے قدرتی وسائل اور عوامی انفراسٹرکچر کی پرائیویٹ کارپوریشنوں کے ہاتھ فروخت کی صورت میں نکلا۔ اس سے ایک ناقابلِ تصور حد تک مالدار بالائی طبقے اور بڑھتے ہوئے درمیانہ طبقوں کی تخلیق ہوئی ہے جو فطری طور پر نئے نظام کے متشدد حامی بن گئے ہیں۔

Scanned with CamScanner

ترقی کا منصوبہ سزا سے محفوظ رہنے اور اقبال جرم سے بچنے کی حیلہ سازی کی اپنی روایت رکھتا ہے جو اتحاد کے منصوبے والی پیچیدہ مشینری سے کم ہولناک نہیں۔ اس کے قلب میں ہندوستان کا سب سے طاقتور ادارہ سپریم کورٹ واقع ہے، جو نہایت سرعت سے کارپوریٹ طاقت کا ستون بنتا جا رہا ہے۔ اس عدالت سے ڈیموں کی تعمیر، دریاؤں کو باہم منسلک کرنے کے منصوبوں، بے لگام کان کنی، جنگلوں اور بہتے پانی کے نظاموں کی تباہی کی تائید میں حکم پر حکم جاری ہو رہا ہے۔ اس پورے عمل کو ماحول کشی (ecocide) کے طور پر بیان کیا جا سکتا ہے، جو شاید نسل کشی کا پیش خیمہ ہے۔ (اور عدالت پر تنقید کرنا جرم ہے جس کی سزا قید کی صورت میں دی جا سکتی ہے۔)

ستم ظریفی یہ ہے کہ کھلی منڈی کے دور نے علیحدگی کی ایسی کامیاب ترین تحریک کو راہ دی کہ ایسی تحریک ہندوستان میں اس سے پہلے کبھی نہ اٹھی تھی۔ اس کامیاب تحریک کے نتیجے میں بالائی اور درمیانہ طبقات باقی ملک سے الگ ہو کر اوپر خلا میں واقع اپنے ہی ایک ملک میں جا بسے جہاں وہ دنیا کے اشرافیہ طبقے میں گھل مل گئے ہیں۔ یہ آسمانی سلطنت اپنے آپ میں ایک پوری کائنات ہے جسے باقی ہندوستان سے سربند طور پر علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ اس کے اپنے اخبارات ہیں، اپنی فلمیں، اپنے ٹی وی پروگرام، morality plays، اپنے ٹرانسپورٹ کے نظام، اپنے شاپنگ مال اور اپنے دانشور۔ اور مبادا کہ آپ سمجھنے لگیں کہ یہاں سب کچھ مسرتوں پر مشتمل ہے، ایسا ہرگز نہیں۔ اس کے اپنے المیے ہیں، اپنے ماحولیاتی مسائل ہیں (پارکنگ کی مشکلات، شہروں میں ہوا کی آلودگی)، اپنی طبقاتی کشمکشیں ہیں۔ مثال کے طور پر یوتھ فار اکوالٹی (Youth for Equality) نے ریزرویشن کا مسئلہ اٹھایا ہے کیونکہ اس کے خیال میں اونچی ذاتیں ہندوستان کی پسی ہوئی نچلی ذاتوں کے ہاتھوں امتیازی سلوک کا نشانہ بن رہی ہیں۔ اس دنیا کی اپنی عوامی تحریکیں اور اپنے کینڈل لائٹ وِجل ہیں (Justice for Jessica، یعنی جیسیکا نامی اس ماڈل گرل کے لیے انصاف جسے ایک مے خانے میں گولی مار کر قتل کر دیا گیا تھا)۔ یہاں تک کہ اس دنیا کی اپنی عوامی کار بھی ہے (جسے پچھلے ہی دنوں ''ویگن فار دی فوکس'' کے نام سے ٹاٹا گروپ نے متعارف کرایا ہے)۔ اس کے اپنے خواب بھی ہیں جو ٹی وی اشتہاروں کے روپ میں ظاہر ہوتے ہیں جن میں ہندوستانی سی ای او (جن کے چہرے فیئر اینڈ لولی، مردانہ، سے لپے ہوتے ہیں) بین الاقوامی کارپوریشنوں کو خریدتے دکھائے

Scanned with CamScanner

جاتے ہیں جن میں ایک تصوراتی ایسٹ انڈیا کمپنی بھی شامل ہے۔ انھیں ان کے عالیشان نئے دفتروں کے دروازوں پر چاپلوس سفید فام عورتیں خوش آمدید کہتی ہیں (جن کو دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ بستر پر لے جائے جانے کی آرزو مند ہیں، جو فتح کا سب سے اونچا انعام ہے)، اور ان کا استقبال کرنے والوں میں سفید فام مرد بھی ہیں جو نئے بادشاہوں کے لیے راستہ چھوڑنے پر آمادہ ہیں۔ اس دوران اس کی جیپ میں ٹھنسا ہوا ہجوم نعرے لگاتا ہے: ''انڈیا! انڈیا!''

لیکن یہاں ایک مشکل درپیش ہے، اور وہ مشکل ہے لیبن سراؤم کی۔ اس آسمانی سلطنت کو اپنی زمینی گنجائش کب نصیب ہوگی؟ آسمان کے شہری قدیم ملک پر نگاہ ڈالتے ہیں۔ انھیں وہاں آدی واسی دکھائی دیتے ہیں جو اڑیسہ میں باکسائٹ کے پہاڑوں پر، جھارکھنڈ اور چھتیس گڑھ میں کچ لوہے کی کانوں پر بیٹھے ہیں۔ انھیں نندی گرام کے لوگ (مسلمان، دلت) نظر آتے ہیں جو انتہائی قیمتی زمین پر بیٹھے ہیں، جسے دراصل کیمیائی صنعتوں کا مرکز ہونا چاہیے۔ انھیں ہزاروں ایکڑ پر پھیلی زرعی فارموں کی زمین دکھائی دیتی ہے، اور وہ سوچتے ہیں: یہاں تو ہماری صنعتوں کے لیے اسپیشل اکنامک زون (SEZ) قائم ہونے چاہئیں؛ وہ سنگور کے زرخیز کھیتوں کو دیکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ یہاں تو درحقیقت عوامی کار بنانے کا کارخانہ قائم ہونا چاہیے۔ وہ سوچتے ہیں: یہ ہمارا باکسائٹ ہے، ہمارا کچ لوہا، ہمارا یورینیم — یہ لوگ ہماری زمین پر بیٹھے کیا کر رہے ہیں؟ ہمارا پانی ان کے دریاؤں میں کیا کر رہا ہے؟ ہماری عمارتی لکڑی ان کے پیڑوں میں کیا کر رہی ہے؟

اگر آپ ہندوستان کے جنگلوں، اس کی معدنی دولت اور اس کے آدی واسی باشندوں کے وطن کے نقشے پر نظر ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ تینوں ایک ڈھیر کی صورت اوپر تلے رکھے ہوئے ہیں۔

چنانچہ، حقیقت یہ ہے کہ ہم جنھیں غریب کہتے ہیں وہی واقعتاً دولت مند ہیں۔ لیکن جب آسمان کے باشندوں کی نظریں اس زمین پر پڑتی ہیں تو انھیں قیمتی وسائل کے ڈھیروں پر بیٹھے ہوئے فالتو لوگ دکھائی دیتے ہیں۔ نازیوں کے پاس ایسے لوگوں کے لیے باقاعدہ ایک نام بھی تھا — überzahligen Essern — یعنی فالتو کھانے والے۔

فریڈرخ ریٹزل نے شمالی امریکہ میں مقامی انڈین باشندوں اور ان کے یوروپی نو آبادیاتی

حکمرانوں کے درمیان کشمکش کا قریب سے مطالعہ کرنے کے بعد کہا کہ لیبن سراؤم کی جدوجہد نیست و نابود کردینے کی جدوجہد ہے۔ نیست ونابود کردینے کا مطلب لازماً لوگوں کو جسمانی طور پر — ڈنڈوں سے، مار مار کر، جلا کر، سنگینیں گھونپ کر، گیس کے ذریعے، بمباری سے یا گولیاں چلا کر — ہلاک کرنا نہیں ہوتا۔ (بسا اوقات ہوتا بھی ہے، خصوصاً تب جب وہ مقابلہ کرنے کی کوشش کریں، کیونکہ اس صورت میں وہ دہشت گرد بن جاتے ہیں۔) تاریخی اعتبار سے نسل کشی کی سب سے موثر شکل یہ رہی ہے کہ انھیں بے گھر کردیا جائے، انھیں ایک جگہ اکٹھا کر کے کھانے اور پانی تک ان کی رسائی بند کردی جائے۔ ان حالات میں وہ کسی ظاہری تشدد کے بغیر، اور اکثر کہیں زیادہ بڑی تعداد میں، مر جاتے ہیں۔ ''نازیوں نے یہودیوں پر اپنے لباس پر ستارے کا نشان لگانا لازم کردیا اور ان کو ذخیرہ گاہوں (reserves) میں اکٹھا کردیا،'' سوین لنڈکوئسٹ لکھتا ہے، ''بالکل اسی طرح جیسے انڈین، ہیریرو، بش مین، امینڈابیلے اور دیگر ستارہ نژادوں کو ایک جگہ اکٹھا کردیا گیا تھا۔ جب ذخیرہ گاہوں کو خوراک کی فراہمی کاٹ دی گئی تو وہ اپنے آپ ختم ہو گئے۔''

تاریخ داں مائیک ڈیوس (Mike Davis) کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں 1876 اور 1892 کے درمیان کے عظیم قحط کے دوران ایک کروڑ بیس لاکھ سے دو کروڑ نوے لاکھ تک لوگ بھوکوں مرے، جبکہ انگلستان نے ہندوستان سے خوراک اور خام مال کی برآمد جاری رکھی۔ امرتیہ سین کا قول ہے کہ جمہوریت میں ہمارا قحط کا شکار ہونا غیر اغلب ہے۔ چنانچہ چین کے عظیم قحط کے مقابلے میں ہمارے پاس ہندوستان کی عظیم کم خوراکی (malnutrition) ہے۔ (کم خوراکی کے شکار پانچ کروڑ ستر لاکھ بچے — یعنی دنیا بھر میں ایسے بچوں میں سے ایک تہائی بچے — ہندوستان میں بستے ہیں۔)

ممکنہ طور پر چین کو چھوڑ کر، اندرون ملک بے گھر ہونے والوں کی سب سے بڑی تعداد ہندوستان میں پائی جاتی ہے۔ صرف ڈیموں نے تین کروڑ لوگوں کو بے گھر کیا ہے۔ لوگوں کی بے دخلی عدالتی حکم یا بندوق کی نوک پر پولیس والوں، سرکاری ملیشیاؤں یا کارپوریٹ غنڈوں کے ہاتھوں انجام دی جاتی ہے۔ (نندی گرام میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا مارکسسٹ تک کی اپنی مسلح ملیشیا تھی۔) بے گھر کیے جانے والوں کو عارضی مکانوں، کیمپوں اور ری سیٹلمنٹ کالونیوں میں اکٹھا کیا جا رہا ہے

جہاں، روزگار کے مواقع تک رسائی سے محروم ہو کر وہ غریبی کے بھنور میں جا پڑتے ہیں۔

چھتیس گڑھ کی ریاست میں، جس پر کارپوریشنوں کے لوگ اس کے کچ لوہے کی خاطر نظریں لگائے ہوئے ہیں، ایک مختلف تکنیک اختیار کی گئی ہے۔ ماؤوادی باغیوں سے لڑنے کے نام پر سیکڑوں گاؤں زبردستی خالی کرائے گئے ہیں اور تقریباً چالیس ہزار لوگوں کو پولیس کے کیمپوں میں منتقل کیا گیا ہے۔ ان میں سے کچھ کو حکومت مسلح کر رہی ہے جن پر مشتمل ''سلواجدوم'' یا ''عوامی ملیشیا'' کھڑی کی گئی ہے۔ جہاں قریب قریب خانہ جنگی کے حالات میں غریب ترین لوگ غریب ترین لوگوں سے لڑ رہے ہیں، وہیں ٹاٹا اور ایسار (Essar) گروپ چھتیس گڑھ میں لوہے کی کانوں کے مالکانہ حقوق کے لیے خاموشی سے مذاکرات میں مصروف ہیں۔ کیا ہم ان دونوں واقعات کے درمیان تعلق دیکھ سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں، ہم اس کا تصور تک نہیں کر سکتے۔ حالانکہ سلواجدوم کے قیام کا اعلان ٹاٹا گروپ اور ریاستی حکومت کے درمیان معاہدۂ افہام پر دستخط ہونے کے اگلے ہی دن کیا گیا تھا۔

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ واقعات کا یہ بیان نئے بھارت یا نیو انڈیا کے اس روپ کا حصہ نہیں بنتا جو آج کل مارکیٹ میں دستیاب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شے فروخت کے لیے رکھی گئی ہے وہ ایک اور قسم کی تردید ہے — جسے رابرٹ جے لفٹن ایک ''جعلی کائنات'' کی تخلیق کہتا ہے۔ اس کائنات میں ان ہولناکیوں کو جو نظام کا حصہ ہیں، معمولی غلطیوں کے طور پر بیان کیا جاتا ہے جو نااہل افراد کے ہاتھوں سرزد ہو جایا کرتی ہیں، اور اصل دنیا کی جگہ ایک زیادہ 'متوازن'، زیادہ مسرور دنیا پیش کی جاتی ہے۔ یہ توازن بناوٹی ہے: اکثر صورتوں میں اتحاد اور ترقی کو ایک دوسرے کے مخالف بتایا جاتا ہے، اتحاد کے منصوبے پر کی جانے والی لبرل، سیکولر تنقید کے ذریعے ترقی کے منصوبے کی تباہ کاریوں کا جواز تلاش کیا جاتا ہے۔ وہ لوگ جو غذائی زنجیر کے اعلیٰ ترین نقطے پر ہیں، وہ جنھیں موجودہ حالت کو بدلنے کی قطعی خواہش نہیں، وہی ہیں جن کے ہاتھوں یہ ''جعلی کائنات'' تیار کی جاتی ہے۔

ان کا کام یہ ہے کہ سرحدوں پر گشت جاری رکھیں، اٹھنے والے طیش کو ٹھنڈا کیا کریں، غصے کو بلا جواز قرار دیں اور جنگ بندیاں کرایا کریں۔

جب شاہ رخ خان سے نریندر مودی کے بارے میں سوال کیا گیا تو اس کا جواب تھا: ''میں انھیں ذاتی طور پر نہیں جانتا۔ . . . میری اس بارے میں کوئی رائے نہیں ہے۔'' اس نے کہا، ''ذاتی طور

پر ان لوگوں نے میرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔'' لبرل تاریخ داں اور کارپوریٹ فنڈز سے قائم کی جانے والی نیو انڈیا فاؤنڈیشن کا بانی رام چندر گوہا اپنی کتاب میں — اور انتہائی شہرت پانے والے اپنے انٹرویوز میں بھی — ہمیں تلقین کرتا ہے کہ گجرات کی ریاستی حکومت درحقیقت فاشسٹ نہیں ہے، اور یہ کہ نسل کشی محض ایک حادثاتی طور پر پیش آنے والا واقعہ تھی اور انتخابات کے بعد اس کی تلافی ہو چکی ہے۔

'سیکولر' قومی پریس سے وابستہ ایڈیٹر اور تبصرہ کار، گجرات کی نسل کشی پر اپنے غصے سے صحت یاب ہو جانے کے بعد، اب مودی کی انتظامی صلاحیتوں کو پرکھتے ہیں اور ان میں سے بیشتر ان صلاحیتوں سے بہت متاثر ہیں۔ ہندوستان ٹائمز کا ایڈیٹر کہتا ہے، ''مودی بھلے ہی ایک مہا قاتل ہو، لیکن آخر وہ ہمارا اپنا مہا قاتل ہے۔'' اور پھر وہ اپنے اس مخمصے کا تذکرہ کرتا ہے کہ ایسے مہا قاتل کے بارے میں کوئی رائے کیونکر قائم کی جائے جو ایک ''عمدہ'' وزیر اعلیٰ بھی ہے!

ہندوستان کے اس 'جعلی' روپ میں، ثقافت کے میدان میں، نئے بالی وُڈ سینما میں، انڈو اینگلین ادب کی فراوانی میں، غریب لوگ کم و بیش قطعی طور پر غیر موجود ہیں۔ ان کو پہلے ہی سے مٹا دیا گیا ہے۔ (وہ صرف اس وقت اپنی جھلک دکھاتے ہیں جب انھیں چھوٹے قرضوں، ترقیاتی اسکیموں اور این جی اوز کی خیرات سے فائدہ اٹھانے والوں کے طور پر مسکراتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔)

پچھلے سال گرمیوں میں میں بھٹک کر ایک ٹھنڈے کمرے میں جا نکلی جہاں بے شکن بالوں اور چینی مٹی جیسی جلد والی چار حسین، نوعمر لڑکیاں سستاتے ہوئے اپنے اپنے پالتو پلّوں کو ایک دوسرے سے متعارف کرا رہی تھیں۔ ان میں سے ایک مجھ سے مخاطب ہوئی:

> "I was on holiday with my family and I found an old essay of yours about dams and stuff? I was asking my brother if he knew about what a bad time these Dalits and Adivasis were having, being displaced and all.... I mean just being kicked out of their homes 'n stuff like

that? And you know, my brother's such a jerk, he said they're the ones who are holding India back. They should be exterminated. Can you imagine?"

مصیبت یہ ہے کہ میں اس کا تصور کر سکتی ہوں۔

پلّے بہت پیارے تھے۔ میں سوچنے لگی کہ کیا کتے ایک دوسرے کا صفایا کرنے کا تصور کر سکتے ہیں۔ شاید وہ اتنے ترقی پسند نہیں ہوتے۔

اسی شام میں نے ٹی وی پر امیتابھ بچن کو ٹائمز آف انڈیا کی 'India Poised' نامی اشتہاری مہم میں جلوہ گر دیکھا۔ اس مہم کا تعارف کرانے والے ٹی وی اینکر نے کہا کہ اس کا مقصد لوگوں کو اس بات پر اکسانا ہے کہ وہ "ماضی کے راستہ روکنے والے بھوتوں" کو چھوڑ کر آگے کی طرف بڑھیں۔ مایوسی کے مقابلے میں امید پرستی کا انتخاب کریں۔

"اس ملک میں دو انڈیا ہیں،" امیتابھ بچن نے اپنی مشہور گہری آواز میں کہا۔

ایک بھارت وہ ہے جو لگام کو توڑ کر آگے کی طرف چھلانگ لگانا چاہتا ہے تا کہ ان تمام اوصاف کا خود کو حقدار ثابت کر سکے جو دنیا ہم پر ان دنوں نچھاور کر رہی ہے۔ دوسرا بھارت یہ لگام ہے۔

ایک بھارت کہتا ہے، "مجھے ایک موقع دو تو میں خود کو ثابت کر دکھاؤں۔"

دوسرا بھارت کہتا ہے، "پہلے خود کو ثابت کرو، تب شاید تمھیں موقع دیا جائے۔"

ایک بھارت ہمارے دلوں کی رجائیت میں بستا ہے؛ دوسرا بھارت ہمارے ذہنوں کے شکوک میں۔

ایک بھارت خواہش رکھتا ہے، دوسرا محض امید پر زندہ ہے... ایک بھارت آگے آگے چلتا ہے، دوسرا اس کے پیچھے پیچھے۔

ایسی گفتگوئیں بڑھتی جا رہی ہیں۔

ہر گزرتے دن کے ساتھ اُس بھارت سے نکل کر زیادہ سے زیادہ لوگ اِس بھارت کی طرف آ رہے ہیں...

Scanned with CamScanner

اور خاموشی سے، جبکہ دنیا کی نظریں اس جانب نہیں ہیں، ایک دھڑکتا ہوا، متحرک بھارت ابھر رہا ہے۔

اور آخر میں:

اب ایک آزاد قوم کے طور پر اپنے ساٹھویں برس میں، ہمارا سفر ہمیں ایک اونچی، کھڑی چٹان کی نگر پر لے آیا ہے...

ایک بھارت، ذہن کے دور دراز گوشے میں چھپی دھیمی سی آواز سے ملتا جلتا، نیچے گھاٹی میں دیکھتا اور ہچکچاتا ہے۔ دوسرا بھارت سر اٹھا کر آسمان کو دیکھتا ہے اور کہتا ہے کہ اڑان بھرنے کا وقت آ پہنچا۔

یہ وہ مقام ہے جہاں یہ ''جعلی کائنات'' کھل کر سامنے آجاتی ہے۔

یہ ہمیں بتاتی ہے کہ مالداروں کے پاس کوئی اور راستہ نہیں (There Is No Alternative) لیکن غریبوں کے پاس ضرور ہے۔ وہ خود کو مالدار بنا سکتے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ رجائیت کے بجائے مایوسی، اعتماد کے بجائے تذبذب، امید کے بجائے احتیاج کا انتخاب کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں، وہ غریب رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ ان کے سوا کسی کا قصور نہیں۔ وہ کمزور ہیں۔ (اور یہ تو ہم جانتے ہی ہیں کہ لیبن سراؤم کے متلاشی کمزوروں کے متعلق کیا سوچتے ہیں۔) وہ ''ماضی کے راستہ روکتے بھوت'' ہیں۔ وہ ابھی سے بھوتوں میں بدل چکے ہیں۔

''ایک جاری جعلی کائنات کے تسلسل میں،'' رابرٹ جے لفٹن کہتا ہے، ''نسل کشی آسان، تقریباً فطری کارروائی کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔''

غریبوں، نام نہاد غریبوں، کے سامنے صرف ایک انتخاب ہے: مزاحمت یا سپردگی۔ ایتابھ بچن درست کہتا ہے: جس وقت دنیا کی نظریں اس طرف نہیں، وہ خاموشی سے، دوسری طرف جا رہے ہیں۔ وہ اُس جگہ نہیں جا رہے ہیں جو ایتابھ بچن کے ذہن میں ہے، بلکہ ایک اور گھاٹی کے پار، ایک اور سمت میں جا رہے ہیں۔ مسلح جدوجہد کی سمت میں۔ وہاں سے وہ مڑ کر ترقی کے شہنشاہوں پر نظر ڈالتے ہیں اور ان کے افسوسناک نعرے کی نقل کرتے ہیں:

'There Is No Alternative.

انھوں نے لوگوں کی عظیم گاندھیائی تحریکوں کو خاک میں ملتے اور حقارت سے ٹھکرائے جاتے دیکھا ہے: عدالتی مقدموں کی بھول بھلیاں، بھوک ہڑتالیں اور جوابی بھوک ہڑتالیں۔ ماضی کے یہ راستہ روکنے والے لاکھوں بھوت شاید یہ سوچ رہے ہیں کہ شمالی اور جنوبی امریکہ کے انڈینوں، افریقہ کے غلاموں، تسمانیہ کے باشندوں، ہیریرو قبائلیوں، ہوٹنٹوٹ باشندوں، آرمینیوں، جرمنی کے یہودیوں، گجرات کے مسلمانوں کو گاندھی کا کیا مشورہ ہوتا۔ شاید وہ یہ سوچ رہے ہیں کہ وہ بھوک ہڑتال پر کیسے بیٹھیں جبکہ فاقوں سے ان کی جان یوں ہی نکلی جا رہی ہے۔ وہ بدیسی اشیا کا بائیکاٹ کیونکر کریں جبکہ ان کے پاس کسی بھی قسم کی اشیا خریدنے کے لیے پیسے نہیں۔ وہ ٹیکس ادا کرنے سے کس طرح انکار کریں جبکہ ان کی کوئی آمدنی ہی نہیں۔

نکسل وادیوں کو مٹا دو۔ شائننگ انڈیا میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں۔

ہتھیار اٹھانے والے لوگوں نے پوری طرح سوچ کر ہتھیار اٹھائے ہیں کہ اس فیصلے کا نتیجہ کیا ہوگا۔ انھوں نے یہ فیصلہ یہ جان کر کیا ہے کہ ان کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اس سرزمین کے نئے قانون غریبوں کو مجرم ٹھہراتے اور مزاحمت کو دہشت گردی قرار دیتے ہیں۔ (پرامن کارکن 'اوور گراؤنڈ ورکرز'—OGWs— کہلاتے ہیں۔) وہ جانتے ہیں کہ ضمیر، لبرل اخلاقیات اور پریس کی ہمدردانہ کوریج کو پکارنا اب ان کے کسی کام نہیں آ سکتا۔ وہ کسی بین الاقوامی مارچ، کسی عالمی اختلاف رائے سے واقف نہیں۔ جب گولی چلے گی تو ان کے آس پاس کسی مشہور ادیب کا وجود نہیں ہوگا۔

لاکھوں افراد ہندوستانی جمہوریت کے اداروں میں اپنا یقین توڑ چکے ہیں۔ ملک کے بڑے بڑے رقبے حکومت کے کنٹرول سے باہر نکل چکے ہیں۔ (تازہ ترین تخمینے کے مطابق یہ ملک کے کل رقبے کے ایک چوتھائی کے برابر ہیں۔) اس جدوجہد سے موت کا تعفن اٹھتا ہے۔ یہ کوئی دلفریب نظارہ نہیں۔ ہو بھی کیسے سکتا ہے جب ماضی کے ان راستہ روکتے بھوتوں کی کمان چیئرمین ماؤ کا بھوت بنفس نفیس سنبھالے ہوئے ہے؟ (امید کی کرن صرف یہ ہے کہ بہت سے پیادہ سپاہی اس سے ناواقف ہیں کہ ماؤ کون تھا۔ یا اس نے کیا کیا تھا۔ کیا یہ نسل کشی کی مزید تردید ہے؟ شاید۔) کیا یہ لوگ

Scanned with CamScanner

آدرش وادی ہیں جو ایک بہتر دنیا کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں؟ بہر حال... ہلاک کر دیے جانے کے مقابلے میں تو کوئی بھی چیز بہتر ہی ہوگی۔

وزیر اعظم نے اعلان کیا ہے کہ ماؤ وادی مزاحمت ''سلامتی کو درپیش واحد سب سے بڑا خطرہ'' ہے۔ فوج کو طلب کرنے تک کی اپیلیں کی گئی ہیں۔ مذمت کے جوش سے ذرائع ابلاغ کی سانس اکھڑی جا رہی ہے۔

ایک عام اخباری رپورٹ ملاحظہ کیجیے۔ کوئی غیر معمولی رپورٹ نہیں۔ ''نکسل وادیوں کو کچل دو''، اس کا عنوان ہے۔

حکومت آخر کار نکسل وادیوں سے نمٹنے کے سلسلے میں کسی قدر ہوشمندی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ ایک ماہ بھی نہیں ہوا جب وزیر اعظم منموہن سنگھ نے ریاستی حکومتوں سے کہا تھا کہ نکسل وادیوں کے انفراسٹرکچر کو ''چوک'' (choke) کر دیں اور خصوصی طاقت استعمال کر کے ان کی سرگرمیوں کو ''اپاہج'' بنا کر اس ''وائرس'' کا خاتمہ کر دیں۔ اس سے اشارہ ملا کہ اس امر کی ضرورت کا احساس کر لیا گیا ہے کہ ترقیاتی منصوبوں پر رقم ضائع کرنے کے بجائے نکسل واد کو قانون کے موثر نفاذ کے ذریعے کچل دیا جائے۔

چوک کر دو، اپاہج بنا دو، وائرس، خاتمہ، صفایا کر دو، کچل ڈالو...

ہاں، فضا میں صفایا کرنے کے خیال کی موجودگی محسوس کی جا سکتی ہے۔ اور دوسری طرف لوگ سمجھتے ہیں کہ خاتمے کا سامنا کرتے ہوئے انھیں جواباً لڑنے کا حق ہے۔ اور اس لڑائی میں وہ کوئی بھی ذریعہ استعمال کر سکتے ہیں جو ضروری ہو۔

شاید انھوں نے ٹڈی دل کی آہٹ سن لی ہے۔

❊❊

Scanned with CamScanner

ارن دھتی رائے

انگریزی سے۔ ترجمہ: اجمل کمال

'اور اس کی زندگی مٹا دی جائے'

ہندوستانی پارلیمنٹ پر حملے کی عجیب و غریب داستان

ہمیں اتنا معلوم ہے: 13 دسمبر 2001 کو ہندوستانی پارلیمنٹ کا موسم سرما کا اجلاس جاری تھا۔ (نیشنل ڈیموکریٹک الائنس یا NDA کی حکومت بدعنوانی کے ایک اور اسکینڈل کی زد میں تھی۔) صبح ساڑھے گیارہ بجے پانچ مسلح افراد ایک سفید ایمبیسڈر کار میں، جس میں ایک خودساختہ دھماکا خیز ڈیوائس نصب تھی، پارلیمنٹ ہاؤس کے پھاٹک سے اندر داخل ہو گئے۔ جب انھیں للکارا گیا تو انھوں نے کار سے باہر کود کر فائرنگ شروع کر دی۔ اس سے شروع ہونے والی بندوقوں کی لڑائی میں تمام حملہ آور ہلاک ہو گئے۔ ان کے علاوہ سکیورٹی کے آٹھ اہلکار اور ایک مالی بھی ہلاک ہوا۔ پولیس کا کہنا تھا کہ ہلاک ہونے والے دہشت گردوں کے پاس اتنا بارود تھا جو پارلیمنٹ ہاؤس کی عمارت کو اڑا دینے کے لیے کافی تھا اور اتنا اسلحہ کہ وہ فوجیوں کی ایک پوری بٹالین کا سامنا کر سکتے تھے۔ بیشتر دہشت گردوں کے برخلاف ان پانچوں نے اپنے پیچھے شواہد کی ایک پوری لکیر چھوڑی — ہتھیار، موبائل فون، فون نمبر، شناختی کارڈ، فوٹوگراف، خشک میوے کی تھیلیاں، یہاں تک کہ ایک محبت نامہ بھی۔

تعجب کی بات نہیں کہ وزیراعظم اٹل بہاری واجپئی نے موقع غنیمت جان کر اس حملے کا موازنہ امریکہ میں صرف تین ماہ پہلے، گیارہ ستمبر کو ہونے والے حملوں سے کیا۔

14 دسمبر 2001 کو، پارلیمنٹ پر حملے کے ایک روز بعد، دہلی پولیس کے اسپیشل سیل نے

Scanned with CamScanner

دعویٰ کیا کہ اس نے ایسے کئی افراد کا پتا چلا لیا ہے جن پر اس سازش میں شامل ہونے کا شبہ ہے۔ ایک دن بعد، 15 دسمبر کو، اس نے اعلان کیا کہ اس نے ''کیس حل کر لیا ہے'': یہ حملہ، پولیس کا کہنا تھا، پاکستان میں قائم دو دہشت گرد گروپوں، لشکر طیبہ اور جیش محمد کی کارروائی تھی۔ بارہ افراد کو اس سازش میں شریک قرار دیا گیا۔ جیش کا غازی بابا (عادی مشتبہ نمبر ایک)، جیش ہی کا مولانا مسعود اظہر (عادی مشتبہ نمبر دو)؛ طارق احمد (ایک ''پاکستانی'')؛ پانچ ہلاک شدہ ''پاکستانی دہشت گرد'' (ہمیں اب تک نہیں معلوم کہ وہ کون تھے)؛ اور تین کشمیری باشندے، ایس اے آر گیلانی، شوکت حسین گرو اور محمد افضل؛ اور شوکت کی بیوی افساں گرو۔ گرفتار ہونے والے بس آخری چار تھے۔

اس کے بعد کے تناؤ بھرے دنوں میں پارلیمنٹ کی کارروائی موخر کر دی گئی۔ 21 دسمبر کو ہندوستان نے اپنے ہائی کمشنر کو پاکستان سے واپس بلوا لیا، پاکستان سے ہوائی جہاز، ریل اور بس کی آمدورفت بند کر دی اور ہندوستانی رقبے پر سے پاکستانی ہوائی جہازوں کی پرواز پر پابندی لگا دی۔ اس نے اپنی بھاری جنگی مشینری کو حرکت میں لانا شروع کر دیا اور پانچ لاکھ سے زیادہ فوج پاکستان کی سرحد پر لا کھڑی کی۔ بیرونی سفارت خانوں نے اپنے عملے اور شہریوں کو ملک سے باہر نکال لیا، اور ہندوستان کے سفر پر آنے والے سیاحوں کے لیے احتیاطی تدابیر تجویز کی جانے لگیں۔ دنیا سانس روکے انتظار کرتی رہی اور برصغیر نیوکلیئر جنگ کے امکان کی طرف سرکتا چلا گیا۔ (اس تمام سرگرمی کی قیمت دس ہزار کروڑ روپے تھی جو عوامی خزانے سے خرچ کی گئی۔ چند سو فوجی محض افراتفری سے کی جانے والی تعیناتی کے عمل میں ہلاک ہو گئے۔)

تقریباً ساڑھے تین سال بعد، 4 اگست 2005 کو، سپریم کورٹ نے اس مقدمے پر اپنا حتمی فیصلہ سنایا۔ اس نے پارلیمنٹ پر ہونے والے حملے کو جنگی کارروائی سے تعبیر کیے جانے کی تائید کی۔ اس نے کہا، ''پارلیمنٹ پر حملے کی کوشش بلاشبہ ریاست کی خودمختاری کے مظہر پر حملہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ہندوستانی حکومت پر بھی، جو اس کی ہمزاد ہے۔۔۔ ہلاک شدہ دہشت گردوں کو اس کارروائی پر ایک شدید ہندوستان مخالف احساس نے اکسایا تھا جس کی شہادت کار پر لگے ہوئے وزارت داخلہ کے جعلی اسٹیکر سے ملتی ہے۔'' فیصلے میں مزید کہا گیا، ''ہارڈ کور 'فدائین' کے اختیار کردہ عملی طریقے حکومت ہندوستان کے خلاف جنگ شروع کرنے پر دلالت کرتے ہیں۔''

Scanned with CamScanner

وزارت داخلہ کے جعلی اسٹیکر پر لکھی ہوئی عبارت یہ تھی:

"INDIA IS A VERY BAD COUNTRY AND WE HATE INDIA WE WANTTO DESTROY INDIA AND WITH THE GRACE OF GOD WE WILL DO ITGOD IS WITH US AND WE WILL TRY OUR BEST. THIS EDIET WAJPAI AND ADVANI WE WILL KILL THEM. THEY HAVE KILLED MANYINNOCENT PEOPLE AND THEY ARE VERY BAD PERSONS THEREBROTHER BUSH IS ALSO A VERY BAD PERSON HE WILL BE NEXTTARGET HE IS ALSO THE KILLER OF INNOCENT PEOPLE HE HAVE TO DIE AND WE WILL DO IT."

یہ منشور نما اسٹیکر بم بردار کار کے ونڈ اسکرین پر چسپاں تھا جس وقت وہ پارلیمنٹ میں داخل ہوئی۔ (اتنی طویل عبارت کی موجودگی میں یہ بھی حیرت کی بات ہے کہ ڈرائیور شیشے کے پار کیونکر دیکھ پا رہا ہوگا۔ ممکن ہے یہی وجہ رہی ہو کہ اس کے کار نائب صدر کی سواری کے جلوس سے ٹکرا دی۔)

پولیس کی جانب سے فرد جرم ایک خصوصی تیز رفتار عدالت میں دائر کی گئی جسے دہشت گردی کی کارروائیوں کے سدباب کے لیے بنائے گئے قانون POTA کے تحت قائم کیا گیا تھا۔ اس عدالت نے گیلانی، شوکت اور افضل کو سزائے موت سنائی۔ افساں گرو کو پانچ سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ بعد میں ہائی کورٹ نے گیلانی اور افساں کو بری کر دیا، مگر شوکت اور افضل کی سزائے موت برقرار رکھی۔ آخر کار سپریم کورٹ نے بریت کا فیصلہ برقرار رکھا اور شوکت کی سزا کم کر کے دس سال قید بامشقت کر دی۔ تاہم اس نے محمد افضل کی سزا کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اس میں مزید اضافہ کیا۔ اسے تین بار عمر قید اور دو مرتبہ پھانسی کی سزا سنائی گئی۔

4 اگست 2005 کو سنائے جانے والے فیصلے میں سپریم کورٹ نے واضح طور پر کہا کہ اس بات کی کوئی شہادت موجود نہیں ہے کہ محمد افضل کسی دہشت گرد گروپ یا تنظیم سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن اس نے یہ بھی کہا، ''جیسا کہ بیشتر سازشوں کے معاملے میں ہوتا ہے، مجرمانہ سازش کے ہم معنی معاہدے کی کوئی براہ راست شہادت نہ ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ تاہم حالات پر مجموعی انداز سے غور کیا

Scanned with CamScanner

جائے تو وہ اسی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ ملزم افضل اور ہلاک شدہ 'فدائین' دہشت گردوں کے درمیان گٹھ جوڑ موجود تھا۔''

گویا: براہ راست شہادت کوئی نہیں، لیکن واقعاتی شہادت دستیاب ہے۔

سپریم کورٹ کے فیصلے کے ایک متنازع پیراگراف میں کہا گیا ہے: ''اس واقعے نے، جس کا نتیجہ بھاری جانی نقصان کی صورت میں نکلا، پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا ہے، اور معاشرے کے اجتماعی ضمیر کی تسکین اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ مجرم کو سزائے موت دی جائے۔ ہندوستان کے اتحاد، یک جہتی اور خود مختاری کو دہشت گردوں اور سازشیوں کی ان کارروائیوں سے جو چیلنج درپیش ہے، اس کا جواب اسی طرح دیا جا سکتا ہے کہ اس شخص کو جس کا اس سازشی اقدام میں شامل ہونا ثابت ہو چکا ہے، سزائے موت دی جائے۔''

قتل کی رسم کا، جو سزائے موت کی اصل ہے، جواز پیش کرنے کے لیے ''معاشرے کے اجتماعی ضمیر'' سے فریاد کرنا، لنچنگ یعنی ہجوم کے ہاتھوں قتل کر دیے جانے کے قانون کی قدر افزائی کرنے سے کم نہیں۔ یہ خیال ہی کس قدر خوفناک ہے کہ یہ بات ہم پر شکار خور سیاست کاروں یا سنسنی کے متلاشی صحافیوں کی جانب سے نہیں (اگرچہ ان کی طرف سے بھی) بلکہ ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کے حکم میں نازل ہوئی ہے۔

افضل کو سزائے موت سنائے جانے کی وجوہ بیان کرتے ہوئے عدالتی فیصلے میں کہا گیا ہے، ''اپیل کنندہ، جو ہتھیار ڈال دینے والا ایک شدت پسند تھا اور ملک کے خلاف غداری کے جرم کا دوبارہ ارتکاب کرنے پر تلا ہوا تھا، سماج کے لیے ایک خطرہ ہے چنانچہ اس کی زندگی مٹا دی جائے۔''

اس پیراگراف میں مسخ شدہ منطق کے ساتھ ساتھ اس بات سے مکمل لاعلمی کا اظہار ہوتا ہے کہ آج کشمیر میں ہتھیار ڈالنے والا شدت پسند ہونے کے کیا معنی ہیں۔

چنانچہ: کیا محمد افضل کی زندگی مٹا دی جانی چاہیے؟

دانشوروں، کارکنوں، مدیروں، وکیلوں اور معروف شخصیات کی ایک قلیل لیکن بااثر تعداد نے سزائے موت کے اس فیصلے پر اخلاقی اصول کی رو سے اعتراض کیا ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس بات کی کوئی عملی شہادت موجود نہیں کہ سزائے موت دہشت گردوں کو اپنی کارروائی سے باز رکھنے میں

کارآمد ہوتی ہے۔ (ہو بھی کیسے سکتی ہے جبکہ فدائین اور خودکش بمباروں کے اس زمانے میں موت ہی اصل دلکشی کی چیز معلوم ہونے لگی ہے۔)

اگر رائے عامہ کے جائزوں، اخبارات کے مدیروں کے نام خطوں اور ٹی وی اسٹوڈیوز کے لائیو پروگراموں میں موجود ناظرین کے ردعمل کو رائے عامہ کا درست پیمانہ مان لیا جائے تو یہ طے ہے کہ لنچنگ پر تلے ہوئے ہجوم میں ہر گھنٹے کے حساب سے اضافہ ہو رہا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی شہریوں کی بھاری اکثریت محمد افضل کو اگلے کئی سال تک ہر روز، چھٹی کے دن سمیت، پھانسی پر جھولتے دیکھنا چاہتی ہے۔ حزبِ اختلاف کے لیڈر ایل کے آڈوانی نے، نازیبا بےصبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے، اسے جلد سے جلد، لمحہ بھر کی تاخیر کیے بغیر، پھانسی پر لٹکا دینے کا مطالبہ کیا ہے۔

اُدھر کشمیر میں بھی رائے عامہ اتنی ہی شدید ہے۔ بڑے بڑے غضب ناک احتجاجی مظاہروں سے یہ بات واضح ہوتی جا رہی ہے کہ اگر افضل کو پھانسی دی گئی تو اس کے سیاسی نتائج برآمد ہوں گے۔ مظاہروں میں شامل کچھ لوگ عدالتی ناانصافی کے خلاف احتجاج کرتے ہیں، لیکن احتجاج کرتے ہوئے بھی انھیں ہندوستانی عدالتوں سے انصاف حاصل کرنے کی کوئی توقع نہیں ہوتی۔ وہ اتنی زیادہ بربریت جھیل چکے ہیں کہ اب عدالتوں، حلف ناموں اور انصاف پر مزید یقین نہیں کر سکتے۔ دوسری طرف ایسے لوگ بھی ہیں جو چاہتے ہیں کہ محمد افضل کشمیری جدوجہدِ آزادی کے لیے جان دینے والے شہید کے طور پر، مقبول بٹ کی طرح، بڑھ کر پھندا گلے میں ڈال لے۔ مجموعی طور پر زیادہ تر کشمیری محمد افضل کو ایک قسم کا جنگی قیدی خیال کرتے ہیں جس پر ایک قابض طاقت کی عدالت میں مقدمہ چلایا جا رہا ہے۔ (یہ بات درست ہے۔) قدرتی طور پر ہندوستان اور کشمیر میں سیاسی پارٹیاں، شکار کی بو سونگھ چکی ہیں اور ہلاکت کے لیے گھیرا تنگ کرتی جا رہی ہیں۔

المناک بات یہ ہے کہ اس تمام جوش اور غیظ و غضب کے درمیان محمد افضل ایک فرد، ایک حقیقی شخص ہونے کے اپنے حق سے محروم ہو چکا ہے۔ وہ ہر شخص — قوم پرست، علیحدگی پسند، سزائے موت کے مخالف کارکن — کی فینٹسی کے ایک وسیلے میں تبدیل ہو چکا ہے۔ وہ ہندوستان کا بہت بڑا ولن اور کشمیر کا بہت بڑا ہیرو بن گیا ہے — جس سے صرف اتنی بات ثابت ہوتی ہے کہ ہمارے دانشمند، پالیسی ساز اور امن کے پرچارک خواہ کچھ بھی کہتے رہیں، کشمیر میں جنگ ہرگز ختم نہیں ہوئی ہے۔

Scanned with CamScanner

ایک ایسے تشویشناک اور سیاست زدہ ماحول میں یہ سوچنا خاصی ترغیب کا باعث ہو سکتا ہے کہ شاید مداخلت کرنے کا وقت آ کر جا چکا ہے۔ آخر عدالتی عمل چالیس مہینے جاری رہا ہے، اور سپریم کورٹ اپنے سامنے رکھی جانے والی شہادتوں کی جانچ کر چکی ہے۔ اس نے دو ملزموں کو سزا سنائی ہے اور دو کو بری کر دیا ہے۔ کیا اس سے عدالتی غیر جانبداری ثابت نہیں ہوتی؟ اب کہنے کے لیے اور کیا باقی ہے؟ تاہم، اس صورت حال کو ایک اور زاویے سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ کیا یہ بات عجیب نہیں کہ استغاثہ کا کیس، جو پہلے نصف میں اس قدر قبیح طور پر غلط تھا، دوسرے نصف میں اتنے شاندار طور پر درست پایا گیا؟

محمد افضل کی کہانی ٹھیک اسی لیے مسحور کن ہے کہ وہ مقبول بٹ نہیں ہے۔ اس کے باوجود اس کی کہانی بھی وادی کشمیر کی کہانی سے اتنے ہی الجھے ہوئے انداز میں پیوست ہے۔ یہ وہ کہانی ہے جس کے کنارے عدالتی کمروں اور خود ساختہ 'سپر پاور' کے محفوظ قلب میں رہنے والوں کے محدود تخیل کی سرحدوں سے باہر بہت دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ محمد افضل کی کہانی کی ابتدا ایک جنگ زدہ خطے سے ہوتی ہے جہاں کے قوانین ہمارے عمدہ دلائل اور نارمل علم قانون کے نازک طرز احساس سے باہر عمل کرتے ہیں۔

ان تمام اسباب کی بنا پر یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم 13 دسمبر کو پارلیمنٹ پر ہونے والے حملے کی عجیب، غمناک اور انتہائی شر انگیز کہانی پر احتیاط سے غور کریں۔ اس سے ہمیں معلوم ہوگا کہ دنیا کی سب سے بڑی 'جمہوریت' درحقیقت کس طرح کام کرتی ہے۔ یہ کہانی سب سے بڑی چیزوں کو سب سے چھوٹی چیزوں سے جوڑ دیتی ہے۔ یہ ان راہوں کا نقشہ بناتی ہے جو ہمارے پولیس تھانوں کے نیم تاریک نشیبوں میں واقع ہونے والی چیزوں کو وادی جنت نظیر کی سرد، برفانی سڑکوں پر پیش آنے والے واقعات سے منسلک کرتی ہیں؛ اور وہاں سے اس غیر شخصی شر انگیز غیظ و غضب تک پہنچتی ہیں جس کے باعث قومیں ایک دوسرے کے ساتھ نیوکلیئر جنگ کے دہانے پر آ کھڑی ہوتی ہیں۔ یہ کہانی ٹھوس سوالات اٹھاتی ہے جو نظریاتی یا خطیبانہ نہیں بلکہ ٹھوس جوابوں کے مستحق ہیں۔ جو کچھ داؤ پر لگا ہوا ہے وہ ایک فرد کی تقدیر سے بہت بڑا ہے۔

اس سال 4 اکتوبر کو میں ان لوگوں کی قلیل تعداد میں شامل تھی جو محمد افضل کی سزائے موت کے

خلاف احتجاج کرنے کے لیے نئی دہلی کے جنتر منتر پر جمع ہوئے تھے۔ میں وہاں اس لیے تھی کہ مجھے یقین ہے کہ محمد افضل ایک نہایت شرانگیز کھیل میں محض ایک پیادے کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ہرگز وہ اژدہا نہیں جو اسے بنا کر پیش کیا جا رہا ہے، وہ محض اژدہے کے پاؤں کا نشان ہے۔ اگر اس نشان کو مٹا دیا گیا تو ہم کبھی نہ جان سکیں گے کہ وہ اژدہا کون تھا۔ کون ہے۔

اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس سہ پہر کو وہاں احتجاج کرنے والوں سے زیادہ تعداد صحافیوں اور ٹی وی کے عملے کی تھی۔ بیشتر توجہ افضل کے فرشتہ صورت کمسن بیٹے غالب پر مرکوز تھی۔ دردمند لوگ، جن کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس بچے کا کیا کریں جس کا باپ پھانسی پر چڑھنے والا ہے، اسے آئس کریم اور کولڈ ڈرنک سے بہلا رہے تھے۔ جب میں نے وہاں موجود لوگوں پر نظر ڈالی تو مجھے ایک غمناک حقیقت کا احساس ہوا۔ اس احتجاج کو منظم کرنے والا پستہ قد، بھاری بدن والا شخص، جو گھبرائے ہوئے انداز میں اعلانات کرنے اور مقرروں کا تعارف کرانے میں مصروف تھا، دہلی یونیورسٹی میں عربی ادب کا نوجوان لیکچرر ایس اے آر گیلانی تھا۔ پارلیمنٹ پر حملے کے مقدمے کا ملزم نمبر تین۔ اسے 15 دسمبر 2001 کو، یعنی حملے کے تیسرے دن، دہلی پولیس کے اسپیشل سیل نے گرفتار کیا تھا۔ اگرچہ گیلانی کو قید کے دوران بہیمانہ اذیت کا نشانہ بنایا گیا، اگرچہ اس کے خاندان — بیوی، کمسن بچوں اور بھائی — کو غیر قانونی حراست میں رکھا گیا، پھر بھی اس نے اس جرم کا اقبال کرنے سے انکار کر دیا جو اس نے نہیں کیا تھا۔ لیکن اگر آپ نے اس کی گرفتاری کے بعد کے اخبارات پڑھے ہوں تو بلاشبہ آپ کو ان باتوں کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ ہوگا۔ ان اخباروں میں اس اقبالِ جرم کو نہایت تفصیل سے شائع کیا گیا جو مکمل طور پر تخیلاتی اور غیر موجود تھا۔ دہلی پولیس نے گیلانی کو سازش کے ہندوستانی بازو کا شرانگیز ماسٹر مائنڈ بنا کر پیش کیا۔ اس کے اسکرپٹ رائٹروں نے اس کے خلاف ایک نفرت انگیز پروپیگنڈا مہم چلائی، جسے حد درجہ قوم پرست، سنسنی کے متلاشی میڈیا نے کئی گنا بڑھا چڑھا کر اور کلی پھندنے لگا کر، پرجوش انداز میں پیش کیا۔ پولیس کو خوب اچھی طرح معلوم تھا کہ فوجداری مقدموں میں ججوں کی بابت یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ میڈیا کی رپورٹوں پر توجہ نہیں دیتے۔ چنانچہ میڈیا کو معلوم تھا کہ اس کا قطعی سفاکانہ طور پر گھڑا ہوا 'دہشت گردوں' کا پروفائل رائے عامہ کی تشکیل کرے گا اور مقدمے کے لیے موزوں ماحول تیار کرے گا، لیکن اسے کسی قانونی جانچ سے نہیں

Scanned with CamScanner

گزرنا پڑے گا۔

یہ ہیں وہ چند پُر کینہ، سفید جھوٹ جنھیں مین اسٹریم اخبارات میں شائع کیا گیا:

''کیس حل ہوگیا: حملے کے پیچھے جیش کا ہاتھ''

ہندوستان ٹائمز، 16 دسمبر 2001: نیتا شرما اور ارون جوشی

''دہلی میں اسپیشل سیل کے سراغ رسانوں نے عربی کے ایک لیکچرر کو حراست میں لیا ہے جو ذاکر حسین کالج (ایوننگ) میں پڑھاتا ہے۔۔۔۔ اسے اس بات کی شہادت ملنے کے بعد گرفتار کیا گیا کہ اسے اپنے موبائل فون پر دہشت گردوں کی طرف سے ایک کال موصول ہوئی تھی۔''

اسی اخبار میں ایک اور کالم میں کہا گیا: ''دہشت گردوں نے حملے سے قبل لیکچرر سے بات کی اور حملے کے کچھ دیر بعد لیکچرر نے پاکستان فون کیا۔''

''دہلی یونیورسٹی کا لیکچرر دہشت گردی کے منصوبے کا مرکزی کردار''

ٹائمز آف انڈیا، 17 دسمبر 2001

''13 دسمبر کو پارلیمنٹ پر ہونے والا حملہ جیش محمد اور لشکر طیبہ کی مشترکہ کارروائی تھی جس میں دہلی یونیورسٹی کے لیکچرر سید اے آر گیلانی نے دہلی میں کلیدی کردار ادا کیا تھا، دہلی پولیس کمشنر اجے راج شرما نے اتوار کو کہا۔''

''یونیورسٹی کے ڈان نے فدائین کی رہنمائی کی''

دی ہندو، 17 دسمبر 2001

''گیلانی نے دوران تفتیش انکشاف کیا کہ وہ اس سازش سے اس دن سے باخبر تھا جب اس 'فدائین' حملے کا منصوبہ تیار کیا گیا تھا۔''

''ڈان فارغ وقت میں دہشت گردی پر لیکچر دیا کرتا تھا''

دی ہندوستان ٹائمز، 17 دسمبر 2001

’’تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ شام کے وقت وہ کالج میں عربی ادب پڑھاتا تھا۔ فارغ وقت میں، اپنے گھر میں یا ایک اور مشتبہ ملزم شوکت حسین کے مکان پر جسے گرفتار کیا جانا باقی ہے، بند دروازوں کے پیچھے، وہ دہشت گردی کی تعلیم لیا اور دیا کرتا تھا۔‘‘

’’پروفیسر کی آمدنی‘‘

دی ہندوستان ٹائمز، 17 دسمبر 2001

’’گیلانی نے حال ہی میں مغربی دہلی میں 22 لاکھ کا ایک مکان خریدا ہے۔ پولیس تفتیش کر رہی ہے کہ اتنی خطیر رقم اس کے پاس کس طرح آئی۔‘‘

’’علیگڑھ سے انگلینڈ تک طالب علموں میں دہشت گردی کے بیج بو رہا تھا گیلانی‘‘

راشٹریہ سہارا، 18 دسمبر 2001: سجیت ٹھاکر

’’ذرائع کے بیان اور تفتیشی اداروں کی جمع کی ہوئی جانکاری کے مطابق گیلانی نے پولیس کو بیان دیا ہے کہ وہ بہت عرصے سے جیش محمد کا ایجنٹ تھا۔ ... گیلانی کی گفتگو کی صلاحیت، کام کرنے کے طریقے اور مضبوط منصوبہ بندی ہی کے باعث جیش نے اسے دانشورانہ دہشت گردی پھیلانے کی ذمے داری سونپی تھی۔‘‘

’’مشتبہ دہشت گرد پاکستانی سفارت خانے اکثر جایا کرتا تھا‘‘

دی ہندوستان ٹائمز، 21 دسمبر 2001

’’تفتیش کے دوران گیلانی نے اعتراف کیا ہے کہ وہ اکثر پاکستانی سفارت خانے جایا کرتا تھا اور جیش محمد کے شدت پسندوں سے رابطے میں رہتا تھا۔ ... گیلانی نے کہا کہ جیش کے کچھ ارکان نے اسے فنڈز فراہم کیے تھے اور اس سے دو فلیٹ خریدنے کو کہا تھا جن کو شدت پسند کارروائیوں کے لیے استعمال کیا جا سکے۔‘‘

Scanned with CamScanner

"اس ہفتے کی شخصیت"

سنڈے ٹائمز آف انڈیا، 23 دسمبر 2001

"ایک سیل فون اس کی بربادی کا سبب بن گیا۔ دہلی یونیورسٹی کے سید اے آر گیلانی 13 دسمبر کے مقدمے میں گرفتار ہونے والا پہلا شخص تھا۔ جس سے اس بات کی صدمہ انگیز یاددہانی ہوتی ہے کہ دہشت گردی کی جڑیں کتنی دور دور اور کتنی گہرائی تک پھیلی ہوئی ہیں۔۔۔"

زی ٹی وی ان سب پر بازی لے گیا۔ اس نے "13 دسمبر" کے عنوان سے ایک فلم تیار کی، ایک "ڈاکیوڈراما" جس کے بارے میں دعویٰ کیا گیا کہ وہ "پولیس کی تیار کردہ فرد جرم پر مبنی حقیقت" ہے۔ (کیا اسے تضاد بیانی کے سوا اور کچھ کہا جا سکتا ہے؟) وزیر اعظم واجپئی اور وزیر داخلہ آڈوانی کے لیے اس فلم کی پرائیویٹ اسکریننگ کی گئی۔ ان دونوں نے فلم کو سراہا۔ ان کی اس توثیق کو میڈیا میں وسیع پیمانے پر رپورٹ کیا گیا۔

سپریم کورٹ نے اس فلم کو نشر کیے جانے سے روکنے کی اپیل اس بنا پر خارج کر دی کہ جج میڈیا سے اثر نہیں لیتے۔ (کیا سپریم کورٹ اس بات کو تسلیم کرے گا کہ خواہ جج میڈیا کی رپورٹوں سے اثر نہ لیتے ہوں، "معاشرے کا اجتماعی ضمیر" ان سے ضرور اثر لیتا ہے؟) "13 دسمبر" نامی فلم کو زی ٹی وی کے قومی نیٹ ورک پر اس تیز رفتار عدالت کا فیصلہ آنے سے، جس میں گیلانی، افضل اور شوکت کو سزائے موت دی گئی، چند روز پہلے نشر کیا گیا۔ گیلانی کو اٹھارہ مہینے قید میں کاٹنے پڑے، جن میں سے بیشتر وقت اسے کال کوٹھری میں قید تنہائی میں رکھا گیا۔

اسے اس وقت رہا کیا گیا جب ہائی کورٹ نے اسے اور افساں گرو کو بری کیا۔ (افساں نے، جو گرفتاری کے وقت حاملہ تھی، جیل میں بچے کو جنم دیا۔ وہ جس تجربے سے گزری اس نے اسے توڑ کر رکھ دیا۔ اب وہ ایک سنگین نفسیاتی عارضے میں مبتلا ہے۔) سپریم کورٹ نے اس کی بریت کو بحال رکھا۔ اسے ایسی ایک بھی شہادت نہ ملی جس سے گیلانی کے پارلیمنٹ پر حملے میں ملوث ہونے یا کسی دہشت گرد تنظیم سے تعلق رکھنے کا ثبوت ملتا ہو۔ کسی ایک بھی اخبار یا صحافی یا ٹی وی چینل نے اس دروغ گوئی کے لیے گیلانی سے معذرت کرنے کو مناسب نہیں سمجھا۔ لیکن گیلانی کی مصیبتیں یہیں ختم نہیں

Scanned with CamScanner

ہوئیں۔ اس کے بری ہونے کے بعد اسپیشل سیل کے پاس محض ایک سازش رہ گئی، لیکن بغیر کسی ماسٹر مائنڈ کے۔ یہ بات، جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے، ایک مسئلے کا باعث بنی۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ گیلانی اب ایک آزاد شہری تھا — اخبار نویسوں سے ملنے، وکیلوں سے بات کرنے، اپنی شہرت کو بحال کرنے کے لیے آزاد۔ 8 فروری 2005 کی شام کو، سپریم کورٹ میں اس مقدمے کی سماعت کے آخری مرحلے پر، گیلانی اپنے وکیل کے گھر جا رہا تھا۔ ایک پراسرار بندوق بردار نے تاریکی سے نکل کر اس کو پانچ گولیاں ماریں۔ وہ معجزاتی طور پر بچ گیا۔ یہ کہانی میں آنے والا ایک ناقابل یقین نیا موڑ تھا۔ ظاہر ہے کوئی شخص اس بارے میں تشویش میں مبتلا تھا کہ گیلانی کیا کچھ جانتا ہے، وہ کیا کہہ سکتا ہے۔۔۔ تصور کیا جاسکتا تھا کہ پولیس اس واردات کی تفتیش کو اولین ترجیح دے گی، اس امید میں کہ شاید گیلانی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کرنے والوں تک پہنچنے سے پارلیمنٹ پر حملے کے معاملے میں کوئی نیا سراغ مل سکے۔ اس کے بجائے اسپیشل سیل نے گیلانی کے ساتھ ایسا سلوک کیا گویا خود پر حملے کے معاملے میں بھی وہی سب سے مشتبہ شخص ہو۔ انھوں نے اس کا کمپیوٹر ضبط کر لیا اور اس کی کار اپنے قبضے میں لے لی۔ سیکڑوں کارکنوں نے ہسپتال کے باہر جمع ہو کر اس اقدام قتل کی تحقیقات، اور اس سلسلے میں خود اسپیشل سیل کے بارے میں بھی تحقیقات کا مطالبہ کیا۔ (ظاہر ہے کہ ایسا قطعی نہیں ہوا۔ ایک سال سے زیادہ گزر چکا ہے کہ کسی نے اس معاملے میں کسی قسم کی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ عجیب بات!)

تو یہ شخص گیلانی تھا، جو اپنے ہولناک تجربے سے زندہ بچ نکلنے کے بعد یہاں جنتر منتر کے مظاہرے میں لوگوں کے درمیان موجود تھا اور کہہ رہا تھا کہ محمد افضل سزائے موت کا مستحق نہیں۔ اس کے لیے کتنا آسان تھا کہ وہ سر جھکائے اپنے گھر بیٹھا رہتا۔ اس کے حوصلے کے اس خاموش اظہار نے مجھے بے حد متاثر کیا۔

ایس اے آر گیلانی کے مقابل، صحافیوں اور فوٹو گرافروں کے ہجوم میں، اپنی لیمن ٹی شرٹ اور گیبرڈین کی پتلون میں نمایاں دکھائی نہ دینے کی کوشش کرتا، ہاتھ میں ایک چھوٹا ٹیپ ریکارڈر اٹھائے، ایک اور گیلانی کھڑا تھا۔ افتخار گیلانی۔ وہ بھی قید میں رہا تھا۔ اسے 9 جون 2002 کو گرفتار کر کے

Scanned with CamScanner

پولیس نے حراست میں لے لیا تھا۔ اس وقت وہ جموں سے نکلنے والے اخبار کشمیر ٹائمز کا رپورٹر تھا۔ اس پر آفیشل سیکرٹس ایکٹ کی خلاف ورزی کا الزام تھا۔ اس کا 'جرم' یہ تھا کہ اس کے پاس 'ہندوستانی مقبوضہ کشمیر' میں ہندوستانی فوجوں کی تعیناتی کی مکمل معلومات تھی۔ (معلوم ہوا کہ یہ 'معلومات' ایک پاکستانی تحقیقی ادارے کے ایک مطبوعہ مونوگراف پر مشتمل تھی جو انٹرنیٹ پر دستیاب ہے اور جو بھی چاہے اسے ڈاؤن لوڈ کر سکتا ہے۔) افتخار گیلانی کا کمپیوٹر ضبط کر لیا گیا۔ آئی بی کے اہلکاروں نے اس کی ہارڈ ڈرائیو میں گھس کر اس کی ڈاؤن لوڈ کی ہوئی فائلوں سے چھیڑ چھاڑ کی، 'ہندوستانی مقبوضہ کشمیر' کے لفظوں کو 'جموں اور کشمیر' کے لفظوں سے بدل دیا تاکہ اسے ایک ہندوستانی دستاویز کی شکل دی جا سکے، اور مزید یہ الفاظ بھی بڑھا دیے: 'Only for Reference. Strictly Not For Circulation' تاکہ یہ ظاہر کیا جا سکے کہ یہ ایک خفیہ دستاویز تھی جسے وزارت داخلہ سے باہر اسمگل کیا گیا تھا۔ ملٹری انٹیلی جنس کے ڈائرکٹر جنرل نے — اگرچہ اسے مونوگراف کی ایک کاپی فراہم کر دی گئی تھی — افتخار گیلانی کے وکیل کی ان متعدد اپیلوں کو نظر انداز کر دیا، خاموشی اختیار کی اور معاملے کی وضاحت کرنے سے چھ مہینے تک انکار کرتا رہا۔

ایک بار پھر اسپیشل سیل کے جاری کیے ہوئے جھوٹ کو اخبارات نے سعادت مندی سے جوں کا توں شائع کیا۔ ان میں سے چند جھوٹ درج ذیل ہیں:

''افتخار گیلانی، حریت کے سخت گیر رہنما سید علی شاہ گیلانی کے 35 سالہ داماد، کے بارے میں خیال کیا جا رہا ہے کہ اس نے شہر کی ایک عدالت میں اعتراف کیا ہے کہ وہ پاکستان کی خفیہ ایجنسی کا ایجنٹ ہے۔'' دی ہندوستان ٹائمز، 11 جون 2002: نیتا شرما۔

''افتخار گیلانی حزب المجاہدین کے سید صلاح الدین کا منتخب کردہ آدمی ہے۔ تحقیقات سے انکشاف ہوا ہے کہ افتخار ہندوستانی سکیورٹی ایجنسیوں کی نقل و حرکت کی اطلاعات صلاح الدین کو دیا کرتا تھا۔ اس نے اپنے اصل عزائم کو پوشیدہ رکھنے کے لیے صحافی کے پیشے کو اتنی کامیابی سے استعمال کیا تھا کہ اس کا پردہ فاش ہونے میں کئی سال لگ گئے، باخبر ذرائع کا کہنا ہے۔'' دی پائنیئر، پرمود کمار سنگھ۔

''گیلانی کے داماد کے گھر چھاپوں میں بے حساب دولت اور حساس دستاویزات برآمد ہوئی

Scanned with CamScanner

ہیں۔" ہندوستان، 10 جون 2002۔

اس بات کو بھول جائیے کہ پولیس کی فرد جرم میں درج ہے کہ اس کے گھر سے صرف 3450 روپے کی رقم برآمد ہوئی تھی۔

اس دوران دیگر میڈیا رپورٹوں میں کہا گیا کہ اس کی ملکیت میں ایک تین بیڈروم کا فلیٹ اور 22 لاکھ روپے کی غیر اعلان شدہ آمدنی ہے، اس نے 79 لاکھ انکم ٹیکس بچایا ہے، اور یہ کہ وہ اور اس کی بیوی گرفتاری سے بچنے کے لیے روپوش ہو گئے ہیں۔

لیکن گرفتار تو وہ ہو چکا تھا۔ جیل میں تھا۔ افتخار گیلانی کو مارا پیٹا گیا، بری طرح تذلیل کا نشانہ بنایا گیا۔ اپنی کتاب My Days In Prison میں اس نے بتایا ہے کہ اور چیزوں کے علاوہ اسے اپنی قمیص سے ٹوائلٹ صاف کرنے اور پھر کئی دن تک وہی قمیص پہننے پر مجبور کیا گیا۔ چھ مہینے تک عدالتی بحث اور گیلانی کے ساتھیوں کی پیروکاری کے بعد جب یہ بات واضح ہوگئی کہ اگر اس کے خلاف مقدمہ جاری رکھا گیا تو سخت شرمندگی کا سامنا کرنا ہوگا، تب اسے رہا کیا گیا۔

اب وہ یہاں موجود تھا۔ ایک آزاد شخص، جنتر منتر کے احتجاج کی رپورٹنگ کرنے آیا ہوا صحافی۔ مجھے خیال آیا کہ ایس اے آر گیلانی، افتخار گیلانی اور محمد افضل تہاڑ جیل میں ایک ہی وقت میں رہے ہوں گے (اور ان کے علاوہ سیکڑوں کم معروف کشمیری بھی جن کی کہانیوں سے ہم کبھی واقف نہیں ہو سکیں گے)۔

یہ بات کہی جا سکتی ہے اور کہی جائے گی کہ ایس اے آر گیلانی اور افتخار گیلانی کی مثالیں ہندوستان کے عدالتی نظام کی بدنامی کا سبب نہیں بنتیں بلکہ اس نظام کی غیر جانبداری اور خود کو درست کرنے کی صلاحیت کی عکاسی کرتی ہیں۔ یہ بات محض جزوی حد تک درست ہے۔ یہ دونوں اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ یہ دہلی میں رہنے والے کشمیری ہیں جن کے ساتھی درمیانہ طبقے سے تعلق رکھنے والے اور اپنی رائے کا اظہار کرنے پر قادر لوگ ہیں؛ صحافی اور یونیورسٹی کے استاد، جو انھیں اچھی طرح جانتے تھے اور دشوار وقت میں ان کے ساتھ آ کھڑے ہوئے۔ ایس اے آر گیلانی کی وکیل نندیتا ہکسر نے اس کی حمایت کے لیے آل انڈیا ڈیفنس کمیٹی بنائی (جس کی میں بھی ایک رکن تھی)۔ کارکنوں، وکیلوں اور صحافیوں نے گیلانی کے حق میں ایک منظم مہم چلائی۔ نامور وکیلوں رام جیٹھملانی،

Scanned with CamScanner

کے جی کنا بیرن اور ورندا گروور نے اس کے مقدمے کی پیروی کی۔ انھوں نے اس مقدمے کو کھول کر رکھ دیا۔ کہ یہ لغو مفروضوں، من گھڑت الزامات اور صریح جھوٹ کا ڈھیر تھا جسے ثابت کرنے کے لیے جعلی شہادتیں تیار کی گئی تھیں۔ چنانچہ عدالتی غیر جانبداری بلاشبہ وجود رکھتی ہے۔ لیکن یہ ایک شرمیلی مخلوق ہے، ہمارے عدالتی نظام کی بھول بھلیوں میں کہیں بہت اندر رہتی ہے اور اپنا چہرہ شاذ و نادر ہی دکھاتی ہے۔ اسے اپنے بھٹ سے باہر آ کر کھیلنے پر اکسانے کے لیے اعلیٰ ترین وکیلوں کی پوری ٹیم کو سخت محنت کرنی پڑی۔ اخباری محاورے میں اسے ہرکولیس کا سا کارنامہ (Herculean task) کہا جائے گا۔ محمد افضل کے ساتھیوں میں ہرکولیس شامل نہیں تھا۔

پانچ مہینوں کے عرصے میں، گرفتاری کے وقت سے اُس دن تک جب پولیس نے اس کے خلاف فرد جرم دائر کی، محمد افضل انتہائی سکیورٹی والی جیل میں بند تھا اور اسے کسی قسم کا قانونی دفاع یا قانونی مشورہ دستیاب نہ تھا۔ نہ اعلیٰ وکیل، نہ کوئی ڈیفنس کمیٹی (نہ ہندوستان میں اور نہ کشمیر میں)، اور نہ اس کے حق میں چلنے والی کوئی مہم۔ چاروں ملزموں میں وہ سب سے زیادہ مخدوش تھا۔ اس کا معاملہ گیلانی سے کہیں زیادہ پیچیدہ تھا۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ اس کا چھوٹا بھائی ہلال اس دوران بیشتر وقت کشمیر میں اسپیشل آپریشنز گروپ (SOG) کی غیر قانونی حراست میں رہا۔ اسے فرد جرم داخل کیے جانے کے بعد رہا کیا گیا۔ (یہ اس معمے کا ایک جز ہے جو باقی ٹکڑوں سے اس وقت جڑے گا جب کہانی آگے بڑھے گی۔)

تفتیشی افسر اسسٹنٹ کمشنر پولیس رجبیر سنگھ نے (جسے دہلی کے ''انکاؤنٹر اسپیشلسٹ'' کے لقب سے سراہا جاتا ہے کیونکہ اس نے متعدد ''دہشت گردوں'' کو ''مقابلوں'' میں ہلاک کیا ہے) 20 دسمبر 2001 کو، قواعد و ضوابط کی سنگین خلاف ورزی کرتے ہوئے، اسپیشل سیل میں ایک پریس کانفرنس کی۔ محمد افضل سے میڈیا کے سامنے ''اقبال جرم'' کروایا گیا۔ ڈپٹی کمشنر پولیس اشوک چند نے اخباری نمائندوں کو بتایا کہ افضل پولیس کے سامنے پہلے ہی اقبال کر چکا ہے۔ یہ بات بعد میں غلط ثابت ہوئی۔ پولیس کے سامنے افضل کا رسمی اقبال جرم اس کے اگلے دن ہوا (جس کے بعد بھی وہ پولیس کی تحویل میں اذیت رسانی کے خطرے کا شکار رہا — یہ بھی ضوابط کی سنگین خلاف ورزی تھی)۔ میڈیا کے روبرو اپنے ''اقبال جرم'' میں افضل نے خود کو پارلیمنٹ پر ہونے والے حملے میں مکمل طور پر

Scanned with CamScanner

ملوث کرلیا۔

اس ''میڈیا اعتراف'' کے دوران ایک عجیب بات پیش آئی۔ ایک سیدھے سوال کے جواب میں افضل نے واضح طور پر کہا کہ گیلانی کا اس حملے سے کوئی تعلق نہیں اور وہ مکمل طور پر بے قصور ہے۔ اس موقعے پر اے سی پی رجبیر سنگھ نے اسے ڈانٹ کر چپ کرا دیا اور میڈیا سے درخواست کی کہ وہ افضل کے ''اقبال جرم'' کا یہ حصہ شائع نہ کرے — اور میڈیا نے اس کی تعمیل کی! یہ بات تین مہینے بعد سامنے آئی جب ٹی وی چینل ''آج تک'' نے ''حملے کے سو دن'' نامی پروگرام میں اس ''اقبال جرم'' کو دوبارہ نشر کیا اور کسی طرح یہ حصہ بھی قطع و برید کے بغیر نشر ہو گیا۔ اس عرصے میں عام لوگوں کی نگاہ میں — جو قانون اور فوجداری ضوابط کے بارے کچھ زیادہ نہیں جانتے — افضل کا یہ ''اقبال جرم'' اس کے مجرم ہونے کا ثبوت تھا۔ چنانچہ ''معاشرے کے اجتماعی ضمیر'' کے فیصلے کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہ تھا۔

اس ''میڈیا'' اقبال جرم کے اگلے دن افضل سے ''باقاعدہ'' اقبال جرم کروایا گیا۔ مکمل طور پر بے نقص اور حد درجہ رواں یہ بیان جسے شستہ انگریزی میں ڈی سی پی اشوک چند کو املا کرایا گیا (ڈی سی پی کے اپنے لفظوں میں ''وہ بولتا گیا اور میں لکھتا گیا'')، ایک سربہ مہر لفافے میں ایک جوڈیشل مجسٹریٹ کے حوالے کیا گیا۔ اس اقبال جرم میں افضل نے، جو اب استغاثہ کی فرد جرم کا بنیادی کردار بن چکا تھا، ایک نہایت متاثر کن کہانی تیار کی جس سے تمام لوگ، واقعات اور اشیا آپس میں بڑی عمدگی سے جڑ گئیں — غازی بابا، مولانا مسعود اظہر، طارق نامی ایک شخص اور پانچ ہلاک شدہ دہشت گرد؛ ان کے آلات، ہتھیار اور گولہ بارود، وزارت داخلہ کے جاری کردہ پاس، لیپ ٹاپ، اور جعلی شناختی کارڈ؛ ایک مکمل فہرست جس میں بتایا گیا کہ کون سے کیمیکل کی کتنے کلوگرام مقدار اس نے کس کس جگہ سے خریدی، اور ٹھیک تناسب جس میں ان سب مادّوں کو ملا کر دھماکا خیز مواد تیار کیا گیا؛ اور اس نے جو ٹیلیفون کالیں کیں یا وصول کیں ان میں سے ہر ایک کا درست وقت اور موبائل فون کے نمبر۔ (کسی نامعلوم وجہ سے اس وقت تک افضل نے گیلانی کے بارے میں اپنا موقف تبدیل کر کے اب اسے پوری طرح سازش میں شریک کرلیا تھا۔)

''اقبال جرم'' کا ایک ایک نکتہ ان شواہد سے پوری طرح ہم آہنگ تھا جو پولیس اس وقت تک اکٹھے کر چکی تھی۔ دوسرے لفظوں میں، پولیس جو کہانی میڈیا کو کئی دن پہلے سنا چکی تھی، افضل کا اقبالی

Scanned with CamScanner

بیان اس میں اتنی ہی سہولت سے فٹ ہو جاتا تھا جیسے سنڈریلا کا پیر شیشے کی جوتی میں۔ (اگر یہ کوئی فلم ہوتی تو اسے ایک مکمل اسکرین پلے کہا جا سکتا تھا جس کے ساتھ اس میں دکھائی جانے والی اشیا کا صندوق بھی موجود ہو۔ دراصل، جیسا کہ ہمیں اب معلوم ہے، اس کی فلم تیار بھی کی گئی۔ زی ٹی وی کو چاہیے کہ افضل کو اسکرین پلے کی رائلٹی ادا کرے۔)

آخر کار ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ دونوں نے افضل کے اس اقبالی بیان کو ''ضوابط اور طریق کار کی خلاف ورزیوں اور نقائص'' کی بنیاد پر مسترد کر دیا۔ لیکن افضل کا اقبال جرم کسی نہ کسی طرح اب بھی موجود ہے، استغاثہ کے مقدمے کا تصوراتی محور۔ اور تکنیکی اور قانونی بنیاد پر مسترد کیے جانے سے پہلے یہ اقبال جرم اپنا ماورائے قانون مقصد پورا کر چکا تھا: 21 دسمبر 2001 کو ہندوستانی حکومت نے پاکستان کے خلاف اپنی فوجی کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اس کے پاس پاکستان کے ملوث ہونے کے ''ناقابل تردید شواہد'' موجود ہیں، جبکہ حکومت کے پاس پاکستان کے ملوث ہونے کا واحد ''ثبوت'' افضل کا اقبالی بیان تھا! افضل کا اقبال جرم۔ اور اسٹیکر پر درج منشور۔ ذرا اس پر غور کیجیے۔ اذیت رسانی کے زور پر کروائے گئے اس غیر قانونی اقبال جرم کی بنیاد پر لاکھوں فوجیوں کو، عوامی خزانے سے خطیر رقم خرچ کر کے، پاکستان کی سرحد پر لا کھڑا کیا گیا اور برصغیر کو نیوکلیئر اسلحے کے استعمال کی دھمکیوں کے کھیل میں الجھا دیا گیا جس نے پوری دنیا کو یرغمال بنا لیا۔

سرگوشی میں پوچھا جانے والا بڑا سوال: کیا معاملہ اس کا الٹ بھی ہو سکتا ہے؟ کیا اقبال جرم نے جنگ کے حالات پیدا کیے، یا جنگ چھیڑنے کی ضرورت نے اقبال جرم کرانے کی ضرورت کو پیدا کیا؟

بعد میں، جب اعلیٰ عدالتوں نے افضل کے اعتراف کو مسترد کر دیا، تو جیش محمد اور لشکر طیبہ کا ذکر بالکل بند ہو گیا۔ حملے کو پاکستان سے جوڑنے والی چیز اب صرف ہلاک شدہ فدائین کی شناخت رہ گئی۔ محمد افضل نے، جو اب تک پولیس کی تحویل میں تھا، انھیں محمد، رانا، راجہ، حمزہ اور حیدر کے نام سے شناخت کیا۔ وزیر داخلہ نے کہا کہ یہ لوگ ''پاکستانیوں جیسے دکھائی دیتے تھے''؛ پولیس کا کہنا تھا کہ یہ پاکستانی تھے؛ مقدمہ چلانے والی نچلی عدالت نے بھی کہا کہ یہ پاکستانی تھے۔ اور بس، بات یہاں ختم ہو گئی۔ اگر ہمیں بتایا جاتا کہ ان کے نام پپی، باؤنسی، لکی، جولی اور کڈ نگمانی تھے اور یہ اسکینڈے نیویا

کے رہنے والے تھے، تو ہمیں وہ بھی ماننا پڑتا۔ ہمیں اب تک معلوم نہیں کہ وہ کون ہیں اور کہاں کے ہیں۔ کیا کوئی یہ جاننے کا تجسس رکھتا ہے؟ لگتا تو نہیں۔ ہائی کورٹ نے کہا، ''اس طرح پانچوں ہلاک شدگان کی شناخت متعین ہو جاتی ہے۔ اگر ایسا نہ بھی ہو تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اصل بات ملزموں کا ان ہلاک شدگان سے تعلق ہے نہ کہ اُن کے نام۔''

عدالت کے روبرو اپنے بیان میں (جسے ''ملزم کا بیان'' کہا جاتا ہے اور جو پولیس کی تحویل میں نہیں بلکہ عدالت میں دیا جاتا ہے) افضل نے کہا، ''میں نے کسی دہشت گرد کو شناخت نہیں کیا۔ پولیس نے مجھے دہشت گردوں کے نام بتائے اور انھیں شناخت کرنے پر مجبور کیا۔'' لیکن اس وقت تک اسے بہت دیر ہو چکی تھی۔ مقدمے کے پہلے ہی دن عدالت کی مقرر کردہ وکیل صفائی نے افضل کی جانب سے لاشوں کی شناخت اور پوسٹ مارٹم رپورٹوں کو، کسی باقاعدہ ثبوت کے بغیر، غیر متنازع شہادت کے طور پر قبول کر لیا تھا! اس حیران کن اقدام نے افضل کے لیے سنگین نتائج پیدا کیے۔ سپریم کورٹ کے فیصلے میں کہا گیا، ''افضل کے خلاف پہلی واقعاتی شہادت یہ ہے کہ اسے معلوم تھا کہ ہلاک شدہ دہشت گرد کون تھے۔ اس نے ہلاک شدہ دہشت گردوں کی لاشوں کو شناخت کیا تھا۔ اس نکتے پر شہادت مکمل ہے۔''

بلا شبہ یہ ممکن ہے کہ مرنے والے دہشت گرد غیر ملکی رہے ہوں۔ لیکن یہ بھی اتنا ہی ممکن ہے کہ وہ غیر ملکی نہ رہے ہوں۔ لوگوں کو ہلاک کر کے انھیں ''غیر ملکی دہشت گردوں'' کے طور پر شناخت کرنا، یا مردہ لوگوں کو جعلی طور پر ''غیر ملکی دہشت گرد'' قرار دینا، یا زندہ لوگوں پر دہشت گرد ہونے کا غلط الزام لگانا پولیس اور سکیورٹی فورسز کے لیے نہ کشمیر میں کوئی غیر معمولی بات ہے اور نہ دہلی کی سڑکوں پر۔

کشمیر کے بہت سے ایسے معاملات میں جن کی تفصیلات مرتب کی گئیں، سب سے معروف معاملہ چھتی سنگھ پورہ کے قتل عام کا ہے، جس نے آگے چل کر ایک ملک گیر اسکینڈل کی صورت اختیار کر لی۔ 20 اپریل 2000 کی رات کو، امریکی صدر بل کلنٹن کی نئی دہلی آمد سے ذرا پہلے، چھتی سنگھ پورہ گاؤں کے 35 سکھوں کو ہندوستانی فوجی وردیاں پہنے ''نامعلوم بندوق برداروں'' نے ہلاک کر دیا۔ (کشمیر میں بہت سے لوگوں کو شبہ ہے کہ اس قتل عام کے پیچھے ہندوستانی سکیورٹی فورسز ہی تھیں۔) پانچ دن بعد اسپیشل آپریشنز گروپ اور 7 راشٹریہ رائفلز نے (جو بغاوت سے نمٹنے کے لیے فوج کا ایک

Scanned with CamScanner

خصوصی گروپ ہے) اپنے مشترکہ آپریشن میں پتھری بل نامی گاؤں کے پانچ باشندوں کو ہلاک کر دیا۔ اگلے روز انھوں نے اعلان کیا کہ یہ مارے جانے والے پاکستان سے آئے ہوئے شدت پسند تھے جنھوں نے چھتی سنگھ پورہ میں سکھوں کا قتل عام کیا تھا۔ ان پانچوں کی لاشیں جلی ہوئی اور مسخ شدہ تھیں۔ فوجی وردیوں کے نیچے (وردیاں جلی ہوئی نہیں تھیں) انھوں نے عام شہری لباس پہن رکھے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ سب مقامی لوگ تھے جنھیں ضلع اننت ناگ سے گرفتار کیا گیا اور بعد میں بہیمانہ طور پر ہلاک کر دیا گیا۔

اس قسم کے اور بھی واقعات ہیں:

20 اپریل 2004 کو لولاب وادی میں تعینات 18 راشٹریہ رائفلز نے دعویٰ کیا کہ اس نے ایک سخت مقابلے میں چار غیر ملکی شدت پسندوں کو ہلاک کیا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ چاروں جموں کے رہنے والے عام مزدور تھے جنھیں فوج نے مزدوری کے لیے بھرتی کیا اور کپواڑا لے گئی۔ ایک گمنام خط کے ذریعے ان میں سے ایک مزدور کے گھر والوں کو اس واقعے کی اطلاع ملی جو کپواڑا پہنچے اور آخر کار لاشیں قبروں سے نکلوانے میں کامیاب ہوئے۔

9 نومبر 2004 کو فوج نے جموں کے علاقے ناگروٹا میں ہتھیار ڈالنے والے 47 شدت پسندوں کو، جنرل آفیسر کمانڈنگ XVI کور اور جموں و کشمیر کے ڈائرکٹر جنرل پولیس کی موجودگی میں، میڈیا کے سامنے نمائش کے لیے پیش کیا۔ بعد میں جموں و کشمیر پولیس کو معلوم ہوا کہ ان میں سے 27 محض بے روزگار افراد تھے جنھیں جعلی نام اور جعلی عرفیتیں دی گئی تھیں اور اس ناٹک میں حصہ لینے کے عوض سرکاری نوکریاں دلانے کا وعدہ کیا گیا تھا۔

یہ محض چند مثالیں ہیں جن سے یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے کہ کسی اور شہادت کی غیر موجودگی میں پولیس کی بات پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

تیز رفتار نچلی عدالت میں مقدمے کی سماعت مئی 2002 میں شروع ہوئی۔ ہمیں اس ماحول کو فراموش نہیں کرنا چاہیے جس میں یہ مقدمہ چلایا جا رہا تھا۔ نائن الیون کے حملوں سے پیدا ہونے والا ہیجان ابھی تک فضا میں موجود تھا۔ امریکہ افغانستان میں اپنی فتح کے غرور میں تھا۔ گجرات فرقہ وارانہ جنون کے ہاتھوں تشنج میں تھا۔ چند مہینے پہلے سابرمتی ایکسپریس کی بوگی S-6 میں لگائی جانے والی

Scanned with CamScanner

آگ میں 58 یاتری زندہ جل گئے تھے۔ اس کا ''انتقام'' لینے کے لیے ایک منظم قتل عام کیا گیا جس میں دو ہزار مسلمانوں کو سر عام قتل کیا گیا اور ڈیڑھ لاکھ مسلمانوں کو ان کے گھروں سے کھدیڑ دیا گیا۔

افضل کے لیے جو کوئی نقصان دہ بات پیش آ سکتی تھی وہ ہو کر رہی۔ وہ ایک انتہائی سکیورٹی والی جیل میں قید تھا جہاں اس کا بیرونی دنیا سے قطعی کوئی رابطہ نہ تھا، اور نہ پیسے تھے کہ وہ کسی پیشہ ور وکیل کی خدمات حاصل کر سکتا۔ مقدمے کی سماعت کے تیسرے ہفتے میں عدالت کی مقرر کردہ وکیل صفائی نے مقدمے سے اس بنا پر سبکدوش کیے جانے کی درخواست کی کہ اسے ایس اے آر گیلانی کے دفاع کی ٹیم میں پیشہ ورانہ طور پر شامل کر لیا گیا ہے۔ عدالت نے اس کے جونیئر نا تجربہ کار وکیل کو افضل کی پیروی کے لیے مقرر کر دیا۔ اس نے اپنے موکل سے ہدایات حاصل کرنے کے لیے جیل میں ایک بار بھی ملاقات نہ کی۔ اس نے افضل کے دفاع میں ایک بھی گواہ کو طلب نہ کیا اور استغاثہ کے لائے ہوئے گواہوں پر تقریباً کوئی جرح نہ کی۔ اس وکیل صفائی کے تقرر کے پانچ دن بعد افضل نے عدالت سے کوئی اور وکیل مقرر کرنے کی درخواست کی اور پانچ وکیلوں کے نام دے کر امید کی کہ عدالت ان میں سے کسی کی خدمات اس کے وکیل صفائی کے طور پر حاصل کر لے گی۔ ان پانچوں نے انکار کر دیا۔ (میڈیا میں ہونے والے جنونی پروپیگنڈے کو دیکھتے ہوئے یہ بات باعثِ تعجب نہیں تھی۔ مقدمے کی سماعت کے ایک اگلے مرحلے میں جب سینئر ایڈووکیٹ رام جیٹھملانی نے گیلانی کی طرف سے پیش ہونے پر آمادگی ظاہر کی، تو شوسینا کے کارکنوں کے ہجوم نے بمبئی میں اس کے دفتر پر حملہ کیا۔) جج نے اس بارے میں اپنی معذوری ظاہر کی اور افضل کو گواہوں پر خود جرح کرنے کی اجازت دے دی۔ جو شخص فوجداری قانون، اس میں کیے گئے نئے اضافوں، مثلاً POTA، اور قانون شہادت اور ٹیلیگراف ایکٹ میں کی جانے والی ترامیم کی باریکیوں سے ناواقف ہو، اس کے لیے یہ کام ناممکن ہے۔ تجربہ کار وکیلوں تک کو ان نئے قوانین سے پوری طرح واقف رہنے کے لیے بہت وقت لگانا پڑتا ہے۔

نچلی عدالت میں افضل کے خلاف کیس استغاثہ کے 80 گواہوں کی شہادتوں کی بنیاد پر تیار کیا گیا تھا جن میں مالک مکان، دکاندار، سیل فون کمپنیوں کے تکنیکی اہلکار اور خود پولیس کے افراد شامل تھے۔ یہ مقدمے کا ایک اہم مرحلہ تھا جب کیس کی قانونی بنیادیں تیار کی جا رہی تھیں۔ ان شہادتوں کو باریک بینی سے جانچ کر ریکارڈ کا حصہ بنانے، صفائی کے گواہوں کو طلب کرنے اور استغاثہ کے

گواہوں پر جرح کرنے کے لیے نہایت تفصیلی اور کمر توڑ قانونی محنت درکار تھی۔ اگر نچلی عدالت کا فیصلہ ملزم کے خلاف ہو (نچلی عدالتیں اپنے قدامت پرست رویے کے لیے بدنام ہیں) تب بھی اعلیٰ عدالتوں میں سماعت کے دوران وکیل شہادتوں پر مزید کام کر سکتے ہیں۔ اس انتہائی نازک مرحلے کے دوران افضل بالکل بے مدافعت رہا۔ اسی مرحلے پر اس کے پیروں کے نیچے سے تختہ سرک گیا اور گلے میں پھندا سخت ہو گیا۔

اس کے باوجود مقدمے کے دوران اسپیشل سیل کی الماری میں چھپا کر رکھے ہوئے ڈھانچے بل بل کر باہر گرنے اور ایک شرمندہ کن ڈھیر کی صورت جمع ہونے لگے۔ یہ بات واضح ہو گئی کہ جھوٹ جمع کرنے، فرضی کہانیاں گھڑنے، جعلی دستاویزات بنانے اور قواعد وضوابط کی سنگین خلاف ورزیاں کرنے کا عمل تفتیش کے پہلے دن ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ اگرچہ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے فیصلوں میں ان خلاف ورزیوں کی نشان دہی کی گئی ہے، لیکن اس بارے میں صرف پولیس کو تنبیہ کرنا، یا بعض مقامات پر ان کو ''پریشان کن امر'' قرار دینا کافی سمجھا گیا (جو بجائے خود ایک پریشان کن امر ہے)۔ مقدمے کی سماعت کے دوران ایک مرتبہ بھی پولیس کو سنجیدگی سے سرزنش نہیں کی گئی، سزا دینے کا تو ذکر ہی کیا۔ درحقیقت اسپیشل سیل نے ہر قدم پر قواعد وضوابط کی بابت اپنی قبیح بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔ جس بھونڈے اور بے حس طریقے سے تفتیش کی گئی اس سے یہ تشویشناک اندازہ ہوتا ہے کہ پولیس کو یقین تھا کہ اس کی کارگزاری کا کسی کو پتا نہیں چلے گا، اور اگر پتا چل بھی گیا تو اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ پولیس کا یہ اعتماد غلط ثابت نہیں ہوا۔

تفتیش کے تقریباً ہر قدم پر جعلسازی دکھائی دیتی ہے۔

گرفتاری اور برآمدگی کے وقت اور مقام پر غور کیجیے: دہلی پولیس نے کہا کہ افضل اور شوکت کو ان اطلاعات کی بنیاد پر سرینگر میں گرفتار کیا گیا جو گیلانی نے دہلی میں گرفتار ہونے کے بعد فراہم کیں۔ عدالت کا ریکارڈ بتاتا ہے کہ شوکت اور افضل کو تلاش کرنے کی بابت سرینگر پولیس کے نام پیغام 15 دسمبر کو صبح پونے چھ بجے بھیجا گیا۔ لیکن دہلی پولیس کے ریکارڈ کے مطابق گیلانی کو دہلی میں 15 دسمبر کو صبح دس بجے — یعنی سرینگر میں شوکت اور افضل کی تلاش شروع کیے جانے کے چار گھنٹے بعد — گرفتار کیا گیا۔ اس فرق کی کوئی وضاحت نہیں کی جا سکی۔ ہائی کورٹ کے فیصلے میں یہ بات ریکارڈ پر

Scanned with CamScanner

لائی گئی ہے کہ پولیس کے بیان میں ''اہم تضاد'' پایا جاتا ہے اور یہ سچ نہیں ہو سکتا۔ اسے ''پریشان کن امر'' قرار دیا گیا۔ دہلی پولیس کو جھوٹ بولنے کی ضرورت کیوں پیش آئی، یہ سوال نہ پوچھا گیا اور نہ اس کا جواب دیا گیا۔

جب پولیس کسی شخص کو گرفتار کرتی ہے تو ضابطے کے طریق کار کے مطابق یہ لازمی ہے کہ اس کے عوامی گواہ موجود ہوں جو گرفتاری کے میمو پر، اور گرفتار ہونے والے شخص سے برآمد ہونے والی اشیا — سامان، نقدی، دستاویزات، وغیرہ — کے سلسلے میں ضبطی کے میمو پر دستخط کریں۔ پولیس کا دعویٰ ہے کہ اس نے افضل اور شوکت کو سرینگر میں 15 دسمبر کو دن کے گیارہ بجے گرفتار کیا۔ اس کا کہنا ہے کہ اس نے وہ ٹرک اپنی تحویل میں لیا جس میں سوار ہو کر وہ فرار ہونے کی کوشش کر رہے تھے (یہ ٹرک شوکت کی بیوی کے نام پر رجسٹرڈ تھا)۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ انھوں نے افضل سے ایک نوکیا موبائل فون، ایک لیپ ٹاپ اور دس لاکھ روپے برآمد کیے۔ عدالت کے روبرو اپنے بیان میں افضل کہتا ہے کہ اسے سرینگر میں ایک بس اسٹاپ سے گرفتار کیا گیا اور کوئی لیپ ٹاپ، موبائل فون یا رقم اس سے برآمد نہیں کی گئی۔

یہ بات ایک اسکینڈل کا درجہ رکھتی ہے کہ افضل اور شوکت دونوں کی گرفتاری کے میمو پر دہلی میں، گیلانی کے چھوٹے بھائی بسم اللہ نے، جو اس وقت لودی روڈ کے تھانے میں غیر قانونی حراست میں تھا، دستخط کیے۔ اُدھر دو گواہ جنھوں نے فون، لیپ ٹاپ اور دس لاکھ روپے کی ضبطی کے میمو پر دستخط کیے، وہ دونوں جموں و کشمیر پولیس کے اہلکار ہیں۔ ان میں سے ایک ہیڈ کانسٹبل محمد اکبر (استغاثہ کا گواہ نمبر 62) تھا جو، جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے، محمد افضل کے لیے اجنبی نہ تھا اور کوئی ایسا عام پولیس والا نہ تھا جو اتفاقاً وہاں سے گزر رہا ہو۔ جموں و کشمیر پولیس کے اپنے اعتراف کے مطابق بھی افضل اور شوکت کو سب سے پہلے پارمپورہ کی فروٹ منڈی میں دیکھا گیا۔ کسی وجہ سے، جو بیان نہیں کی گئی، انھیں وہاں گرفتار نہیں کیا گیا۔ پولیس کا کہنا ہے کہ ان کا تعاقب کیا گیا، یہاں تک کہ وہ کم بھیڑ بھاڑ والی جگہ پہنچ گئے — یعنی ایسی جگہ جہاں گواہی دینے والا کوئی عام آدمی موجود نہ تھا۔

استغاثہ کے کیس میں یہ ایک اور سنگین تضاد ہے۔ اس کے بارے میں ہائی کورٹ کا کہنا ہے، ''ملزموں کی گرفتاری کے وقت کے ریکارڈ میں سنگین نقص پایا گیا ہے''۔ دہلا دینے والی بات یہ ہے کہ

Scanned with CamScanner

پولیس اسی گرفتاری کے موقعے پر ان اشیا کی برآمدگی کا دعویٰ کرتی ہے جنھیں افضل کے اس سازش میں شریک ہونے کے اہم ترین شواہد کے طور پر پیش کیا گیا: لیپ ٹاپ اور موبائل فون۔

گرفتاری کے وقت اور مقام کے معاملے میں اور جرم میں ملوث کرنے والے لیپ ٹاپ اور دس لاکھ کی رقم کی برآمدگی کے متعلق، ایک بار پھر، ایک ''دہشت گرد'' کے بیان کے مقابل، صرف پولیس کا بیان موجود ہے۔

پولیس کا بیان ہے کہ ضبط کیے گئے لیپ ٹاپ میں وہ فائلیں موجود تھیں جن کے ذریعے وزارت داخلہ کے جعلی پاس اور جعلی شناختی کارڈ تیار کیے گئے۔ اس میں کوئی اور کارآمد معلومات موجود نہ تھی۔ اس کا دعویٰ ہے کہ افضل اسے غازی بابا کو لوٹانے کے لیے سرینگر لے جا رہا تھا۔ تفتیشی افسر اے سی پی رجبیر سنگھ نے کہا کہ کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک 16 جنوری 2002 کو (یعنی برآمدگی کے پورے ایک مہینے بعد) سیل کی گئی۔ لیکن کمپیوٹر بتاتا ہے کہ اسے اس تاریخ کے بعد بھی استعمال کیا جاتا رہا۔ عدالتوں نے اس امر پر غور کیا لیکن اس سے کوئی نتیجہ برآمد نہ کیا۔ (قیاس آرائی: کیا یہ عجیب بات نہیں کہ اس کمپیوٹر پر پائی جانے والی واحد سنگین شہادت جعلی پاس اور شناختی کارڈ بنانے والی فائل تھی؟ اور زی ٹی وی کی فلم کا ایک کلپ جس میں پارلیمنٹ بلڈنگ دکھائی گئی تھی۔ اگر باقی تمام معلومات کو مٹا دیا گیا تو اسے کیوں نہیں مٹایا گیا؟ اور ایک بین الاقوامی دہشت گرد تنظیم کے چیف آف آپریشنز کو — غازی بابا کو — اس لیپ ٹاپ کی — اس پر بنے ہوئے خراب آرٹ ورک سمیت — اس قدر فوری ضرورت کیوں تھی؟)

موبائل فون کے کال ریکارڈ پر غور کیجیے: ذرا دیر غور سے دیکھنے پر اسپیشل سیل کے پیش کردہ بیشتر ''ٹھوس شواہد'' مشتبہ معلوم ہونے لگتے ہیں۔ استغاثہ کے کیس کی ریڑھ کی ہڈی موبائل فونوں، سم کارڈوں، کمپیوٹرائزڈ کال ریکارڈ کے علاوہ سیل فون کمپنیوں کے اہلکاروں اور ان دکانداروں کی گواہیوں پر مشتمل ہے جنھوں نے افضل اور اس کے ساتھیوں کو یہ فون اور سم کارڈ فروخت کیے تھے۔ کال ریکارڈ جو یہ ثابت کرنے کے لیے پیش کیا گیا تھا کہ شوکت، افضل، گیلانی اور محمد (ہلاک شدہ دہشت گردوں میں سے ایک) حملہ شروع ہونے کے وقت سے ذرا پہلے ایک دوسرے سے مسلسل رابطے میں تھے، محض غیر تصدیق شدہ پرنٹ آؤٹس پر مشتمل تھا، اصل دستاویزات کی فوٹو کاپی تک

Scanned with CamScanner

نہیں۔ یہ بلنگ سسٹم میں موجود ٹیکسٹ فائلوں کے پرنٹ آؤٹ تھے جنھیں آسانی سے اور کسی بھی وقت تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً پیش کیا گیا کال ریکارڈ یہ بتاتا ہے کہ ایک ہی سم کارڈ، لیکن الگ الگ IMEI نمبروں والے دو موبائل فونوں سے، ٹھیک ایک ہی وقت پر دو الگ الگ کالیں کی گئیں! اس کا مطلب ہے کہ یا تو سم کارڈ کا کلون (clone) تیار کیا گیا ہوگا یا پھر ریکارڈ میں جعلسازی کی گئی ہے۔

سم کارڈ پر غور کیجیے: استغاثہ نے اپنی کہانی کی تصدیق کرنے کے لیے ایک مخصوص موبائل فون نمبر — 9811489429 — پر بے تحاشا انحصار کیا ہے۔ پولیس کا بیان ہے کہ یہ افضل کا نمبر تھا — وہی نمبر جس پر افضل نے محمد سے، افضل نے شوکت سے، اور شوکت نے گیلانی سے رابطہ کیا۔ پولیس کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہ نمبر ہلاک شدہ دہشت گردوں کے شناختی کارڈوں کی پشت پر لکھا ہوا ملا۔ کیسی سہولت کی بات ہے! بلونگڑا گم ہو جائے تو ماما کو 9811489429 پر فون کر کے اطلاع دیجیے، شکریہ۔ (اس بات کی نشان دہی بھی کی جانی چاہیے کہ ضابطے کے مطابق موقع واردات سے اکٹھے کیے گئے شواہد کو سیل کیا جانا ضروری ہوتا ہے۔ ان شناختی کارڈوں کو کبھی سیل نہیں کیا گیا اور یہ پولیس کی تحویل میں رہے جہاں انھیں کبھی بھی تبدیل کیا جاسکتا تھا۔)

اس بات کے ثبوت میں کہ 9811489429 واقعی افضل کا نمبر تھا، پولیس کے پاس صرف افضل کا اقبالی بیان ہے، جو ہم دیکھ چکے ہیں کہ شہادت کے طور پر مسترد کر دیا گیا۔ خود یہ سم کارڈ بھی دستیاب نہیں ہوا۔ پولیس نے استغاثہ کے ایک گواہ کمل کشور کو پیش کیا جس نے افضل کو شناخت کیا اور کہا کہ اس نے افضل کے ہاتھ ایک موٹرولا فون اور ایک سم کارڈ 4 دسمبر 2001 کو فروخت کیا تھا۔ تاہم استغاثہ کا کیس جس کال ریکارڈ پر منحصر ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سم کارڈ 6 نومبر کو بھی — یعنی جس روز افضل نے اسے خریدا اس سے پورا ایک مہینہ پہلے — استعمال میں تھا! چنانچہ یا تو گواہ کا بیان جھوٹا ہے، یا کال ریکارڈ جعلی ہے۔ ہائی کورٹ نے اس تضاد کو یہ کہہ کر نمٹا دیا کہ کمل کشور نے صرف یہ کہا تھا کہ اس نے افضل کے ہاتھ ایک سم کارڈ فروخت کیا تھا، یہ نہیں کہا کہ اسی نمبر کا سم کارڈ بیچا تھا۔ سپریم کورٹ کے فیصلے میں بلندی سے یہ ارشاد کیا گیا، ''سم کارڈ افضل کے ہاتھ لازماً 4 دسمبر 2001 سے پہلے کسی وقت فروخت کیا گیا ہوگا۔'' اور بس، میرے دوستو، معاملہ ختم۔

ملزم کی شناخت کے طریق کار پر غور کیجیے: استغاثہ کے گواہوں کے ایک پورے سلسلے نے،

Scanned with CamScanner

جن میں سے بیشتر دکاندار تھے، افضل کو ایک ایسے شخص کے طور پر شناخت کیا جس کے ہاتھ انھوں نے مختلف اشیا فروخت کی تھیں: امونیم نائٹریٹ، المونیم پاؤڈر، گندھک، سجاتا مکسر گرائنڈر، خشک میوے کی تھیلیاں، وغیرہ۔ شناخت کا عام طریق کار اختیار کیا جاتا تو ان گواہوں سے متعدد افراد پر مشتمل شناختی پریڈ دیکھنے اور ان میں سے افضل کو پہچاننے کے لیے کہا جانا ضروری تھا۔ ایسا نہیں ہوا۔ اس کے بجائے انھوں نے افضل کو اس وقت شناخت کیا جب افضل پولیس کو، جس وقت وہ اس کی تحویل میں تھا، ان دکانوں تک ''خود لے کر گیا'' اور اس کا تعارف دکانداروں سے پارلیمنٹ پر حملے کی واردات کے ایک ملزم کی حیثیت سے کرایا گیا۔ (کیا ہمیں یہ قیاس آرائی کرنے کی اجازت ہے کہ آیا وہ پولیس کو ان دکانوں تک لے کر گیا تھا یا پولیس اسے وہاں لے کر گئی تھی؟ آخر وہ ان کی تحویل میں تھا، اذیت رسانی کے خطرے کا ہر وقت شکار۔ اگر ان حالات میں اس سے کرایا گیا اقبال جرم قانونی اعتبار سے مشکوک ہے، تو پھر یہ تمام چیزیں کیوں مشکوک نہیں؟)

ججوں نے ضابطے کے طریق کار کی ان خلاف ورزیوں پر غور ضرور کیا لیکن انھیں زیادہ سنجیدگی سے لینے کی ضرورت نہ سمجھی۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کے خیال میں عام لوگوں کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ جھوٹ بول کر کسی بے قصور شخص کو کسی جرم میں ملوث کریں۔ لیکن عام لوگ میڈیا کے جس ہمہ گیر اور پرشور پروپیگنڈے کی زد میں رہے تھے، خصوصاً اس معاملے میں، کیا اس کو دیکھتے ہوئے بھی یہ بات درست مانی جا سکتی ہے؟ اگر آپ اس حقیقت کو ذہن میں رکھیں کہ عام دکاندار، خصوصاً وہ جو 'گفار مارکیٹ' میں الیکٹرانکس اشیا بغیر رسیدوں کے فروخت کرتے ہیں، مکمل طور پر دہلی پولیس کے احسان مند ہیں، کیا تب بھی یہ بات درست مانی جا سکتی ہے؟

میں نے اب تک جن تضادات کا ذکر کیا ہے ان میں سے کوئی بھی میری زبردست سراغرسانی کا نتیجہ نہیں۔ ان میں سے بیشتر ایک نہایت عمدہ کتاب December 13th: Terror Over Democracy میں، جسے نرملینگشو مکھرجی نے مرتب کیا ہے؛ پیپلز یونین فار ڈیموکریٹک رائٹس، دہلی، کی شائع کردہ دو رپورٹوں میں، اور سب سے اہم بات یہ کہ مقدمہ چلانے والی نچلی عدالت، ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے فیصلوں میں، نہایت تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔ یہ تمام پبلک دستاویزات ہیں جو اس وقت میری میز پر رکھی ہوئی ہیں۔ ایک طرف تو یہ ایک پوری دھندلی

Scanned with CamScanner

کائنات منکشف ہونے کے لیے بے تاب ہے اور دوسری طرف ہمارے ٹی وی چینل ناقص معلومات رکھنے والے افراد اور لالچی سیاست کاروں کے درمیان کھوکھلے مباحثے منعقد کرانے میں مصروف ہیں ۔ایسا کیوں ہے؟ ایسا کیوں ہے کہ چند اکا دکا آزاد مبصروں کے سوا ہمارے اخبارات صفحہ اول پر اس قسم خبریں شائع کرنے میں مصروف ہیں کہ محمد افضل کو پھانسی دینے والا کون ہوگا، اور اس طرح کی ہولناک تفصیلات بتا رہے ہیں کہ جس رسی کے پھندے سے اسے پھانسی دی جائے گی اس کی لمبائی (60 میٹر) اور وزن (3.75 کلوگرام) کیا ہوگا۔(انڈین ایکسپریس، 16 اکتوبر 2006)۔

کیا ہمیں یہاں رک کر تمام آزاد صحافت کی ثنا میں چند نعرے بلند کرنے چاہییں؟

بیشتر لوگوں کے لیے ایسا کرنا آسان نہیں، لیکن اگر آپ ایسا کر سکیں تو خود کو 'پولیس خیر ہے/ دہشت گرد شر ہیں' والے طرز فکر سے، ایک لمحے کے لیے ہی سہی، علیحدہ کر لیجیے۔ جو شواہد دستیاب ہیں وہ اپنے نظریاتی سہارے سے محروم ہوتے ہی نہایت تشویشناک امکانات کا دروازہ کھول دیتے ہیں۔ یہ ان سمتوں میں اشارہ کرتے ہیں جدھر ہم میں سے بیشتر لوگ نہ دیکھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

اگر سب سے زیادہ نظر انداز کی گئی قانونی دستاویز کے لیے کوئی انعام مقرر ہو تو وہ محمد افضل کے عدالت کے سامنے ضابطۂ فوجداری کی دفعہ 133 کے تحت دیے ہوئے ''ملزم کے بیان'' کو ملے گا۔ اس بیان میں اس کے خلاف شہادتیں عدالت کی طرف سے سوالوں کی شکل میں پیش کی گئیں۔ افضل اپنے جوابات میں ان شہادتوں کو یا تو قبول کر سکتا تھا یا ان پر اعتراض کر سکتا تھا۔ افضل کے معاملے میں، یہ دیکھتے ہوئے کہ اسے اپنی بات سنے جانے کا کوئی حقیقی موقع دستیاب نہیں ہوا، یہ بیان ہی واحد دستاویز ہے جو اس کی کہانی اس کی اپنی آواز میں سناتی ہے۔

اس دستاویز میں افضل استغاثہ کی جانب سے خود پر لگائے گئے بعض الزامات کو تسلیم کرتا ہے۔ وہ مانتا ہے کہ وہ طارق نامی ایک شخص سے ملا تھا۔ وہ مانتا ہے کہ طارق نے اسے محمد نامی ایک شخص سے ملوایا تھا۔ وہ مانتا ہے کہ اس نے محمد کو دہلی آنے میں اور ایک سیکنڈ ہینڈ سفید ایمبیسڈر کار خریدنے میں مدد دی تھی۔ وہ مانتا ہے کہ محمد ان پانچ فدائین میں شامل تھا جو حملے میں ہلاک ہوئے۔ افضل کے دیے ہوئے اس بیان کی اہم بات یہ ہے کہ اس میں اس نے خود کو مکمل طور پر بری الذمہ قرار نہیں دیا اور نہ بالکل بے قصور ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ لیکن اس نے اپنے افعال کو ایک ایسے تناظر میں رکھ دیا ہے جو تباہ

کن ہے۔ افضل کا بیان اس ضمنی کردار کی وضاحت کرتا ہے جو اس نے پارلیمنٹ پر حملے میں ادا کیا۔ لیکن یہ بیان ان باتوں کی تفہیم کا بھی تقاضا کرتا ہے کہ اس واردات کی تفتیش ناقص طریقے سے کیوں کی گئی، اور اس تفتیش نے اپنے نازک ترین مرحلوں پر خود کو سمیٹ کیوں لیا، اور کیا وجہ ہے کہ ہمیں تفتیش کے ان واضح نقائص کو محض نااہلی اور بھونڈے پن پر محمول کر کے انھیں بے پروائی سے نظرانداز نہیں کر دینا چاہیے۔ اگر ہم افضل کی بات پر اعتبار نہ بھی کریں، تب بھی ہمیں اس مقدمے اور اسپیشل سیل کے ادا کردہ کردار کے بارے میں جو کچھ معلوم ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ بات ناقابلِ معافی معلوم ہوتی ہے کہ اس سمت نظر ہی نہ ڈالی جائے جدھر افضل اشارہ کر رہا ہے۔ وہ اپنے بیان میں مخصوص معلومات فراہم کرتا ہے — نام، مقامات، تاریخیں۔ (یہ آسان بات نہیں رہی ہوگی، اس لحاظ سے کہ اس کا خاندان، اس کے بھائی، اس کی بیوی اور اس کا کمسن بچہ، کشمیر میں رہتے ہیں اور اپنے بیان میں وہ جن لوگوں کا نام لے کر ذکر کر رہا ہے آسانی سے ان کی خوراک بن سکتے ہیں۔)

افضل کے لفظوں میں:

''میں سوپور، جموں و کشمیر، کا رہنے والا ہوں اور سنہ 2000 میں جب میں وہاں تھا تو فوج مجھے تقریباً ہر روز تنگ کرتی تھی، پھر انھوں نے ہر ہفتے بلانا شروع کیا۔ ایک راجہ موہن رائے تھا جو مجھ سے کہتا تھا کہ میں اسے شدت پسندوں کے بارے میں اطلاعات دیا کروں۔ میں خود ہتھیار ڈالنے والا سابق شدت پسند تھا، اور ایسے تمام لوگوں کو ہر اتوار آرمی کیمپ میں جا کر حاضری لگانی پڑتی ہے۔ وہ مجھے ہمیشہ دھمکیاں دیا کرتا۔ میں اپنی جان بچانے کے لیے اسے چھوٹی موٹی اطلاعات فراہم کرتا جو میں نے اخباروں سے اکٹھی کی ہوتی تھیں۔ جون/ جولائی 2000 میں میں اپنے گاؤں سے نقل مکانی کر کے بارہ مولا چلا گیا۔ میری آلات جراحی کی ڈسٹری بیوشن کی دکان تھی جو میں کمیشن پر بیچتا تھا۔ ایک دن جب میں اپنے اسکوٹر پر جا رہا تھا مجھے ایس ٹی ایف (اسٹیٹ ٹاسک فورس) والوں نے اٹھا لیا اور پانچ دن تک مجھ پر تشدد کرتے رہے۔ کسی نے ایس ٹی ایف کو اطلاع دی تھی کہ میں نے دوبارہ شدت پسند سرگرمیاں شروع کر دی ہیں۔ اس آدمی سے میرا سامنا کرایا گیا اور میری موجودگی میں اسے رہا کیا گیا۔ اس کے بعد مجھے 25 دن تک مزید حراست میں رکھا گیا اور ایک لاکھ روپے لے کر رہا کیا گیا۔ اسپیشل سیل والے بھی اس کی تصدیق کر چکے ہیں۔ اس کے بعد ایس ٹی ایف نے مجھے ایک سرٹیفکیٹ

Scanned with CamScanner

دیا اور چھ مہینے کے لیے اسپیشل پولیس آفیسر بنا دیا گیا۔ وہ جانتے تھے کہ میں ان کے لیے کام نہیں کروں گا۔ بعد میں طارق مجھ سے پلہالان کے ایس ٹی ایف کیمپ میں ملا جہاں میں ایس ٹی ایف کی تحویل میں تھا۔ طارق اس کے بعد مجھ سے سرینگر میں ملا اور اس نے مجھے بتایا کہ وہ اصل میں ایس ٹی ایف کے لیے کام کرتا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ میں بھی ایس ٹی ایف کے لیے کام کر رہا ہوں۔ محمد جو پارلیمنٹ پر حملے میں ہلاک ہوا، وہ بھی طارق کے ساتھ تھا۔ طارق نے مجھے بتایا کہ وہ کشمیر کے کیرن علاقے کا رہنے والا ہے اور مجھ سے کہا کہ میں محمد کو دہلی لے جاؤں کیونکہ محمد کو کچھ عرصے بعد دہلی سے بیرون ملک جانا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ مجھے پولیس نے 15 دسمبر 2001 کو سرینگر میں کیوں گرفتار کیا۔ میں سرینگر بس اسٹاپ پر گھر لوٹنے کے لیے بس میں سوار ہو رہا تھا جب پولیس نے مجھے گرفتار کیا۔ گواہ اکبر، جس نے عدالت میں گواہی دی کہ اس نے شوکت کو اور مجھے سرینگر میں گرفتار کیا، وہی ہے جس نے دسمبر 2001 سے ایک سال پہلے میری دکان پر چھاپہ مارا تھا اور مجھ پر یہ الزام لگا کر کہ میں جعلی آلات جراحی بیچتا ہوں، مجھ سے پانچ ہزار روپے اینٹھے تھے۔ مجھ پر اسپیشل سیل میں تشدد کیا گیا اور ایک بھوپ سنگھ نامی شخص نے مجھے پیشاب پینے پر بھی مجبور کیا، اور میں نے ایس اے آر گیلانی کے خاندان کو بھی وہاں دیکھا، گیلانی کی حالت قابل رحم تھی۔ وہ کھڑا نہیں ہو پا رہا تھا۔ ہمیں معائنے کے لیے ڈاکٹر کے پاس لے جایا جاتا تھا لیکن ہدایت کی جاتی کہ ڈاکٹر سے یہی کہیں کہ سب کچھ ٹھیک ہے، اور دھمکی دی جاتی کہ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو ہم پر دوبارہ تشدد کیا جائے گا۔''

اس کے بعد وہ عدالت سے کچھ اور معلومات فراہم کرنے کے لیے اجازت طلب کرتا ہے۔

''پارلیمنٹ پر حملے میں ہلاک ہونے والا محمد میرے ساتھ کشمیر سے آیا تھا۔ جس شخص نے اسے میرے ساتھ کیا تھا وہ طارق ہے۔ طارق سکیورٹی فورس اور جموں و کشمیر پولیس کی ایس ٹی ایف کے ساتھ کام کرتا ہے۔ طارق نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر محمد کی وجہ سے مجھے کوئی مسئلہ درپیش ہوا تو وہ میری مدد کرے گا کیونکہ اس کی سکیورٹی فورس اور ایس ٹی ایف سے اچھی واقفیت ہے۔ . . . طارق نے مجھ سے کہا تھا کہ محمد کو صرف دہلی میں ڈراپ کر دوں، اور کچھ نہ کروں۔ اور یہ کہ اگر میں محمد کو اپنے ساتھ دہلی نہ لے کر گیا تو مجھے کسی اور کیس میں پھنسا دیا جائے گا۔ ان حالات میں میں محمد کو مجبوراً اپنے ساتھ دہلی لے کر آیا، یہ جانے بغیر کہ وہ ایک دہشت گرد ہے۔''

Scanned with CamScanner

تو اب ہمیں ایک ایسے شخص کی تصویر ابھرتی دکھائی دے رہی ہے جو ممکنہ طور پر ایک کلیدی کردار ہو سکتا ہے۔ ''گواہ اکبر'' (استغاثہ کا گواہ نمبر 62)۔ محمد اکبر، ہیڈ کانسٹیبل، تھانہ پارمپورہ، جموں وکشمیر پولیس کا وہی اہلکار جس نے افضل کے گرفتاری کے وقت برآمد کی جانے والی اشیا کی ضبطی کے میمو پر دستخط کیے۔ افضل نے سپریم کورٹ میں اپنے وکیل صفائی سشیل کمار کے نام ایک خط میں مقدمے کے دوران ایک خوفناک لمحے کا ذکر کیا ہے۔ عدالت میں گواہ اکبر نے، جو ضبطی کے میمو کی بابت گواہی دینے خاص طور پر سرینگر سے آیا تھا، کشمیری زبان میں افضل سے مخاطب ہو کر اسے تسلی دی کہ ''تمھارے گھر والے ٹھیک ٹھاک ہیں''۔ افضل اس در پردہ دھمکی کو فوراً جان گیا۔ افضل یہ بھی بتاتا ہے کہ سرینگر میں اس کی گرفتاری کے بعد اسے پارمپورہ تھانے لے جایا گیا اور وہاں اس کی پٹائی کی گئی، اور اسے صاف لفظوں میں بتایا گیا کہ اگر اس نے تعاون نہ کیا تو اس کی بیوی اور خاندان کے دوسرے افراد کو سنگین نتائج بھگتنے ہوں گے۔ (یہ ہمیں پہلے ہی معلوم ہے کہ افضل کے بھائی کو چند اہم ترین مہینوں کے دوران ایس او جی نے مسلسل اپنی غیر قانونی حراست میں رکھا۔)

اپنے خط میں افضل نے بتایا کہ ایس ٹی ایف کیمپ میں اسے کس قسم کی اذیتیں دی گئیں۔ اس کے جنسی عضو کو الیکٹروڈز سے جھٹکے دیے گئے اور اس کی مقعد میں مرچیں اور پٹرول ڈالا گیا۔ وہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس دراوندر سنگھ کا نام لے کر ذکر کرتا ہے جس نے اس سے کہا تھا کہ اسے دہلی میں ''ایک چھوٹے سے کام'' کے لیے افضل کی ضرورت ہے۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ فرد جرم میں جو فون نمبر درج کیے گئے ہیں، ان میں سے بعض کا سلسلہ کشمیر کے ایس ٹی ایف کیمپ تک تلاش کیا جا سکتا ہے۔

افضل کی کہانی ہی سے ہمیں اس بات کی ہلکی سی جھلک دکھائی دیتی ہے کہ وادی کشمیر میں زندگی درحقیقت کس طرح کی ہے۔ ورنہ ہم اپنے اخباروں میں جو بچگانہ کہانیاں پڑھتے ہیں ان میں تو سکیورٹی فورسز شدت پسندوں سے مقابلہ کر رہی ہوتی ہیں اور بے گناہ کشمیری شہری دونوں طرف سے ہونے والی فائرنگ کی زد میں آ کر مارے جا رہے ہوتے ہیں۔ بالغوں والی کہانی کے مطابق کشمیر کی وادی شدت پسندوں، منحرفین، سکیورٹی فورسز، ڈبل کراس کرنے والوں، مخبروں، بلیک میل کرنے والوں، بھتہ وصول کرنے والوں، جاسوسوں، ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کی انٹیلی جنس ایجنسیوں، انسانی حقوق کے کارکنوں، این جی اوز، اور نامعلوم ذرائع سے آنے والے پیسے اور اسلحے

Scanned with CamScanner

کی نا قابلِ تصور مقدار سے بھری ہوئی ہے۔ ان تمام افراد اور اشیا کے مابین حد فاصل کسی واضح لکیر کی صورت میں ہمیشہ موجود نہیں ہوتی اور یہ بتانا آسان نہیں کہ کون کس کے لیے کام کر رہا ہے۔

سچائی، کشمیر میں، غالباً کسی بھی اور شے سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ آپ جتنا گہرا کرید تے جائیں، یہ اور زیادہ غلیظ ہوتی جاتی ہے۔ اس گڑھے کی تہہ میں وہ اسپیشل آپریشنز گروپ (SOG) اور اسپیشل ٹاسک فورس (STF) ہیں جن کا ذکر افضل نے کیا ہے۔ یہ دونوں کشمیر میں ہندوستانی سکیورٹی کے نظام کے سب سے زیادہ سفاک، نظام و ضبط سے عاری اور دہشت انگیز عناصر ہیں۔ زیادہ رسمی نوعیت کی فورسز کے برعکس، یہ ایک دھند بھرے علاقے میں کام کرتے ہیں جہاں پولیس اہلکار، ہتھیار ڈالنے والے شدت پسند، منحرفین اور عام جرائم پیشہ افراد اپنے اپنے دھندوں میں لگے ہوئے ہیں۔ وہ مقامی آبادی کا، خصوصاً کشمیر کے دیہات میں، شکار کھیلتے ہیں۔ ان کے اصل ہدف وہ ہزاروں نوجوان کشمیری مرد ہیں جو 1990 کے عشرے میں ایک نراجی بغاوت میں اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور جو اس کے بعد ہتھیار ڈال کر اپنی روزمرہ زندگی گزارنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

جب افضل نے 1989 میں شدت پسندی کی تربیت حاصل کرنے کی غرض سے سرحد پار کی، تب وہ صرف بیس سال کا تھا۔ وہ کوئی تربیت حاصل کیے بغیر اور اپنے تجربے سے بددل ہو کر لوٹا۔ اس نے بندوق رکھ دی اور دہلی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ 1993 میں، عملی طور پر شدت پسندی میں شریک ہوئے بغیر، اس نے رضا کارانہ طور پر خود کو بارڈر سکیورٹی فورس (BSF) کے حوالے کر دیا۔ انتہائی غیر منطقی بات یہ ہے کہ یہی نقطہ اس کے بھیانک خواب کا آغاز ثابت ہوا۔ اس کے ہتھیار ڈالنے کو ایک جرم سمجھا گیا اور اس کی زندگی جہنم بن کر رہ گئی۔ اگر کشمیری نوجوان افضل کی کہانی سے یہ سبق حاصل کریں کہ ہتھیار ڈال کر خود کو ہندوستانی ریاست کی بے شمار سفاکیوں کے حوالے کر دینا حماقت ہی نہیں بلکہ پاگل پن ہے، تو کون انھیں غلط ٹھہرا سکتا ہے؟

محمد افضل کی کہانی نے کشمیریوں کو طیش میں مبتلا کر دیا ہے کیونکہ یہی کہانی ان کی اپنی بھی ہے۔ جو کچھ اس کے ساتھ پیش آیا وہ ہزاروں کشمیری نوجوانوں اور ان کے گھر والوں کے ساتھ بھی پیش آسکتا ہے، پیش آتا رہا ہے اور اب بھی پیش آ رہا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان کی کہانیاں جوائنٹ انٹیروگیشن سنٹروں، آرمی کیمپوں اور تھانوں کی غلیظ نیم تاریک انتڑیوں میں گھٹ کر رہ جاتی ہیں

Scanned with CamScanner

جہاں ان کو جلایا جاتا ہے، مارا پیٹا جاتا ہے، بجلی کے جھٹکے دیے جاتے ہیں، بلیک میل کیا جاتا ہے اور ہلاک کر دیا جاتا ہے، جس کے بعد ان کی لاشیں چلتے ہوئے ٹرکوں کے پچھلے حصوں سے سڑکوں پر پھینک دی جاتی ہیں تاکہ راہگیر انھیں دریافت کرلیں۔ جبکہ دوسری طرف افضل کی کہانی قرون وسطی کے کسی ڈرامے کی طرح ''منصفانہ مقدمے'' کے قانونی استناد کے ساتھ، ''آزاد پریس'' کی کھوکھلی نعمت اور ایک نام نہاد جمہوریت کی تمام تر بھڑک دار جھالروں سمیت، قومی اسٹیج پر، دن کی روشنی میں، کھیلی جارہی ہے۔

اگر افضل کو پھانسی دے دی گئی تو ہمیں اصل سوال کا جواب کبھی حاصل نہیں ہو سکے گا: ہندوستانی پارلیمنٹ پر کس نے حملہ کیا تھا؟ لشکر طیبہ نے؟ جیش محمد نے؟ یا اس سوال کا جواب کہیں اس ملک کے قلب میں پوشیدہ ہے جس میں ہم سب رہتے اور جس سے ہم سب اپنے اپنے خوبصورت، نازک، متنوع اور نوکیلے انداز میں محبت اور نفرت کرتے ہیں؟

13 دسمبر کو پارلیمنٹ پر ہونے والے حملے کی پارلیمانی تحقیقات ہونی چاہیے۔ جب تک یہ تحقیقات مکمل نہیں ہوتی تب تک سوپور میں افضل کے گھر والوں کو تحفظ فراہم کیا جانا چاہیے کیونکہ وہ اس بدہیئت کہانی میں خطرے میں گھرے ہوئے یرغمالی ہیں۔

دراصل کیا ہوا تھا اسے جانے بغیر محمد افضل کو پھانسی پر لٹکا دینا ایک ایسا غلط کام ہوگا جسے آسانی سے بھلایا نہیں جائے گا۔ اور نہ معاف کیا جائے گا۔ کیا بھی نہیں جانا چاہیے۔

❋❋

ارن دھتی رائے

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

آزادی

پچھلے تقریباً ساٹھ دن سے، جون 2008 کے آخر سے، کشمیر کے لوگ آزاد ہیں۔ عمیق ترین معنوں میں آزاد۔ دنیا کے اس سب سے زیادہ گنجان فوجی موجودگی والے علاقے میں انھوں نے پوری طرح مسلح پانچ لاکھ سپاہیوں کے بندوق کے نشانے کی زد میں زندگی گزارنے کی اپنی دہشت اتار پھینکی ہے۔

فوجی قبضہ برقرار رکھنے کی اٹھارہ سال کی کوشش کے بعد ہندوستان کی حکومت کا بدترین بھیانک خواب سچ ثابت ہو گیا ہے۔ مسلح تحریک کے کچل دیے جانے کے اعلان کے بعد اب اس کا سامنا ایک غیر متشدد عوامی احتجاج سے ہو رہا ہے، لیکن یہ اس قسم کا احتجاج نہیں جس سے نمٹنے کی تدبیر اسے معلوم ہو۔ اس احتجاج کو لوگوں کے حافظے میں موجود جبر کے ان طویل برسوں کی یادیں تقویت دے رہی ہیں جن میں دسیوں ہزار لوگ ہلاک ہوئے ہیں، ہزاروں کو ''غائب'' کر دیا گیا ہے، لاکھوں کو ایذائیں، زخم اور بےعزتی سہنی پڑی ہے۔ اس قسم کے غصے کو جب اظہار مل جائے تو اس پر قابو پانا، دوبارہ بوتل میں بند کرنا اور جہاں سے وہ آیا تھا وہیں واپس بھیجنا آسان نہیں ہوتا۔

ان تمام برسوں میں ہندوستانی ریاست نے، جسے جاننے والے لوگ Deep State کہتے ہیں، کشمیر کے لوگوں کی آواز کو دبانے، گمراہ کرنے، ترجمانی کرنے، غلط ترجمانی کرنے، بدنام کرنے، خوفزدہ کرنے اور خریدنے کے لیے وہ سب کچھ کیا ہے جو اس کے بس میں تھا۔ اس نے پیسہ

Scanned with CamScanner

استعمال کیا (بے تحاشا)، تشدد استعمال کیا (بے تحاشا)، ڈس انفارمیشن، پراپیگنڈا، ایذادہی، مخبروں اور collaborators کا ایک پورا نیٹ ورک، دہشت، قید، بلیک میل اور انتخابات میں دھاندلی سے کام لیا تاکہ اُس شے کو اپنی مطیع کر سکے جسے جمہوریت پسند لوگ 'عوام کی مرضی' کا نام دیتے ہیں۔ لیکن اب یہ ڈیپ اسٹیٹ، جیسا کہ اس قسم کی کسی ریاست کے لیے قابل فہم ہے، اپنے گھمنڈ میں خود الجھ گئی اور اپنے پروپیگنڈا پر خود یقین کرنے لگی۔ اس نے غلطی سے تسلط کو فتح سمجھ لیا، یہ مان لیا کہ بندوق کے زور پر قائم کیے گئے نارمل حالات واقعی نارمل ہیں، اور لوگوں کی ناراض خاموشی درحقیقت ان کی رضامندی ہے۔

جانی پہچانی امن کی صنعت نے، عوام کی طرف سے بولتے ہوئے، ہمیں اطلاع دی کہ "کشمیری تشدد سے تھک چکے ہیں اور امن چاہتے ہیں۔" وہ کس قسم کے امن پر سمجھوتا کرلیں گے، اس کی کبھی وضاحت نہیں کی گئی۔ بالی وُڈ کی کشمیر/مسلمان دہشت گردی کے موضوع پر بنائی گئی فلموں نے بیشتر ہندوستانیوں کی برین واشنگ کر کے ان کے ذہنوں میں یہ خیال راسخ کر دیا کہ کشمیر کی ساری مصیبتوں کی ذمے داری ان شرانگیز، عوام دشمن دہشت گردوں پر ڈالی جاسکتی ہے۔

دوسری طرف جو لوگ سوال کرنے، اور اس سے بھی اہم بات یہ کہ سننے پر آمادہ تھے، ان کے لیے یہ بار ہمیشہ واضح رہی کہ کشمیر کے لوگوں نے تاریک ترین وقت میں بھی آگ جلائے رکھی ہے، اور یہ کہ وہ صرف امن نہیں بلکہ آزادی بھی چاہتے ہیں۔ پچھلے دو مہینوں میں وہ احتیاط سے بنائی گئی مصنوعی تصویر، جس میں معصوم عوام کو دو یکساں طور پر نفرت انگیز بندوقوں کے درمیان پھنسے ہوئے دکھایا جاتا تھا، جہنم میں جا پڑی ہے۔

قسمت کا ایک اچانک پھیر، ایک ناعاقبت اندیشانہ قدم اچانک پٹرول سے بھرے پیپے پر جا گرنے والی جلتی ہوئی دیاسلائی ثابت ہوا ہے۔ یہ قدم ریاستی ملکیت کی 100 ایکڑ جنگل کی زمین کی امرناتھ شرائن بورڈ کو (جو کشمیر کے ہمالیہ پہاڑی سلسلے میں بہت اوپر واقع ایک گپھا کی سالانہ یاترا کا انتظام چلاتا ہے) منتقلی کا اقدام تھا۔ 1989 تک تقریباً بیس ہزار افراد امرناتھ یاترا پر آتے تھے اور امرناتھ گپھا تک جانے کا تقریباً دو ہفتے کا سفر اختیار کرتے تھے۔ 1990 میں جب وادی میں اٹھنے والی سخت گیر اسلامی رنگ کی مسلح بغاوت کے ساتھ ساتھ زہریلی ہندو قوم پرستی کا پھیلاؤ ہوا تو امرناتھ

Scanned with CamScanner

آنے والے یاتریوں کی تعداد بڑی تیزی سے بڑھنے لگی۔ 2008 کے آتے آتے ہر سال پانچ لاکھ سے زیادہ یاتری بڑے بڑے گروپوں کی شکل میں، جن کے سفر کے اخراجات اکثر ہندوستان کے بڑے بڑے تجارتی ادارے اٹھاتے تھے، امرناتھ آنے لگے۔ وادی کے بیشتر رہنے والوں کے لیے یاتریوں کی تعداد میں یہ ڈرامائی اضافہ ہندوستان کی روز بروز ہندو بنیاد پرستی اختیار کرتی ہوئی ہندوستانی ریاست کی جانب سے ایک سیاسی بیان کی حیثیت رکھتا تھا۔ درست یا غلط، زمین کی شرائن بورڈ کو منتقلی کو کھائی کی گگر کے طور پر دیکھا گیا۔ اس سے اندیشہ پیدا ہوا کہ شاید یہ غربِ اردن کے علاقے میں قائم کی جانے والی اسرائیلی نوآبادیوں جیسے کسی منظم منصوبے کی ابتدا ہے جس کا مقصد وادی میں آبادی کے تناسب کو تبدیل کرنا ہے۔ کئی روز کے متواتر احتجاج سے وادی میں زندگی بالکل معطل ہو کر رہ گئی۔ یہ احتجاج چند گھنٹوں کے اندر اندر شہروں سے دیہات تک پھیل گیا۔ نوعمر لڑکے سڑکوں پر آ کر پتھراؤ کرنے لگے اور ان کا سامنا مسلح فوجیوں سے ہوا جنھوں نے ان پر سیدھی فائرنگ کی اور ان میں سے کئی کو ہلاک کر دیا۔ ان واقعات نے عوام اور حکومت دونوں کے ذہن میں 1990 کے عشرے کی مسلح کارروائیوں کی یادیں تازہ کر دیں۔ احتجاج کے ان ہفتوں کے دوران ہڑتالوں اور پولیس فائرنگ کے واقعات ہوے، اور جبکہ ہندوتو کی پبلسٹی مشین ہر قسم کی فرقہ وارانہ زیادتیوں کے الزام لگا رہی تھی، پانچ لاکھ امرناتھ یاتریوں نے اپنی یاترا نہ صرف کسی گزند کے بغیر مکمل کی بلکہ وہ مقامی لوگوں کی جانب سے مہمان نوازی کے مظاہرے سے بہت متاثر بھی ہوے۔

آخرکار ردعمل کی شدت سے مکمل طور پر حیرت زدہ ہو کر حکومت کو زمین کی منتقلی کا فیصلہ واپس لینا پڑا۔ لیکن اس وقت تک زمین کا مسئلہ، کشمیر کے سب سے معمر اور سب سے زیادہ کھلے طور پر اسلام نواز علیحدگی پسند لیڈر سید علی شاہ گیلانی کے لفظوں میں، "نان ایشو" بن چکا تھا۔

اب جموں کے علاقے میں منتقلی کی منسوخی کے خلاف احتجاج کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہاں بھی اس مسئلے نے اس سے کہیں بڑے معاملے کی شکل اختیار کر لی۔ ہندوؤں نے ہندوستانی ریاست کی جانب سے نظرانداز کیے جانے اور امتیاز برتے جانے کے سوال اٹھانے شروع کر دیے۔ (کسی عجیب منطق سے کام لے کر انھوں نے اس کا ذمہ دار کشمیریوں کو ٹھہرایا۔) اس احتجاج کا نتیجہ جموں سری نگر ہائی وے کے بند ہونے کی صورت میں نکلا، جو کشمیر کو ہندوستان کے درمیان واحد قابلِ استعمال سڑک

Scanned with CamScanner

ہے۔ کشمیری ٹرک ڈرائیوروں کے خلاف تشدد کی خبریں پنجاب تک سے آرہی تھیں جہاں کوئی حفاظتی بندوبست نہ تھا۔ چنانچہ کشمیری ڈرائیوروں نے جان کے خوف سے ہائی وے پر چلنے سے انکار کردیا۔ ٹرکوں پر لدے ہوئے تازہ پھل اور وادی کی دیگر زرعی اجناس سڑنے لگیں۔ یہ بات واضح ہوگئی کہ سڑک کی بندش کی وجہ سے صورت حال قابو سے باہر ہوگئی ہے۔ حکومت نے اعلان کیا کہ سڑک کی بندش ختم کر دی گئی ہے اور اب ٹرک اس پر جانے لگے ہیں۔ ہندوستانی میڈیا کے ایجنسیوں سے منسلک حصے نے، ناگزیر انٹیلی جنس ذرائع کے حوالے سے سڑک کی بندش کو ''تصوراتی بندش'' کہنا شروع کردیا، اور یہاں تک کہنے لگے کہ سڑک کبھی بند ہوئی ہی نہ تھی۔ لیکن اس قسم کے کھیل اب بیکار تھے۔ جو نقصان ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ کشمیریوں پر یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ وہ دوسروں کے رحم وکرم پر زندہ ہیں، اور اگر انھوں نے اطاعت چھوڑ کرنا قابل قبول طرز عمل اختیار کیا تو ان کو محصور کر کے ان کو غذا، ضرورت کی چیزوں اور طبی اشیا کی فراہمی روکی جاسکتی ہے۔ اصل محاصرے نے نفسیاتی محاصرے کی صورت اختیار کرلی۔ ہندوستان اور کشمیر کے درمیان آخری، اور نازک، رشتہ کم وبیش کٹ کر رہ گیا۔ یہ توقع کرنا بلاشبہ لغو تھا کہ معاملات اسی مقام پر رک جائیں گے۔ کیا یہ بات کسی کو محسوس نہیں ہوئی کہ کشمیر میں شہری مسائل پر ہونے والا چھوٹا سا احتجاج بھی کس طرح آزادی کے مطالبے میں بدل جاتا ہے؟ ان لوگوں کو بھوکا مارنے کی دھمکی دینا سیاسی خودکشی کے برابر تھا۔ چنانچہ یہ حیرت کی بات نہیں کہ جس آواز کو ہندوستانی حکومت نے دبانے کی اس قدر شدید کوشش کی وہ ایک بہت بڑی گونج کی شکل اختیار کرچکی ہے۔ لاکھوں نہتے لوگ اپنے شہروں، اپنی گلیوں اور محلوں کو واپس لینے کے لیے باہر نکل آئے ہیں۔ انھوں نے محض اپنی کثیر تعداد اور اپنی خام جرأت کے مظاہرے سے بے تحاشا مسلح سکیورٹی فورسز پر غلبہ پالیا ہے۔ جس نئی نسل کی پرورش فوجی کیمپوں، چیک پوسٹوں اور بنکروں (bunkers) کے کھیل کے میدان میں ہوئی ہے، جس میں ایذادہی کے شکار لوگوں کی چیخیں ساؤنڈ ٹریک کا کام دیتی ہیں، اس پر عوامی احتجاج کی، اور سب سے بڑھ کر اپنے کندھے سیدھے کر کے اپنی نمائندگی خود کرنے، اپنی بات خود کہنے کی قوت اچانک منکشف ہوئی۔ یہ ان کے لیے کسی الوہی نظارے سے کم نہیں۔ وہ اپنے پورے بہاؤ میں ہیں، موت کا خوف بھی ان کا راستہ نہیں روک پا رہا۔

اور ایک بار جب یہ خوف دور ہو جائے، تو دنیا کی سب سے بڑی، یا دوسرے نمبر پر سب سے

Scanned with CamScanner

بڑی فوج کس کام کی؟ اس سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟ ہندوستان کے لوگوں نے جس طریقے سے آزادی حاصل کی تھی، اسے دیکھتے ہوئے ان سے زیادہ کون اس حقیقت سے واقف ہوگا؟

اب کشمیر میں جس قسم کے حالات ہیں، ان میں کسی بوجھ بجھکو کے لیے پرانی باتوں کو دہرانا ممکن نہیں رہا؛ یہ دعویٰ کرنا ممکن نہیں رہا کہ یہ سب کچھ پاکستان کی آئی ایس آئی کا کیا دھرا ہے، یا شدت پسند افراد عوام کو مجبور کر رہے ہیں۔ 1930 کے عشرے سے اب تک اس بات پر متواتر اور تلخ بحث ہوتی رہی ہے کہ جس شے کو ''کشمیری جذبہ'' کہا جاتا ہے اس کی نمائندگی کرنے کا حق کس کو ہے۔ لیکن اِس بار یہ حق لوگوں کے اپنے ہاتھ میں آ گیا ہے۔ رہنما کون ہے؟ کیا شیخ عبداللہ کو رہنما کہا جا سکتا تھا؟ یا مسلم کانفرنس کو؟ آج کون رہنما ہے؟ مین اسٹریم سیاسی پارٹیاں؟ حریت؟ مسلح شدت پسند؟ اِس بار معاملہ لوگوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ بڑے جلوس اس سے پہلے بھی نکلے ہیں لیکن کبھی اتنے تواتر سے اور اتنے وسیع پیمانے پر نہیں۔ کشمیر کی تمام بڑی سیاسی پارٹیاں — نیشنل کانفرنس، پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی — جنھیں ایک کے بعد ایک ہونے والے انتخابات میں لوگوں کی نہایت قلیل شرکت کے باوجود ہندوستانی ریاست اور میڈیا کی جانب سے بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا رہا ہے، نئی دہلی کے ٹی وی اسٹوڈیوز میں بحث مباحثے کے لیے بڑی سعادت مندی سے حاضر ہوتی ہیں لیکن کشمیر کی سڑکوں پر نکلنے کی ہمت نہیں کر سکتیں۔ مسلح شدت پسند، جو جبر کے بدترین برسوں میں آزادی کی مشعل اٹھا کر چلتے دکھائی دیتے تھے. اب مطمئن ہو کر بیٹھ گئے ہیں کہ لوگ خود اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔

علیحدگی پسند رہنما، جو اب بھی جلسوں میں آ کر تقریریں کرتے ہیں، اب رہنما نہیں رہے بلکہ پیروکار بن گئے ہیں، اور برسوں سے قید، غضب ناک لوگوں کی اضطراری توانائی کشمیر کی سڑکوں پر ان کی رہنمائی کر رہی ہے۔ رہنماؤں کو، جیسے کہ وہ ہیں، ایک مکمل انقلاب تھالی میں رکھ کر پیش کر دیا گیا ہے۔ واحد شرط یہ ہے کہ انھیں وہی کرنا ہے جو لوگ کہیں۔ جب وہ ایسی باتیں کہنے لگتے ہیں جو لوگ نہیں سننا چاہتے تو انھیں نرمی سے، باہر نکلنے، سرعام معافی مانگنے اور اپنی سمت درست کرنے کو کہا جاتا ہے۔ اس بات کا اطلاق سب پر ہوتا ہے، سید علی شاہ گیلانی پر بھی جس نے ایک حالیہ جلسے میں خود کو اس تحریک کا واحد لیڈر قرار دیا۔ یہ ایک بہت بڑی سیاسی غلطی تھی جو جدوجہد میں شامل ان تمام دھڑوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کر سکتی تھی جو حال ہی میں یکجا ہوئے ہیں۔ چند گھنٹوں کے اندر اندر اس نے اپنا بیان واپس

Scanned with CamScanner

لیا۔ چاہے آپ پسند کریں یا نہ کریں، یہ جمہوریت ہے۔ کوئی جمہوریت پسند اسے اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔

ہر روز لاکھوں لوگ ان مقامات پر جمع ہوتے ہیں جن سے ان کی ہولناک یادیں وابستہ ہیں۔ وہ بنکر مسمار کرتے ہیں، خاردار تاروں کی باڑھ کو توڑ کر نکل جاتے ہیں اور سپاہیوں کی مشین گن کی نال میں جھانک کر دیکھتے ہیں اور وہ کچھ کہتے ہیں جو ہندوستان میں بہت کم لوگ سننا پسند کرتے ہیں: ''ہم کیا چاہتے؟ آزادی!'' اور، یہ بات بھی کہنا ضروری ہے، اتنی ہی شدت کے ساتھ: ''جیوے جیوے پاکستان!''

یہ آواز پوری وادی میں یوں گونج رہی ہے جیسے ٹین کی چھت پر بارش کی آواز، جیسے بجلی کی کڑک سے پہلے بادلوں کی گرج۔ یہ وہ رائے شماری ہے جو کبھی نہیں کرائی گئی، وہ ریفرنڈم ہے جسے متواتر ٹالا جاتا رہا ہے۔

15 اگست کو، ہندوستان کے یوم آزادی پر، سرینگر شہر مکمل طور پر بند تھا۔ بخشی اسٹیڈیم جہاں گورنر این این ووہرہ نے جھنڈا لہرایا، چند سرکاری اہلکاروں کے سوا بالکل خالی تھا۔ چند گھنٹے بعد شہر کے اعصابی مرکز لال چوک میں (جہاں بی جے پی کے لیڈر اور بچوں کی تاریخ کی کتابوں کے ''ہندو کرن'' (Hinduisation) کے متنازع منصوبے کے خالق مرلی منوہر جوشی نے 1992 میں بارڈر سکیورٹی فورس کے ہاتھ جھنڈا لہرائے جانے کی روایت قائم کی تھی) ہزاروں افراد نے جمع ہو کر پاکستان کا جھنڈا لہرایا اور ایک دوسرے کو ''یوم آزادی ایک دن بعد مبارک'' (کیونکہ پاکستان کا یوم آزادی 14 اگست کو منایا جاتا ہے)، اور ''یوم غلامی مبارک'' کہا۔ ظاہر ہے کہ کشمیر میں حس مزاح ہندوستان کی بہت سی اذیت گاہوں اور ابو غریبوں کے باوجود بچ نکلی ہے۔

16 اگست کے دن تین لاکھ سے زیادہ لوگ پمپور تک مارچ کر کے حریت رہنما شیخ عبدالعزیز کے گاؤں میں پہنچے جسے پانچ دن پہلے بیدردی سے گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ شیخ عبدالعزیز لائن آف کنٹرول تک ہونے والے اس مارچ میں شامل تھا جس کا مطالبہ تھا کہ جموں کی شاہراہ کی بندش کی وجہ سے منطقی بات یہ ہے کہ سرینگر مظفر آباد ہائی وے کو لوگوں اور سامان کے لیے کھول دیا جائے، جیسا کہ یہ سڑک کشمیر کے تقسیم ہونے سے پہلے کھلی ہوئی تھی۔

18 اگست کو اتنی ہی تعداد میں لوگ سرینگر کے وسیع ٹی آر سی گراونڈ میں جمع ہوئے (ٹی آر سی

سے مراد ہے Tourist Reception Centre، نہ کہ Truth and Reconciliation Commission) تاکہ اقوام متحدہ کے فوجی مبصروں کے گروپ (UNMOGIP) کے پاس تین مطالبوں پر مشتمل ایک یادداشت جمع کرا سکیں — ہندوستانی حاکمیت کا خاتمہ، اقوام متحدہ کی امن فوج کی تعیناتی، اور دو عشروں کے دوران ہندوستانی فوج اور پولیس کے ہاتھوں بغیر کسی جواب دہی کے کیے جانے والے جنگی جرائم کی تحقیقات۔

ریلی سے ایک دن پہلے ہی ڈیپ اسٹیٹ اپنے کام میں جٹ گئی تھی۔ ایک دوست نے، جو سینئر صحافی ہیں، اطلاع دی کہ سہ پہر دیر گئے نئی دہلی میں ہوم سیکرٹری نے ایک اعلیٰ سطح اجلاس طلب کیا جس میں سیکرٹری دفاع اور انٹیلی جنس ایجنسیوں کے سربراہ بھی شریک ہوے۔ اس اجلاس کا مقصد ٹی وی نیوز چینلوں کے ایڈیٹروں کو بریف کرنا تھا کہ حکومت کے پاس یہ سمجھنے کا جواز موجود ہے کہ یہ شورش آئی ایس آئی سے ٹوٹے ہوے ایک چھوٹے سیل کی کارستانی ہے، اور ان سے یہ درخواست کرنا تھا کہ جب وہ کشمیر کے واقعات کو کور کریں (یا بہتر ہوگا کہ نہ کریں؟) تو اس بے حد خفیہ اطلاع کو ذہن میں رکھیں۔ لیکن ڈیپ اسٹیٹ کی بدقسمتی کہ اب حالات اتنے آگے جا چکے ہیں کہ اگر ٹی وی چینلوں نے اس کی ہدایات پر عمل کرنے کی کوشش کی تو نہایت مضحکہ خیز دکھائی دینے کا خطرہ مول لیں گے۔ شکر کا مقام یہ ہے کہ انقلاب آخرکار ٹی وی پر دکھایا جائے گا۔

17 اگست کی رات کو پولیس نے شہر کی ناکہ بندی کر لی۔ سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی کر دی گئیں اور ان پر ہزاروں پولیس والے متعین کر دیے گئے۔ سرینگر میں داخل ہونے والی سڑکوں کو بند کر دیا گیا۔ اٹھارہ برس میں پہلی بار پولیس کو حریت رہنماؤں سے التجا کرنی پڑی کہ وہ ٹی آر سی گراؤنڈ ہی میں جلسے سے خطاب کریں اور اقوام متحدہ کے دفتر تک نہ جائیں جو گوپکر روڈ یعنی سرینگر کے گرین زون میں واقع ہے، اور یہ وہ علاقہ ہے جہاں ہندوستانی انتظامیہ نے خود کو اپنی تمام شان و شوکت سمیت محصور کر رکھا ہے۔

18 اگست کی صبح کو وادی بھر سے لوگ، ٹرک، ٹمپو، جیپ یا بس میں سوار ہو کر، یا پیدل ہی، سرینگر پہنچنے لگے۔ ایک بار پھر رکاوٹیں ڈھائی گئیں اور لوگوں نے اپنے شہر کا قبضہ واپس حاصل کیا۔ پولیس کے سامنے دو ہی راستے تھے: یا تو راستے سے ہٹ جائے یا باقاعدہ قتل عام کا ارتکاب کرے۔

Scanned with CamScanner

اس نے راستہ چھوڑ دینے کا انتخاب کیا۔ ایک گولی بھی نہیں چلی۔

شہر مسکراہٹوں کے سمندر پر تیر رہا تھا۔ ہوا میں ہر طرف سرشاری تھی۔ ہاؤس بوٹ والوں، تاجروں، طالب علموں، وکیلوں، ڈاکٹروں، سب کے بینر موجود تھے۔ ایک بینر پر تحریر تھا: ''ہم سب قیدی ہیں، ہمیں رہا کرو''۔ دوسرے پر لکھا تھا: "Democracy without freedom is Demon-crazy". ڈیمن کریزی! کیا عمدہ ترکیب تھی! شاید لکھنے والا اس ملک کی مسخ شدہ منطق کی طرف اشارہ کرنا چاہتا تھا جسے اپنی سیکولر شہرت کو سہارا دینے کے لیے بار بار فرقہ وارانہ قتل عام کرنے کی ضرورت پڑتی ہے؛ یا اس پاگل پن کی طرف جس کے تحت دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کو دنیا کے سب سے بڑے فوجی قبضے کا انتظام کرنا پڑتا ہے اور اس کے باوجود وہ خود کو جمہوریت کہنا جاری رکھتی ہے۔

ہر کھمبے، ہر چھت، ہر بس اسٹاپ اور ہر چنار کے پیڑ کی چوٹی پر ایک ہرا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ ایسا ایک بڑا سا جھنڈا آل انڈیا ریڈیو کی عمارت کے باہر پھڑ پھڑا رہا تھا۔ حضرت بل، بٹ مالو، سوپور جانے والی سڑکوں کی تختیوں پر ان شہروں کے نام مٹا کر ''راولپنڈی'' یا صرف ''پاکستان'' لکھ دیا گیا تھا۔ یہ خیال کرنا غلطی ہوگی کہ پاکستان کے لیے ظاہر کی جانے والی یہ شیفتگی خود بخود پاکستان سے الحاق کی خواہش میں ڈھل جاتی ہے۔ یہ محبت جزوی طور پر اس امداد کے لیے (کلبی انداز کی یا دوسری طرح کی) شکرگزاری کا اظہار ہے جو پاکستان نے اس شے کے لیے فراہم کی جسے کشمیری جدوجہد آزادی اور ہندوستانی حکومت دہشت گردی کی مہم کہتی ہے۔ ایک حد تک یہ شرارت پر مبنی ہے۔ یعنی ایسی بات کہنا جو دشمن یعنی ہندوستان کو زیادہ سے زیادہ چراغ پا کرے۔

(اس بات پر ناک بھوں چڑھانا آسان ہے کہ یہ کیسی ''جدوجہد آزادی'' ہے جو ایک ایسے ملک سے علیحدگی چاہتی ہے جسے جمہوریت سمجھا جاتا ہے، ایک ایسے ملک سے جا ملنے کے لیے جہاں بیشتر وقت فوجی آمر راج کرتے رہے ہیں، ایک ایسے ملک سے جہاں کی فوج نے اس علاقے میں، جو اَب بنگلہ دیش ہے، نسل کشی کا ارتکاب کیا تھا، ایک ایسا ملک جو آج بھی اپنی نسلی جنگ کے ہاتھوں پارہ پارہ ہوا جا رہا ہے۔ کشمیر آزاد ہونے کے بعد کس قسم کا ہوگا؟ لاکھوں کشمیری پنڈت جو اس وقت جلاوطن ہیں، انھیں اپنے گھروں کی لوٹنے کی اجازت ہوگی؟ کیا ان کے نقصانات کا معاوضہ ادا

کیا جائے گا؟ یہ اہم سوالات ہیں، لیکن اس وقت شاید یہ دیکھنا زیادہ کارآمد ہوگا کہ اس نام نہاد جمہوری ملک نے کشمیر میں کیا کیا ہے جس کے نتیجے میں لوگ اس سے اتنی نفرت کرنے لگے ہیں۔)

ہر طرف پاکستانی جھنڈے، ہر طرف نعرے: ''پاکستان سے رشتہ کیا/ لاالٰہ الا اللہ''، ''آزادی کا مطلب کیا/ لاالٰہ الا اللہ''۔ کسی مجھ جیسے شخص کے لیے، جو مسلمان نہیں ہے، آزادی کا یہ مطلب سمجھنا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ میں نے ایک نوجوان لڑکی سے پوچھا کہ کیا کشمیر کی آزادی کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ بطور ایک عورت کے اس کی اپنی آزادی کم ہو جائے گی۔ اس نے کندھے اچکائے اور کہا، ''ابھی ہمیں کون سی آزادی حاصل ہے؟ ہندوستانی فوجیوں کے ہاتھوں ریپ ہونے کی آزادی؟'' اس کے جواب نے مجھے خاموش کر دیا۔

ٹی آر سی گراؤنڈ میں چاروں طرف ہرے جھنڈوں سے گھرے ہوئے، میرے لیے مشکل تھا کہ اس تحریک کی شدید اسلامی نوعیت کو نظرانداز یا اس سے انکار کر سکوں۔ اسے ایک شرانگیز، دہشت پسندانہ جہاد قرار دینا بھی اتنا ہی ناممکن تھا۔ کشمیریوں کے لیے یہ ایک طرح کا کیتھارسس تھا۔ آزادی کے لیے کی جانے والی ایک طویل اور پیچیدہ جدوجہد میں آنے والا ایک تاریخی لمحہ، ایسی جدوجہدِ آزادی جس میں وہ تمام خرابیاں، سفاکیاں اور الجھنیں موجود ہیں جو اس قسم کی ہر جدوجہد میں ہوتی ہیں۔ یہ جدوجہد بھی خود کو پاک صاف قرار نہیں دے سکتی، اور اس کے دامن پر اولین برسوں میں کشمیری پنڈتوں کی بہیمانہ ہلاکت کا داغ ہمیشہ رہے گا، اور مجھے امید ہے کہ ایک نہ ایک دن اسے اس کی جواب دہی بھی کرنی ہوگی؛ ان ہلاکتوں کے بعد پوری کشمیری پنڈت برادری وادیِ کشمیر سے بے دخل ہو گئی۔

جوں جوں مجمع بڑھتا گیا، میں وہاں لگائے جانے والے نعروں پر غور کرتی رہی، کیونکہ خطابت اکثر اوقات چیزوں کی وضاحت کر دیتی ہے اور ہر قسم کی تفہیم کی کنجی ثابت ہوتی ہے۔ ان میں سے بہت سے نعرے میں نے کئی سال پہلے، ایک شدت پسند کے جنازے پر بھی سنے تھے۔ ایک نیا نعرہ، جو ظاہر ہے سڑک کی حالیہ بندش کے بعد بنایا گیا ہوگا یہ تھا: ''کشمیر کی منڈی/ راولپنڈی''۔ ایک اور نعرہ تھا: ''خونی لکیر توڑ دو/ آر پار جوڑ دو!'' ہندوستان کے لیے بہت پھٹکار اور گالیاں تھیں: ''اے ظالمو، اے جابرو! کشمیر ہمارا چھوڑ دو!''، ''جس کشمیر کو خون سے سینچا/ وہ کشمیر ہمارا ہے!'' جس نعرے نے مجھے

Scanned with CamScanner

چاقو کی طرح اندر تک کاٹ کر رکھ دیا وہ یہ تھا: ''ننگا بھوکا ہندوستان/ جان سے پیارا پاکستان''۔اس نعرے کو سننا اس قدر تکلیف دہ، اتنا اذیت ناک کیوں تھا؟ میں نے اس پر غور کیا اور تین وجوں تک پہنچی۔ پہلی یہ کہ ہم سب جانتے ہیں کہ اس نعرے کا پہلا حصہ ہندوستان، ابھرتی ہوئی سپر پاور، کے بارے میں بے لاگ اور شرمندہ کر دینے والی سچائی پر مشتمل ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ وہ تمام ہندوستانی جو ننگے بھوکے نہیں ہیں، وہ ایک پیچیدہ اور تاریخی عمل کے دوران اس سفاک تہذیبی اور معاشی نظام کو سہارا دینے والوں میں شامل رہے ہیں — اور اب بھی شامل ہیں — جس نے ہندوستانی معاشرے کو اس قدر ظالمانہ، اتنے فحش طور پر غیر مساوی بنا رکھا ہے۔ اور تیسری وجہ یہ کہ ان لوگوں کے منھ سے، جنھوں نے خود اس قدر مصیبتیں سہی ہیں، ایسے لوگوں کے لیے تحقیر کے کلمات سننا نہایت تکلیف دہ تھا جو اسی جابر نظام کے ہاتھوں دوسری طرح کے، مگر اتنے ہی شدید، مصائب برداشت کرتے آ رہے ہیں۔ اس نعرے میں مجھے اس حقیقت کی جھلک دکھائی دی کہ جبر کا شکار ہونے والے لوگ کتنی آسانی سے خود جابروں میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔

میر واعظ عمر فاروق اور سید علی شاہ گیلانی کو ہجوم میں سے راستہ بنا کر اسٹیج تک پہنچنے میں کئی گھنٹے لگ گئے۔ انھیں نوجوانوں نے کندھوں پر اٹھا کر ہجوم کے اوپر سے گزارا۔ ان کے استقبال کے لیے اٹھنے والا شور بے پناہ تھا۔ میر واعظ نے پہلے تقریر کی۔ اس نے آرمڈ فورسز اسپیشل پاورز ایکٹ (AFSPA)، ڈسٹربڈ ایریاز ایکٹ (DAA) اور پبلک سیفٹی ایکٹ (PSA) کو، جن کے تحت ہزاروں افراد ہلاک، قید اور ایذا دہی کا شکار کیے جا چکے ہیں، منسوخ کرنے کے مطالبات دہرائے۔ اس نے سیاسی قیدیوں کو رہا کیے جانے، سامان اور لوگوں کی آزادانہ آمد و رفت کے لیے سرینگر مظفرآباد ہائی وے کھولے جانے اور وادی کشمیر سے فوجی موجودگی ختم کیے جانے کا مطالبہ کیا۔ سید علی شاہ گیلانی نے اپنی تقریر قرآن کی چند آیات کی تلاوت سے شروع کی۔ اس کے بعد وہی کچھ کہا جو وہ اس سے پہلے سیکڑوں موقعوں پر کہہ چکا تھا۔ یعنی یہ کہ جدوجہد کی کامیابی کا ایک ہی راستہ ہے، کہ قرآن کو اپنا رہنما بنایا جائے۔ اس کا کہنا تھا کہ اسلام ہی جدوجہد کی رہنمائی کرے گا اور وہی آزادی کے بعد کشمیر کے لوگوں پر حکومت کرنے کے لیے معاشرتی اور اخلاقی ضابطہ فراہم کرے گا۔ اس نے کہا کہ پاکستان اسلام کے گھر کے طور پر قائم کیا گیا تھا، اور اس ہدف سے کبھی ہٹنا نہیں چاہیے۔ اس نے کہا کہ

جس طرح پاکستان کشمیر کا ہے، اسی طرح کشمیر بھی پاکستان کا ہے۔ اس نے کہا کہ اقلیتی گروہوں کو مکمل حقوق حاصل ہوں گے اور ان کی عبادت گاہیں محفوظ رہیں گی۔ اس کے پیش کیے ہوئے ہر نکتے پر جلسے نے تائید اور تحسین کی آوازیں بلند کیں۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس کے بیان کیے ہوئے واضح نکتوں کے نتیجے میں ہر چیز کسی قدر غیر واضح ہو گئی۔ میں سوچنے لگی کہ جدوجہد میں شامل مختلف دھڑوں کے نظریات ایک دوسرے سے کس طرح ہم آہنگ ہوں گے — جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ (JKLF) کا آزاد ریاست کا تصور، گیلانی کی پاکستان سے الحاق کی خواہش، اور میر واعظ عمر فاروق کا ان دونوں کے درمیان نازک توازن برقرار رکھنے کا رویہ۔ میرے برابر میں کھڑے ہوئے ایک سرخ آنکھوں والے بوڑھے شخص نے کہا، ''کشمیر ایک ملک تھا۔ آدھا ہندوستان نے لے لیا اور باقی آدھا پاکستان نے۔ دونوں نے زبردستی لیا۔ ہمیں آزادی چاہیے۔'' میں سوچنے لگی کہ نئے حالات میں کیا اس بوڑھے کی بات سنی جائے گی۔ میں سوچنے لگی کہ یہ شخص ان ٹرکوں کے بارے میں کیا سوچتا ہوگا جو ہائی وے سے دہاڑتے ہوئے ہندوستان کے میدانی علاقوں میں اترتے ہیں اور جنھیں ایسے لوگ چلا رہے ہوتے ہیں جنھیں تاریخ کی یا کشمیر کی کچھ خبر نہیں، اس کے باوجود ان ٹرکوں کے پیچھے لکھا ہوتا ہے کہ ''دودھ مانگو تو کھیر دیں گے / کشمیر مانگو تو چیر دیں گے''۔

لمحے بھر کو مجھے ایک اور خیال بھی آیا۔ میں نے خود کو آر ایس ایس یا وشو ہندو پریشد کے کسی جلسے میں کھڑا تصور کیا جس سے ایل کے آڈوانی خطاب کر رہا تھا۔ ''اسلام'' کی جگہ ''ہندوتو'' کا لفظ رکھ دیجیے، ''پاکستان'' کی جگہ ''ہندوستان'' کا، ہرے جھنڈوں کی جگہ زعفرانی جھنڈے لہرا دیجیے، اور اس بھیانک خواب والا ہندوستان سامنے آ جائے گا جو بی جے پی کا آدرش ہے۔

کیا ہمیں اسی تصور کو اپنے مستقبل کے طور پر قبول کر لینا چاہیے؟ الگ الگ مذہب کے لوگوں کی یک رنگ ریاستیں جن میں سے ہر ایک کے پاس ایک مکمل معاشرتی اور اخلاقی ضابطہ، ایک ''مکمل طرزِ حیات'' موجود ہے؟ ہندوستان میں ہم دسیوں لاکھ لوگ ایسے ہیں جو ہندوتو کے منصوبے کو مسترد کرتے ہیں۔ ہمارے اس استرداد کی تہہ میں محبت ہے، جذبہ ہے، ایک قسم کا آدرش واد ہے، وہ طرح طرح کے، ہر رنگ کے جذباتی رشتے ہیں جنھوں نے ہمیں اس معاشرے سے جوڑ رکھا ہے جس میں ہم رہتے ہیں۔ ہمارے ہمسائے کیا کرتے ہیں، اپنے معاملات چلانے کے لیے کس طریقے کا

انتخاب کرتے ہیں، اس سے ہماری دلیل پر کچھ فرق نہیں پڑتا، اگر پڑتا ہے تو یہ کہ اس میں اور زیادہ قوت آجاتی ہے۔

محبت پر بنیاد رکھنے والے دلائل بھی خطرات سے پُر ہیں۔ اسلامی منصوبے سے اتفاق کرنا یا نہ کرنا کشمیر کے لوگوں پر منحصر ہے (اور خود یہ منصوبہ بھی ساری دنیا میں مسلمانوں کے درمیان اتنا ہی متنازع اور اتنے ہی پیچیدہ اختلافات کا شکار ہے جیسے ہندوستان میں ہندوتو کا منصوبہ ہندوؤں کے درمیان)۔ شاید اب جبکہ تشدد کا خطرہ ٹل گیا ہے اور نظریات پر بحث کرنے اور خیالات کا تبادلہ کرنے کے لیے گنجائش مہیا ہے، جدوجہد میں شامل لوگوں کو اپنے ذہن میں یہ بات واضح کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ وہ کس قسم کے معاشرے کے قیام کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ شاید یہ وقت ہے کہ لوگوں کو شہیدوں، نعروں اور مبہم اور غیر واضح تعمیموں سے بڑھ کر کچھ پیش کیا جائے۔ جو لوگ قرآن سے رہنمائی حاصل کرنے کے متمنی ہیں، انھیں بلاشبہ وہاں سے رہنمائی مل جائے گی۔ لیکن جو ایسا نہیں کرنا چاہتے، جن کے لیے قرآن رہنمائی کا ذریعہ نہیں ہے، ان کا کیا ہوگا؟ کیا جموں کے ہندوؤں اور دوسری اقلیتوں کو بھی حق خودارادی حاصل ہوگا؟ کیا ان لاکھوں کشمیری پنڈتوں کو، جو بے دخل کیے جانے کے بعد سے جلاوطنی اور ہولناک غربت میں زندگی گزار رہے ہیں، اپنے گھر لوٹنے کا حق دیا جائے گا؟ کیا انھیں ان زبردست نقصانات کا معاوضہ ملے گا جو انھیں برداشت کرنے پڑے ہیں؟ یا آزاد ہونے کے بعد کشمیر بھی اپنی اقلیتوں کے ساتھ وہی سلوک کرے گا جو ہندوستان نے اکسٹھ برس کشمیریوں کے ساتھ کیا ہے؟ ہم جنس پرستوں اور زنا کاروں اور مذہب کی توہین کرنے والوں کا کیا ہوگا؟ چوروں اور لفنگوں کا اور ان ادیبوں کا کیا ہوگا جو اس ''مکمل معاشرتی اور اخلاقی ضابطے'' سے اختلاف کریں گے؟ کیا ہمیں اسی طرح موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا جیسا سعودی عرب میں ہوتا ہے؟ کیا موت، جبر اور خونریزی کا سلسلہ جاری رہے گا؟ تاریخ کشمیر کے مفکروں اور دانشوروں اور سیاست کاروں کے مطالعے کے لیے کئی نمونے پیش کرتی ہے۔ کشمیری خواب کس سے ملتے جلتے ہوں گے؟ الجزائر؟ ایران؟ جنوبی افریقہ؟ سوئٹزرلینڈ؟ پاکستان؟

ایسے نازک وقت میں جیسا آج ہے، خوابوں سے بڑھ کر کوئی چیز اہم نہیں۔ کاہلی سے سوچا گیا کوئی یوٹوپیا اور انصاف کا غیر منصفانہ تصور ایسے نتائج پیدا کر سکتا ہے جن کے بارے میں سوچنا بھی

دشوار ہے۔ یہ دانشوروں کی تن آسانی یا تذبذب کا وقت نہیں بلکہ صورت حال کا ایماندارانہ اور واضح جائزہ لینے کا وقت ہے۔ اس بات کے حق میں دلائل دیے جا سکتے ہیں کہ 1947 میں مہاراجہ ہری سنگھ کی حیلہ طرازی کشمیر کا عظیم جدید المیہ تھی، ایسا المیہ جو آگے چل کر ناقابل تصور خونریزی اور ان لوگوں کی جو تقریباً آزاد ہو چکے تھے، طویل غلامی پر منتج ہوا۔

تقسیم کا خطرہ پہلے ہی سر اٹھا چکا ہے۔ ہندوتو کے حلقوں میں ایسی افواہیں پھیل رہی ہیں کہ وادی کے ہندوؤں پر حملہ کر کے انھیں یہاں سے نکل جانے پر مجبور کر دیا جائے گا۔ جواباً جموں سے آنے والی فون کالوں میں بتایا گیا کہ ایک مسلح ہندو ملیشیا قتل عام کی دھمکی دے رہی ہے اور ہندو اکثریت کے دونوں ضلعوں کے مسلمان باشندے بھاگنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ (اس وقت کی یادیں سیلاب کی طرح چڑھتی آ رہی ہیں جب ہندوستان اور پاکستان کی تقسیم ہوئی تھی اور دس لاکھ سے زیادہ لوگ مارے گئے تھے۔ وہ بھیانک خواب ہمیشہ ہمارے ذہنوں پر مسلط رہے گا۔)

یہ ماننے کی قطعی کوئی وجہ نہیں کہ تاریخ خود کو دہرائے گی۔ سوائے اس کے کہ اسے اس پر مجبور کر دیا جائے۔ سوائے اس کے کہ لوگ سرگرمی سے ایسی دہشت ناک تباہی کو وجود میں لانے کی کوشش کریں۔ لیکن مستقبل کے امکانات کے بارے میں کوئی بھی خوف ایک پوری قوم اور اس کے لوگوں پر فوجی قبضے کے تسلسل کا جواز نہیں بن سکتا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے وہ پرانی نوآبادیاتی دلیل، کہ نیٹو لوگ ابھی آزادی حاصل کرنے کے قابل نہیں ہوئے، نوآبادیاتی منصوبے کو جائز ثابت نہیں کر سکتی تھی۔

بلاشبہ ہندوستانی ریاست کے پاس بہت سے طریقے ہیں جن کے ذریعے وہ کشمیر پر اپنا قبضہ برقرار رکھ سکتی ہے۔ ایک تو وہی جس میں اسے مہارت حاصل ہے۔ انتظار کرنا، اس امید میں کہ کسی ٹھوس منصوبے کی غیر موجودگی میں لوگوں کی توانائی زائل ہو جائے گی۔ اس اتحاد میں دراڑیں ڈالنے کی کوشش کی جا سکتی ہے جو رفتہ رفتہ ابھر رہا ہے۔ پرامن احتجاج کو کچل کر دوبارہ شدت پسندی کو مدعو کیا جا سکتا ہے۔ یہاں تعینات فوجیوں کی تعداد پانچ لاکھ سے بڑھا کر دس لاکھ کی جا سکتی ہے۔ درست وقت اور مقام پر کیے گئے چند قتل عام، کچھ نمایاں شخصیتوں کو ٹھکانے لگانا، بہت سے افراد کو غائب کر دینا اور گرفتار کر لینا — یہ ہتھکنڈے کچھ اور سال کام آ سکتے ہیں۔

کشمیر پر فوجی قبضہ برقرار رکھنے کے لیے عوامی خزانے سے خرچ کی جانے والی جو ناقابل تصور

رقم درکار ہے، اس کا حق ہے کہ اسے اسکولوں اور ہسپتالوں پر اور ہندوستان کی مفلس اور غذا کی کمی کی شکار آبادی کو خوراک مہیا کرنے پر صرف کیا جائے۔ وہ کس طرح کی حکومت ہوگی جس کا اعتقاد یہ ہو کہ اسے کشمیر میں مزید اسلحے، مزید خاردار تاروں اور مزید قید خانوں پر یہ رقم خرچ کرنے کا حق حاصل ہے؟

کشمیر پر ہندوستانی قبضے نے ہم سب کو عفریتوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ کشمیری مسلمانوں کی آزادی کی جدوجہد کو یرغمال بنا کر، ہندو جنونیوں کو ہندوستان بھر میں مسلمانوں کو ہدف بنانے اور تنگ کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اسے گھول کر ایک زہریلا آمیزہ تیار کیا جارہا ہے اور اسے سیدھا ہمارے خون کے بہاؤ میں داخل کیا جارہا ہے۔

اس کی تہہ میں ایک اخلاقی سوال موجود ہے۔ کیا کسی حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ لوگوں کی آزادی کو فوجی طاقت کے ذریعے سلب کر لے؟

ہندوستان کو کشمیر سے آزاد ہونے کی اتنی ہی۔ بلکہ اس سے زیادہ۔ ضرورت ہے جتنی کشمیر کو ہندوستان سے آزاد ہونے کی۔

❄❄

Scanned with CamScanner

ارن دھتی رائے

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

نائن الیون نہیں

ہمیں اپنے المیوں پر بھی کوئی حق حاصل نہیں رہا۔ جوں جوں ممبئی کا سانحہ، ایک ایک ہولناک دن کر کے، وقوع پذیر ہو رہا تھا، چوبیس گھنٹے چلنے والے نیوز چینل ہمیں اطلاع دیتے جا رہے تھے کہ یہ ''ہندوستان کا نائن الیون'' ہے۔ کسی پرانی ہالی وُڈ فلم کے بالی وُڈ میں بنائے گئے چربے کی طرح ہم سے اپنے پارٹ ادا کرنے اور اپنے مکالمے ادا کرنے کی توقع کی جاتی ہے، حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ سب کچھ پہلے کہا اور کیا جا چکا ہے۔

بڑھتے ہوئے تناؤ میں امریکی سینیٹر جان مک کین نے پاکستان کو تنبیہ کی ہے کہ اگر اس نے فوراً ''برے لوگوں'' (Bad Guys) کو گرفتار نہ کیا تو اس کے پاس ذاتی اطلاع ہے کہ ہندوستان پاکستان میں موجود ''دہشت گردی کے کیمپوں'' پر ہوائی حملے کر سکتا ہے، اور امریکہ اس سلسلے میں کچھ کرنے سے قاصر رہے گا کیونکہ ممبئی ''ہندوستان کا نائن الیون'' ہے۔

لیکن نومبر ستمبر نہیں، دو ہزار آٹھ دو ہزار ایک نہیں، پاکستان افغانستان نہیں، اور ہندوستان امریکہ نہیں۔ چنانچہ شاید ہمیں اپنا المیہ واپس لینا چاہیے، اور اس ملبے کو اپنے ذہنوں اور اپنے ٹوٹے ہوئے دلوں کی مدد سے کریدنا چاہیے تاکہ ہم خود اپنے نتائج تک پہنچ سکیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ نومبر کے آخری ہفتے میں کشمیر کے لوگ، ہزاروں ہندوستانی فوجیوں کی نگرانی میں، ووٹ ڈالنے کے لیے قطاروں میں کھڑے تھے، جبکہ ہندوستان کے امیر ترین شہر کا

امیر ترین علاقہ جنگ زدہ گپواڑا کا منظر دکھا رہا تھا جو کشمیر کا سب سے زیادہ تباہ شدہ ضلع ہے۔

ممبئی پر ہونے والا حملہ اس سال ہندوستان کے شہروں اور قصبوں پر ہونے والے دہشت گردی کے حملوں میں محض تازہ ترین ہے: احمد آباد، بنگلور، دہلی، گوہاٹی، جے پور اور مالیگاؤں میں بم کے دھماکوں سے سیکڑوں عام لوگ ہلاک اور زخمی ہو چکے ہیں۔ ان حملوں کے سلسلے میں جو مشتبہ لوگ۔ ہندو اور مسلمان دونوں، سب کے سب ہندوستانی باشندے۔ گرفتار کیے گئے ہیں اگر ان کے بارے میں پولیس کا بیان درست ہے تو اس کا مطلب ہے، اس ملک میں کہیں بہت بڑی گڑبڑ ہو رہی ہے۔

اگر آپ ٹی وی دیکھتے رہے ہیں تو شاید آپ کو پتا بھی نہ چلا ہو کہ ممبئی میں کچھ عام لوگ بھی ہلاک ہوئے ہیں۔ انھیں ایک ریلوے اسٹیشن اور ایک عام ہسپتال میں گولیوں کی باڑھ سے ہلاک کیا گیا۔ دہشت گردوں نے امیر غریب میں فرق نہیں کیا۔ دونوں کو ایک جیسی سفاکی سے ہلاک کیا۔ لیکن دوسری طرف ہندوستانی میڈیا کی نظریں خیرہ ہو کر اس ہولناکی پر جم گئیں جس نے انڈیا شائننگ کی چمکدار رکاوٹیں توڑ کر اپنا تعفن دو ناقابل یقین حد تک پُرتعیش ہوٹلوں کی لابیوں اور ایک چھوٹے سے یہودی مرکز تک پہنچا دیا تھا۔

ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ان میں سے ایک ہوٹل ممبئی شہر کا نشان (icon) ہے۔ یہ بالکل سچ ہے۔ یہ اس سہل اور فحش ناانصافی کا نشان ہے جسے عام لوگ ہر روز جھیلتے ہیں۔ اس دن جب اخبار حسین افراد کے لکھے ہوئے ان تعزیت ناموں سے بھرے ہوئے تھے جو انھوں نے ہوٹل کے ان کمروں کی یاد میں لکھے تھے جہاں وہ کبھی ٹھہرے تھے، ان ذائقہ نواز ریستورانوں کی یاد میں جن سے انھیں محبت تھی (ستم ظریفی یہ ہے کہ ان میں ایک ریستوران کا نام ''قندھار'' تھا)، اور ان ملازموں کی یاد میں جو ان کی خدمت کیا کرتے تھے، ان میں سے ایک قومی روزنامے کے اندر کے صفحے پر اوپر بائیں ہاتھ کے کونے میں ایک چھوٹے سے باکس میں (جس کی قیمت غالباً ایک پیزا کمپنی نے ادا کی تھی) کہا گیا تھا: ''ہنگری کیا؟'' (Hungry kya?) اس میں یقیناً نہایت نیک دلی کے ساتھ پڑھنے والوں کو اطلاع دی گئی تھی کہ بھوک کے بین الاقوامی اشاریے کے اعتبار سے ہندوستان کا مقام ابھی سوڈان اور صومالیہ سے نیچے ہے۔ لیکن ظاہر ہے، یہ ''وہ جنگ'' نہیں ہے۔ وہ جنگ تو ہمارے

Scanned with CamScanner

دیہات کی دلت بستیوں میں، نرمدا اور کوئل کا روندیوں کے کناروں پر، چینگارا کی ربڑ کی جاگیروں میں، نندی گرام، سینگور، چھتیس گڑھ، جھارکھنڈ، اڑیسہ کے گاؤوں میں، مغربی بنگال کے لال گڑھ میں اور ہمارے وسیع وعریض شہروں کی مفلوک الحال بستیوں اور جھونپڑپٹیوں میں لڑی جارہی ہے۔

وہ جنگ ٹی وی پر دکھائی نہیں دیتی — ابھی تک تو نہیں۔ چنانچہ، اور سب کی طرح، کیوں نہ ہم اس جنگ پر توجہ کریں جو ٹی وی پر دکھائی جارہی ہے۔

دہشت گردی کے بارے میں حالیہ بحث کرنے والوں کو ایک سخت، سفاک اور بے رحم لکیر دو دھڑوں میں بانٹے ہوئے ہے۔ ایک طرف کے لوگ (جنھیں ہم فریق A کہیں گے) وہ ہیں جو دہشت گردی کو، خصوصاً ''اسلام پسند'' (Islamist) دہشت گردی کو، ایک ایسی مکروہ، قابل نفرت اور جنونی شے سمجھتے ہیں جو اپنے ہی محور پر، اپنے مدار میں گھوم رہی ہے اور اپنے اردگرد کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں رکھتی، تاریخ، جغرافیہ اور معاشیات سے قطعی کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ چنانچہ، فریق A کا کہنا ہے، اسے سیاسی تناظر میں رکھنے، یا محض اسے سمجھنے کی کوشش کرنا اسے جائز ٹھہرانا ہے، اور یہ بذاتِ خود ایک جرم ہے۔

فریق B اس پر یقین رکھتا ہے کہ اگرچہ کوئی چیز دہشت گردی کا جواز نہیں بن سکتی، لیکن دہشت گردی زمان ومکاں اور سیاست کے ایک مخصوص تناظر میں واقع ہوتی ہے، اور اسے اس تناظر میں دیکھنے سے انکار کرنا مسئلے کو مزید سنگین بنانا اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو خطرے میں ڈالنا ہے۔

حافظ سعید کے اقوال، جس نے 1990 میں لشکر طیبہ قائم کی اور جو اسلام کے سخت گیر سلفی مسلک سے تعلق رکھتا ہے، یقیناً فریق A کے موقف کو تقویت دیتے ہیں۔ حافظ سعید خودکش بم حملوں کو جائز ٹھہراتا ہے، یہودیوں، شیعوں اور جمہوریت سے نفرت کرتا ہے، اور یہ مانتا ہے کہ اس وقت تک جہاد کیا جائے جب تک اسلام — اُس کا اسلام — دنیا پر تسلط قائم نہ کرلے۔ اس کے اقوال میں یہ بھی شامل ہے: ''جب تک انڈیا سلامت ہے اس وقت تک امن قائم نہیں ہوسکتا۔ انھیں کاٹ ڈالو، انھیں اتنا کاٹو کہ وہ گھٹنوں کے بل تمھارے سامنے جھک جائیں اور رحم کی التجا کریں۔''

اور: ''انڈیا نے ہمیں یہ راستہ دکھایا ہے۔ جس طرح وہ کشمیر میں مسلمانوں کو قتل کررہا ہے، ہم ہندوؤں کو قتل کرکے اسے اسی کی زبان میں جواب دیں گے۔''

Scanned with CamScanner

لیکن فریق A احمد آباد میں رہنے والے بابو بجرنگی کو کہاں رکھے گا، جو خود کو دہشت گرد نہیں بلکہ جمہوریت پسند سمجھتا ہے؟ وہ 2002 میں گجرات میں ہونے والی نسل کشی کا ایک اہم کردار تھا اور اس نے (کیمرے کے سامنے) کہا تھا: ''ہم نے میاں کی ایک دکان نہیں چھوڑی تھی، سب کو جلا دیا تھا۔ اور ان کو سب کو جلایا تھا، کاٹا تھا... ہمارا ماننا ہے کہ ان کو جلانا چاہیے، کیونکہ یہ حرامی جلنا نہیں چاہتے، ڈرتے ہیں جلنے سے... میری بس ایک آخری خواہش ہے... پھر چاہے پھانسی پر چڑھا دو... مجھے صرف دو دن چاہییں، میں جوہاپورہ میں جاؤں گا جہاں سات آٹھ لاکھ میاں لوگ رہتے ہیں... ان سب کو ختم کر دوں گا... اور مریں، کم سے کم 25000 سے 50000 تک مرنے چاہییں...''

اور فریق A کی ترتیب میں آر ایس ایس کی بائبل یعنی ایم ایس گولوالکر کی کتاب We, or Our Nationhood Defined کو کہاں رکھا جائے گا جو 1944 میں آر ایس ایس کا سربراہ بنا تھا۔ اس کتاب میں لکھا ہے: ''اس منحوس دن سے لے کر جب مسلمانوں نے ہندوستان میں قدم رکھا، آج اس وقت تک، ہندو قوم دلیری کے ساتھ ان ملیچھوں سے لڑتی آ رہی ہے۔ نسلی جذبہ ہمیشہ بیدار رہا ہے۔''

یا: ''اپنی نسل اور تہذیب کا خالص پن قائم رکھنے کے لیے، جرمنی نے اپنے ملک کو سامی نسل والوں یعنی یہودیوں سے پاک کر کے دنیا کو چونکا دیا ہے۔ یہاں نسلی تفاخر اپنے بلند ترین درجے میں ظاہر ہوا ہے... ہم ہندوستانیوں کو اس مثال سے سیکھنا اور فائدہ اٹھانا چاہیے۔''

(ظاہر ہے کہ ہندو دائیں بازو کی بندوق کی زد میں صرف مسلمان ہی نہیں ہیں۔ دلتوں کو متواتر نشانہ بنایا جاتا رہا ہے۔ حال ہی میں اڑیسہ میں کھنڈامل کے مقام پر عیسائیوں کو ڈھائی مہینے سے تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے جس کے نتیجے میں 40 سے زیادہ لوگ ہلاک ہو چکے ہیں۔ چالیس ہزار لوگوں کو ان کے گھروں سے بے دخل کر دیا گیا ہے جن میں سے آدھے اب پناہ گزین کیمپوں میں رہنے پر مجبور ہیں۔)

ان تمام برسوں میں حافظ سعید لاہور میں جماعت الدعوہ کے سربراہ کے طور پر (جسے بہت سے لوگ لشکر طیبہ کا سیاسی نقاب سمجھتے ہیں) ایک معزز شخص کی حیثیت سے زندگی گزارتا رہا ہے۔ وہ آج بھی اپنے جنونی جہاد کے لیے کم عمر لڑکوں کو بھرتی کرنے میں مصروف ہے۔ گیارہ دسمبر کو اقوام متحدہ نے

Scanned with CamScanner

جماعت الدعوہ پر پابندیاں عائد کر دیں۔ پاکستان کی حکومت نے بین الاقوامی دباؤ کے تحت حافظ سعید کو گھر پر نظر بند کر دیا۔ تاہم بابو بجرنگی گجرات میں ضمانت پر آزاد ہے اور ایک معزز شخص کی حیثیت سے زندگی گزار رہا ہے۔ نسل کشی کے واقعات کے چند سال بعد وہ وی ایچ پی چھوڑ کر شوسینا میں چلا گیا تھا۔ بجرنگی کا سابق مربی نریندر مودی اب بھی گجرات کا وزیر اعلیٰ ہے۔ جس شخص نے گجرات میں نسل کشی کی سرپرستی کی اسے اس کے بعد دو مرتبہ پھر منتخب کیا جا چکا ہے اور ہندوستان کے سب سے بڑے کارپوریٹ ہاؤس — ریلائنس اور ٹاٹا — اس کا گہرا احترام کرتے ہیں۔

سہیل سیٹھ، ٹی وی کے مشہور منتظم اور کارپوریٹ ترجمان، نے حال ہی میں کہا: "Modi is God." جن پولیس اہلکاروں نے گجرات میں ہلاکت اور لوٹ مار کرتے ہندو بلوائیوں کی نگرانی اور بعض موقعوں پر مدد بھی کی انھیں انعامات اور ترقیاں ملی ہیں۔ ہندوستان بھر میں آر ایس ایس کی پینتالیس ہزار شاخیں ہیں، اس کے زیر اہتمام چلنے والے خیراتی اداروں کی فہرست بہت لمبی ہے اور اس کے ستر لاکھ رضا کار اس کی نفرت کی مہم کا پرچار کرنے میں مصروف ہیں۔ ان رضا کاروں میں نریندر مودی بھی ہے، لیکن اس کے علاوہ سابق وزیر اعظم واجپئی اور حزب اختلاف کا موجودہ لیڈر آڈوانی، اور متعدد سینئر سیاست کار، بیوروکریٹ اور پولیس اور انٹیلی جنس کے اہلکار بھی شامل ہیں۔

اگر ہماری سیکولر جمہوریہ کی تصویر کو درہم برہم کرنے کے لیے اتنا کافی نہیں تو ہمیں یہ بات بھی ریکارڈ پر لانی چاہیے کہ ہندوستان میں بہت سی مسلمان تنظیمیں بھی ہیں جو اپنی تنگ نظر جنونیت پھیلانے میں مصروف ہیں۔

چنانچہ سب کچھ دیکھ بھال کر اگر مجھے فریق A اور فریق B میں سے ایک کو چننا ہو تو میں فریق B کو چنوں گی۔ ہمیں تناظر کی ضرورت ہے۔ ہمیشہ۔

اس نیوکلیئر برصغیر میں یہ تناظر 1947 میں ہونے والی تقسیم سے شروع ہوتا ہے۔ ریڈکلف کی لکیر جس نے ریاستوں، ضلعوں، گاؤوں، کھیتوں، برادریوں، آبپاشی کے نظاموں، گھروں اور خاندانوں کو تقسیم کر ڈالا، اسے راتوں رات کھینچا گیا تھا۔ یہ ہم پر برطانیہ کی آخری، الوداعی لات تھی۔ تقسیم کے نتیجے میں جو فسادات شروع ہوئے ان میں دس لاکھ سے زیادہ لوگوں کی جان گئی اور حالیہ تاریخ کی انسانی آبادی کی سب سے بڑی نقل مکانی ہوئی۔ اسی لاکھ لوگ، ہندو نئے پاکستان سے اور

Scanned with CamScanner

مسلمان نئی قسم کے ہندوستان سے، اپنے گھر چھوڑ کر تن کے کپڑوں میں جان بچا کر بھاگنے پر مجبور ہوئے۔

ان میں سے ہر شخص کے پاس ناقابلِ تصور اذیت، نفرت، دہشت کی ایک کہانی ہے جو اس سے اگلی نسل کو منتقل ہو رہی ہے، لیکن یہ کہانی آرزوؤں کی بھی ہے۔ وہ زخم، وہ پھٹ چکے لیکن اب تک اینٹھے ہوئے عضلات، وہ خون اور وہ ٹوٹی ہوئی ہڈیاں ہمیں اب تک ایک ایسی بغلگیری میں تھامے ہوئے ہیں جو نفرت اور دہشت ناک مانوسیت کے ساتھ ساتھ محبت کی بھی ہے۔ اس نے کشمیر کو ایک ایسے بھیانک خواب میں گرفتار چھوڑ دیا ہے جس سے وہ رہا نہیں ہو پا رہا، ایسا بھیانک خواب جس میں اب تک ساٹھ ہزار زندگیاں تلف ہو چکی ہیں۔ پاکستان، پاک لوگوں کا وطن، پہلے اسلامی جمہوریہ بنا، اور پھر سرعت کے ساتھ ایک بدعنوان، پرتشدد فوجی ریاست بن گیا جو دوسرے مذہبوں کے سلسلے میں کھلم کھلا عدم رواداری ہے۔ اس کے برعکس ہندوستان نے خود کو ایک شمولیت پسند، سیکولر جمہوریت قرار دیا۔ یہ ایک شاندار قدم تھا، لیکن بابو بجرنگی کے پیشرو 1920 سے سخت محنت کرتے ہوئے ہندوستان کے خون کے بہاؤ میں زہر ٹپکانے میں، ہندوستان کے تصور کو جنم لینے سے پہلے ہی تباہ کرنے میں مصروف رہے ہیں۔ 1990 کے آتے آتے وہ اتنے طاقتور ہو چکے تھے کہ اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کر سکیں۔ 1992 میں آڈوانی کے بھڑکائے ہوئے ہندو جنونیوں کے ہجوم نے بابری مسجد پر دھاوا بول کر اسے مسمار کر ڈالا۔ 1998 میں بی جے پی مرکز میں برسرِ اقتدار آ چکی تھی۔ امریکہ کی دہشت گردی کے خلاف جنگ نے ان لوگوں کے بادبانوں میں ہوا بھر دی۔ اس نے انھیں من مانی کرنے کا موقع دیا، یہاں تک کہ نسل کشی کا ارتکاب کر کے اسے انتشار زدہ جمہوریت کی ایک جائز شکل ٹھہرانے تک کا موقع دیا۔ یہ سب ایک ایسے وقت پر ہوا جب ہندوستان نے اپنی وسیع منڈی بین الاقوامی سرمائے کے لیے کھول دی تھی اور یہ اقدام عالمی کارپوریشنوں اور ان کی ملکیت میں چلنے والے میڈیا ہاؤسوں کے مفاد میں تھا، کیونکہ وہ ہندوستان کو ایک ایسے ملک کے طور پر پیش کرنا چاہتے تھے جہاں کچھ غلط ہو ہی نہیں سکتا۔ اس سے نہ صرف ہندو قوم پرستوں کو بڑھاوا ملا بلکہ وہ جواب دہی کے خطرے سے بھی محفوظ ہو گئے، جس کی انھیں ضرورت تھی۔

یہ ہے برصغیر میں دہشت گردی کا، چنانچہ ممبئی پر ہونے والے حملے کا، وسیع تر تاریخی تناظر۔

Scanned with CamScanner

ہمیں اس پر حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ لشکر طیبہ کا حافظ سعید شملہ کا رہنے والا ہے اور آر ایس ایس کا آڈوانی سندھ کا۔

جیسا کہ 2001 میں پارلیمنٹ پر حملے، 2002 میں سابرمتی ایکسپریس کی ایک بوگی کی آتش زنی اور 2007 میں سمجھوتہ ایکسپریس پر بم حملے کے بعد ہوا تھا، ہندوستانی حکومت نے اعلان کیا کہ اس کے پاس "ناقابل تردید" شواہد موجود ہیں کہ ممبئی حملے میں لشکر طیبہ کا ہاتھ ہے جس کی پشت پناہی پاکستانی آئی ایس آئی کر رہی ہے۔ لشکر نے اپنے ملوث ہونے کی تردید کی، لیکن اصل ملزم اب تک وہی ہے۔ پولیس اور انٹیلی جنس کے بیان کے مطابق لشکر ہندوستان میں انڈین مجاہدین نامی ایک تنظیم کے ذریعے کام کرتا ہے۔ دو ہندوستانی شہری، جموں و کشمیر پولیس کے لیے کام کرنے والا ایک اسپیشل پولیس آفیسر شیخ مختار احمد اور مغربی بنگال کے شہر کولکاتا کا رہنے والا توصیف رحمٰن ممبئی حملوں کے سلسلے میں گرفتار کیے گئے ہیں۔

چنانچہ پاکستان پر سیدھا سیدھا لگنے والا الزام ابھی سے دھندلا پڑنے لگا ہے۔ تقریباً ہر بار جب بھی ایسی کہانیوں کی تہیں کھلتی ہیں تو پیادہ سپاہیوں، تربیت کاروں، بچولیوں اور خفیہ انٹیلی جنس اور کاؤنٹر انٹیلی جنس کارکنوں کا ایک جال پھیلا دکھائی دیتا ہے جو نہ صرف ہندوپاک سرحد کے دونوں طرف بلکہ بہت سے ملکوں میں بیک وقت کام کر رہے ہیں۔ آج کی دنیا میں کسی دہشت گرد حملے کے منبع کا تعین کرنا اور اسے کسی ایک ملک کی سرحد کے اندر محدود کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کارپوریٹ سرمائے کے منبع کا سراغ لگانا۔ یہ قریب قریب ناممکن ہے۔

ایسے حالات میں دہشت گردی کے کیمپ تباہ کرنے کی غرض سے کیے جانے والے ہوائی حملوں سے کیمپ تو شاید تباہ ہو جائیں، لیکن دہشت گرد ہرگز ختم نہیں ہوں گے۔ اور جنگ بھی نہیں۔ (مزید یہ کہ ہمیں خود کو اعلیٰ اخلاقی مقام پر فائز کرنے کی کوشش میں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہمارے ہمسایہ ملک سری لنکا میں سرگرم لبریشن ٹائیگرز آف تمل ایلم (LTTE) کو، جو دنیا کا خوفناک ترین دہشت گرد گروپ ہے، ہندوستانی فوج نے تربیت دی تھی۔

پاکستان، جسے اتحادی کے طور پر پہلے افغان اسلام پسندوں کی حمایت میں امریکہ کی جنگ میں شامل ہونا پڑا اور پھر انھی اسلام پسندوں کے خلاف اس کی دوسری جنگ میں بھی، اور جس کا پورا

Scanned with CamScanner

رقبہ ان تضادات کے بوجھ تلے چرچرا رہا ہے، خانہ جنگی کی طرف جھکا چلا جا رہا ہے۔ سوویت یونین کے خلاف امریکی جہاد کے لیے بھرتی ایجنٹ کے طور پر پاکستانی فوج اور آئی ایس آئی کو بنیاد پرست تنظیموں کو پروان چڑھانے اور انھیں امریکی فنڈ مہیا کرنے کی ذمے داری دی گئی تھی۔ ان عفریتوں میں جان ڈال کر انھیں دنیا پر چھوڑ دینے کے بعد مریکہ کو یہ بھی توقع تھی کہ جب وہ چاہے گا پالتو شکاری کتوں کی طرح ان کی لگام کھینچ کر انھیں قابو میں لے آئے گا۔

یہ توقع تو اسے بہرحال نہیں تھی کہ وہ گیارہ ستمبر کو 'ہوم لینڈ' کے قلب میں در آئیں گے۔ چنانچہ جب ایسا ہوا تو افغانستان کو ایک بار پھر تشدد کے ذریعے نئے سرے سے بنانا ضروری ہو گیا۔ اب دوبارہ تباہ کیے ہوئے افغانستان کا ملبہ پاکستان کی سرحد تک چلا آیا ہے۔ کوئی شخص اس سے انکار نہیں کرتا، بشمول پاکستانی حکومت کے، کہ وہ ایک ایسے ملک کا انتظام چلانے پر مامور ہے جو اندر کی جانب پھٹنے کے شدید خطرے میں ہے۔ دہشت گردوں کے تربیتی کیمپ، آگ اگلتے ملّا اور جنونی، جن کو یقین ہے کہ دنیا پر اسلام کا تسلط ہوگا، یا ہونا چاہیے، یہ سب دو افغان جنگوں کا ریزہ ریزہ ملبہ ہے۔ ان کا طیش پاکستانی حکومت اور پاکستانی شہریوں پر بھی اسی طرح، بلکہ شاید اس سے زیادہ شدت سے نازل ہو رہا ہے جس طرح ہندوستان پر۔

اگر اس موقعے پر ہندوستان نے جنگ چھیڑنے کا فیصلہ کیا تو شاید پورے خطّے کے انتشار کی دلدل میں اترنے کا عمل مکمل ہو جائے گا۔ ایک دیوالیہ، تباہ شدہ پاکستان کا ملبہ ہندوستان کے ساحل پر آ کر جمع ہو جائے گا اور ہمیں ایسے خطرے میں ڈال دے گا جیسا اس سے پہلے کبھی درپیش نہیں ہوا۔ اگر پاکستان تباہ ہوا تو ہمیں اپنے پڑوسیوں کے طور پر لاکھوں ''غیر ریاستی عناصر'' کی توقع کرنی چاہیے جن کے قبضے میں نیوکلیئر اسلحہ بھی ہوگا۔ یہ سمجھنا دشوار ہے کہ ہندوستان کے جہاز کا سکّان جن افراد کے ہاتھ میں ہے وہ پاکستان کی غلطیوں کو دہرانے اور امریکہ کو ہمارے انتہائی پیچیدہ معاملات میں بھونڈے پن سے دخل اندازی کرنے کی دعوت دے کر اپنے ملک پر تباہی لانے پر کیوں تلے بیٹھے ہیں۔ کسی سپر پاور کے اتحادی نہیں ہوتے — اس کے محض ایجنٹ ہوتے ہیں۔

مثبت پہلو کے طور پر، جنگ کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ یہ ہندوستان کے لیے ان مسائل کا سامنا کرنے سے بچنے کا بہترین طریقہ ہے جو اندرونِ ملک سنگین ہوتے جا رہے ہیں۔ چوبیس گھنٹے چلنے

Scanned with CamScanner

والے ہمارے 67 نیوز چینلوں (اور خدا جانے کتنے بین الاقوامی چینلوں) نے ممبئی کے حملوں کو لائیو (اور exclusive) ٹیلی کاسٹ کیا۔ اسٹوڈیو میں بیٹھے ٹی وی اینکروں اور "گراؤنڈ زیرو" پر موجود صحافیوں نے اپنی پرجوش کمنٹری میں ذرا بھی وقفہ نہ آنے دیا۔ تین دن اور تین رات ہم بے یقینی کے عالم میں دیکھتے رہے کہ کس طرح اسلحے اور آلات سے مسلح نہایت نوعمر لڑکوں کے ایک چھوٹے سے ٹولے نے اس مفروضہ طور پر انتہائی طاقتور، نیوکلیئر اسلحے کی مالک سپر پاور کی پولیس، ایلیٹ نیشنل سکیورٹی گارڈز اور میرین کمانڈوز کی بے بسی کو پوری طرح آشکار کر دیا۔

ایسا کرتے ہوئے ان لڑکوں نے ریلوے اسٹیشنوں، ہسپتالوں اور پرتعیش ہوٹلوں میں نہتے لوگوں کو بہیمانہ انداز سے، ان کے طبقے، ذات، مذہب یا قومیت سے بے نیاز ہو کر قتل کیا۔ (سکیورٹی فورسز کی بے بسی کی ایک وجہ یرغمالیوں کے بارے میں تشویش بھی تھی۔ کسی اور صورت حال میں، مثلاً کشمیر میں، ان کی حکمت عملی اتنی حساسیت پر مبنی نہیں ہوتی۔ پوری پوری عمارتوں کو بارود سے اڑا دیا جاتا ہے۔ انسانی ڈھال بے جھجک استعمال کی جاتی ہے۔ فلسطین، عراق اور افغانستان میں امریکی اور اسرائیلی فوجیں رہائشی عمارتوں میں کروز میزائل داغنے اور براتوں پر ڈیزی کٹر گرانے سے نہیں ہچکچاتیں۔) لیکن یہاں بات مختلف تھی۔ اور پھر اسے ٹی وی پر بھی تو دکھایا جا رہا تھا۔

قتل کرنے اور خود مارے جانے پر دہشت گرد لڑکوں کی بے پروا آمادگی نے ان کے بین الاقوامی ناظرین کو سحر زدہ کر دیا۔ ٹی وی دیکھنے والے خودکش بم دھماکوں اور میزائل حملوں کی جس روزمرہ خوراک کے عادی ہو گئے تھے، انھوں نے اس سے مختلف چیز پیش کی۔ اب ایک نیا منظر سامنے تھا۔ ڈائی ہارڈ 25۔ یہ دلخراش پرفارمنس جاری رہی اور ٹی وی کی ریٹنگ میں اضافہ ہوتا رہا۔ کسی بھی ٹیلی وژن میگنیٹ یا کارپوریٹ ایڈورٹائزر سے پوچھ لیجیے — جو منٹوں نہیں، سیکنڈوں کا حساب لگاتا ہے — کہ اس کی مالیت کتنی ہو سکتی ہے۔

آخر کار قاتل مارے گئے اور بری طرح مارے گئے۔ (ممکن ہے ان میں سے کچھ افراتفری کا فائدہ اٹھا کر فرار بھی ہو گئے ہوں۔ ہمیں شاید اس کا پتا کبھی نہ چل پائے۔) اس پوری کشمکش کے دوران دہشت گردوں نے نہ کوئی مطالبہ کیا اور نہ مذاکرات کی خواہش ظاہر کی۔ ان کا مقصد لوگوں کو ہلاک کرنا اور خود مارے جانے سے پہلے زیادہ سے زیادہ ہلاکت پھیلانا تھا۔ انھوں نے پوری طرح ہماری سٹی گم

Scanned with CamScanner

کردی۔ جب ہم کہتے ہیں: ''دہشت گردی کا کوئی جواز نہیں ہوسکتا،'' تو ہم میں سے بیشتر کی مراد یہ ہوتی ہے کہ انسانی جان لینے کا کوئی جواز نہیں ہوسکتا۔ ہم یہ اس لیے کہتے ہیں کیونکہ ہم زندگی کا احترام کرتے ہیں، کیونکہ ہم اسے قیمتی سمجھتے ہیں۔ تو پھر یہ لوگ ہماری سمجھ میں کیونکر آئیں جنھیں زندگی کی — خود اپنی زندگی کی بھی — کوئی پروا نہیں؟ سچ یہ ہے کہ ہم قطعی نہیں جانتے کہ ان لوگوں کو کیونکر سمجھا جائے، کیونکہ ہم محسوس کر سکتے ہیں کہ موت سے ہم کنار ہونے سے پہلے ہی یہ لوگ ایک ایسی دنیا میں پہنچ چکے ہیں جہاں ہم ان تک نہیں پہنچ سکتے۔

ایک ٹی وی چینل (انڈیا ٹی وی) نے حملہ آوروں میں سے ایک کے ساتھ، جس نے اپنا تعارف عمران بابر کے نام سے کرایا، ٹیلیفون پر بات چیت نشر کی۔ میں اس گفتگو کے حقیقی ہونے کی تصدیق نہیں کر سکتی لیکن اس نے جو کچھ کہا وہ وہی تھا جو دہشت کے ان ای میل پیغامات میں درج تھا جو ہندوستان کے کئی شہروں میں ہونے والے بم دھماکوں سے پہلے جاری کیے گئے تھے۔ یہ وہی چیزیں ہیں جن کے بارے میں بات کرنا ہم اب پسند نہیں کرتے: 1992 میں بابری مسجد کی مسماری، 2002 میں گجرات میں مسلمانوں کی نسل کشی، کشمیر میں بہیمانہ جبر۔ ''تم گھیرے میں آ چکے ہو،'' ٹی وی اینکر نے حملہ آور سے کہا۔ ''تمھارا مارا جانا یقینی ہے۔ تم ہتھیار کیوں نہیں ڈال دیتے؟''

''مرتے تو ہم روزانہ ہیں،'' اس نے ایک عجیب، میکانیکی انداز سے جواب دیا۔ ''ایک دن شیر کی طرح زندہ رہ کر اس طرح مرنا بہتر ہے۔'' اس کی باتوں سے ایسا نہیں لگتا تھا کہ وہ دنیا کو تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ وہ دنیا کو اپنے ساتھ ہلاکت کے گڑھے میں لے جانے کا خواہشمند معلوم ہوتا تھا۔

اگر یہ افراد واقعی لشکرِ طیبہ کے رکن تھے تو انھیں اس بات کا خیال کیوں نہیں آیا کہ مارے جانے والوں میں سے بہت سے مسلمان ہیں؟ یا یہ کہ جن مسلمانوں کے حقوق کے لیے وہ لڑنے کا دعویٰ کر رہے ہیں ہندوستان میں اس حملے کے ہونے والے ردعمل میں انھیں سنگین نقصان اٹھانا پڑ سکتا ہے؟ دہشت گردی ایک سنگ دل نظریہ ہے، اور بیشتر نظریوں کی طرح، جن کی نگاہ وسیع تر مجموعی تصویر پر جمی رہتی ہے، انسان انفرادی طور پر ان کے حساب کتاب میں سوائے ضمنی تباہی (collateral damage) کے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ یہ دہشت گردی کی سرگرمی کا حصہ ہی نہیں بلکہ اس کا مقصد رہا ہے کہ کسی خراب صورت حال کو مزید بگاڑ کر اس میں زیرِ زمین چھپی دراڑوں کو ظاہر کیا جائے۔

Scanned with CamScanner

''شہیدوں'' کا خون دہشت گردی کی آبیاری کرتا ہے۔ ہندو دہشت گردوں کو ہندو لاشیں درکار ہوتی ہیں، کمیونسٹ دہشت گردوں کو پرولتاریوں کی لاشیں، اسلام پسند دہشت گردوں کو مسلمانوں کی لاشیں۔ یہ لاشیں مظلومیت کا نشان، اس کی شہادت، اس کا ثبوت بن جاتی ہیں، جو اس منصوبے کا مرکزی حصہ ہے۔ دہشت گردی کی کسی واحد کارروائی سے فوجی فتح حاصل کرنا مقصود نہیں ہوتا؛ زیادہ سے زیادہ اس سے ایک عمل انگیز (catalyst) کے طور پر موثر ہونے کی توقع کی جاتی ہے، تاکہ وہ کسی اور شے کو مہمیز کر سکے، کسی ایسی شے کو جو موجودہ کارروائی سے کہیں زیادہ بڑی ہو، یعنی زیر زمین چٹانوں کو حرکت میں لا کر زلزلہ پیدا کر سکے۔ دہشت گردی کی کارروائی بجائے خود ایک تھیٹر ہوتی ہے، ایک قابل دید منظر اور ایک علامت سازی، اور آج وہ جس اسٹیج پر اپنے چکردار رقص اور اپنی حیوانی کارروائی کا مظاہرہ کر رہی ہے وہ لائیو ٹیلی وژن کا اسٹیج ہے۔ اس وقت بھی جب ٹی وی اینکر ان حملوں کی مذمت کر رہے تھے، دہشت گردی کی کارروائی کو ٹی وی پر ہزار گنا بڑا کر کے پیش کیا جا رہا تھا۔

ٹی وی تجزیوں کے بے شمار گھنٹوں اور لاتعداد اخباری مضامین میں، کم سے کم ہندوستان میں، کمرے میں موجود ہاتھیوں جیسے حقائق — کشمیر، گجرات، بابری مسجد کی مسماری — کا بمشکل ہی کہیں ذکر آیا۔ اس کے بجائے ریٹائرڈ سفارت کار اور حکمت عملی کے ماہرین پاکستان کے خلاف جنگ چھیڑنے کے فوائد اور نقصانات پر بحث کرتے رہے۔ ہم نے مالدار لوگوں کو یہ دھمکی دیتے دیکھا کہ اگر ان کی سلامتی کی ضمانت نہ دی گئی تو وہ ٹیکس دینا بند کر دیں گے (گویا غریبوں کا غیر محفوظ رہنا کوئی غلط بات نہیں)۔ ہم نے لوگوں کی زبان سے اس قسم کی تجویزیں سنیں کہ حکومت دستبردار ہو جائے اور ہندوستان کی ہر ریاست کو ایک الگ کارپوریشن کے حوالے کر دیا جائے۔ ہم نے دیکھا کہ دلتوں اور نچلی ذاتوں کے ہیرو اور اونچی ذاتوں کے ولن سابق وزیر اعظم وی پی سنگھ کی موت کی خبر کو کس طرح نظرانداز کر دیا گیا۔

ہم نے Maximum City کے مصنف اور بالی وڈ کی فلم مشن کشمیر کے شریک مصنف سکیتو مہتہ کو جارج بش کی مشہور تقریر "Why they hate us" کا اپنا روپ پیش کرتے ہوئے دیکھا۔ مذہبی جنونی — ہندو اور مسلمان، دونوں قسم کے — ممبئی شہر سے کیوں نفرت کرتے ہیں؟ اس بارے میں سکیتو مہتہ کا تجزیہ یہ ہے: ''شاید اس لیے کہ ممبئی بے حساب دولت کمانے کے دیدہ

دلیر خوابوں اور بلا امتیاز کھلے پن کا شہر ہے۔" تو پھر اس نفرت کا جواب کیا ہو؟ وہ کہتا ہے: "دہشت گردوں کو بہترین جواب یہ ہوگا کہ اور زیادہ بڑے خواب دیکھے جائیں، اور زیادہ دولت کمائی جائے، اور ہمیشہ سے بڑھ کر ممبئی کے سفر پر آیا جائے۔" کیا جارج بش نے بھی نائن الیون کے بعد امریکیوں سے یہی نہیں کہا تھا کہ انھیں باہر نکل کر خوب شاپنگ کرنی چاہیے؟ آہ، نائن الیون! وہ دن جس سے پیچھا چھڑانا ہمارے لیے ناممکن سا ہو گیا ہے۔

اگرچہ ممبئی میں ہولناکی کا ایک باب ختم ہو گیا ہے، لیکن دوسرے باب کا شاید آغاز ہو رہا ہے۔ ہر روز ہندوستانی اشرافیہ کا ایک طاقتور، پُرشور حصہ، غارت گرٹی وی اینکروں کی شہ پا کر، جن کے مقابلے میں فاکس نیوز تقریباً ریڈیکل اور بائیں بازو کا معلوم ہونے لگا ہے، سیاست کاروں پر، تمام سیاست کاروں پر، اندھادھند برستا ہے، پولیس اور فوج کی مدح سرائی کرتا ہے اور پولیس اسٹیٹ کے قیام کا باقاعدہ مطالبہ کرتا معلوم ہوتا ہے۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ جو لوگ جمہوریت کے (جیسی تیسی بھی وہ ہے) پھل کھا کر فربہ ہوئے ہیں وہی اب پولیس اسٹیٹ کے آرزومند ہیں۔ "پھل چننے" کا دور عرصہ ہوا ختم ہو چکا۔ اب ہم زبردستی ہتھیانے کے دور میں ہیں، اور جمہوریت کو اس عمل میں حائل ہونے کی ناگوار عادت ہے۔

پولیس اچھی، سیاست دان برے/ فوج اچھی حکومت خراب/ ہندوستان اچھا پاکستان برا — ایسے خطرناک اور احمقانہ فلیش کارڈ، ہر ٹیلی وژن چینل پر کھلم کھلا دکھائے جا رہے ہیں اور ان چینلوں نے اپنے ناظرین کو ایک بے قابو ہسٹیریا میں مبتلا کر ڈالا ہے۔

المناک بات یہ ہے کہ عقل کی یہ شیر خوارگی ایک ایسے وقت پر سامنے آ رہی ہے جب ہندوستان کے لوگوں کو یہ دکھائی دینے لگا تھا کہ دہشت گردی کے کاروبار میں مظلوم اور ظالم کبھی کبھی ایک دوسرے سے جگہیں بدل لیتے ہیں۔ یہ ایسی فہم ہے جسے کشمیر کے لوگوں نے، پچھلے بیس برس کے اپنے ہولناک تجربے کے نتیجے میں، مانجھ مانجھ کر ایک فن لطیف کی شکل دے لی ہے۔ باقی ہندوستان میں ہم ابھی اسے سیکھ رہے ہیں۔ (اگر کشمیر اپنی مرضی سے ہندوستان سے متحد نہیں ہوتا تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کشمیر سے متحد/منتشر ہو جائے گا۔)

یہ صرف 2001 کے پارلیمنٹ پر حملے کے بعد ہوا کہ کچھ سنجیدہ سوالات اٹھائے جانے لگے۔

Scanned with CamScanner

وکیلوں اور سیاسی کارکنوں کے ایک گروپ نے اس کا پردہ فاش کیا کہ کس طرح پولیس اور پریس نے بے قصور لوگوں کو مجرم ٹھہرا دیا، کس طرح جعلی شہادتیں گھڑی گئیں، گواہوں نے کیسے جھوٹی گواہیاں دیں اور تفتیش کے ہر مرحلے پر قواعد وضوابط کی کس کس طرح مجرمانہ خلاف ورزیاں کی گئیں۔ آخر کار عدالتوں نے چار میں سے دو ملزموں کو، بشمول ایس اے آر گیلانی، جسے پولیس نے پوری کارروائی کا ماسٹر مائنڈ قرار دیا تھا، بری کر دیا۔ تیسرے ملزم شوکت گرو کو بھی اس پر لگائے گئے تمام الزامات سے بری کر دیا گیا لیکن ایک نئے، نسبتاً چھوٹے جرم میں اسے سزا سنائی گئی۔ ایک ملزم محمد افضل کی سزائے موت کو سپریم کورٹ نے بحال رکھا۔ اپنے فیصلے میں عدالت نے تسلیم کیا کہ ایسی کوئی شہادت دستیاب نہیں ہے کہ محمد افضل کسی دہشت گرد گروپ سے وابستہ تھا، لیکن اس کے بعد یہ صدمہ انگیز الفاظ بھی لکھے کہ ''معاشرے کا مجموعی ضمیر صرف اسی صورت میں تسکین پا سکتا ہے کہ مجرم کو سزائے موت دی جائے۔'' آج بھی دراصل ہم نہیں جانتے کہ ہندوستانی پارلیمنٹ پر حملہ کرنے والے کون لوگ تھے اور کس کے لیے کام کر رہے تھے۔

ابھی حال ہی میں، ستمبر 2008 میں، جامعہ نگر، دہلی، کے محلے بٹلہ ہاؤس میں ایک متنازع پولیس مقابلہ ہوا جس میں دہلی پولیس کے اسپیشل سیل نے دو مسلمان طالب علموں کو ان کے کرائے کے فلیٹ کے اندر گھس کر بے حد قابل اعتراض حالات میں گولیاں مار کر قتل کر دیا اور دعویٰ کیا کہ وہ اس سال دہلی، جے پور اور احمد آباد میں ہونے والے بم دھماکوں کے لیے ذمے دار تھے۔ ایک اسسٹنٹ کمشنر پولیس موہن چند شرما، جس نے پارلیمنٹ پر حملے کی تفتیش میں اہم کردار ادا کیا تھا، وہ بھی اس واقعے میں ہلاک ہوا۔ وہ ہندوستان کے متعدد ''انکاؤنٹر اسپیشلسٹوں'' میں سے ایک تھا جسے کئی ''دہشت گردوں'' کو سرسری کارروائی میں ہلاک کر ڈالنے کا صلہ شہرت اور انعامات کی شکل میں ملا۔ محلے میں رہنے والے عینی گواہوں کے علاوہ کانگریس پارٹی کے سینئر رہنماؤں، طالب علموں، صحافیوں، وکیلوں، استادوں اور سیاسی کارکنوں کی طرف سے اسپیشل سیل کے خلاف احتجاج کی آوازیں اٹھیں، جن میں سے ہر ایک نے اس واقعے کی عدالتی تحقیقات کا مطالبہ کیا۔ اس کے جواب میں بی جے پی اور ایل کے آڈوانی نے موہن چند شرما کو ایک ''بہادر سورما'' کہہ کر سراہا اور ان لوگوں کے خلاف ایک منظم مہم شروع کر دی جنھوں نے پولیس کی ایمانداری پر شبہ کرنے کی جرأت کی تھی؛ اس نے پولیس کے

Scanned with CamScanner

بیان پر شبہ کرنے والوں کو ''قوم دشمن'' قرار دیا اور یہ کہا کہ ان کا موقف ''خودکشی پر مائل'' ہے۔ ظاہر ہے کہ اس واقعے کی اب تک کوئی تحقیقات نہیں ہوئی ہے۔

بٹلہ ہاؤس والی واردات کے چند روز بعد ''دہشت گردوں'' کے بارے میں ایک اور کہانی خبروں میں سامنے آئی۔ سیشن کورٹ میں داخل کرائے گئے ایک بیان میں سنٹرل بیورو آف انوسٹی گیشن (CBI) نے کہا کہ دسمبر 2005 میں دہلی کے اسپیشل سیل کی ایک ٹیم نے (وہی ٹیم جس نے بٹلہ ہاؤس کے پولیس مقابلے کا اہتمام کیا اور جس میں موہن چند شرما بھی شامل تھا) دو بے گناہ افراد، ارشاد علی اور معارف قمر، کو اغوا کیا، ان پر دو کلوگرام آر ڈی ایکس دھماکا خیز مواد اور دو پستولوں کی برآمدگی مڑھی اور پھر انھیں کشمیر میں کارروائیاں کرنے والے ایک گروپ البدر سے تعلق رکھنے والے ''دہشت گرد'' قرار دے کر گرفتار کر لیا۔ ارشاد اور معارف، جو کئی برس سے جیل میں پڑے ہیں، ان سیکڑوں مسلمانوں میں سے صرف دو مثالیں ہیں جنھیں اسی طرح قید میں ڈالا گیا، ایذا دہی کا نشانہ بنایا گیا، حتیٰ کہ جھوٹے الزام لگا کر ہلاک تک کیا گیا ہے۔

اس جانے پہچانے سلسلے میں تبدیلی اس وقت دکھائی دی جب مہاراشٹر کے اینٹی ٹیررسٹ اسکواڈ (ATS) نے، جو ستمبر 2008 میں مالیگاؤں میں ہونے والے بم دھماکوں کی تفتیش کر رہا تھا، ایک ہندو سادھوی پراگیہ اور ایک خودساختہ گرو سوامی دیانند پانڈے اور ہندوستانی فوج کے ایک حاضر سروس افسر لیفٹیننٹ کرنل پروہت کو گرفتار کیا۔ گرفتار ہونے والے یہ تمام افراد ہندو قوم پرست تنظیموں سے تعلق رکھتے تھے جن میں ہندو غلبے کے لیے کام کرنے والا ایک گروپ ابھنو بھارت بھی شامل تھا۔ شوسینا، بی جے پی اور آر ایس ایس نے مہاراشٹر اے ٹی ایس کی مذمت کی، اس کے سربراہ ہیمنت کرکرے پر سیاسی سازش میں ملوث ہونے کا الزام لگایا اور اعلان کیا کہ ''ہندو دہشت گرد نہیں ہو سکتے''۔ آڈوانی نے پولیس کے ہر شک شبے سے بالاتر ہونے کے بارے میں اپنی پالیسی میں تبدیلی پیدا کی اور بڑے بڑے اجتماعات میں اشتعال انگیز تقریریں کیں جن میں اس نے متبرک مردوں اور عورتوں کے بارے شکوک پیدا کرنے پر اے ٹی ایس کی مذمت کی۔

25 نومبر کے اخباروں میں یہ رپورٹ چھپی کہ اے ٹی ایس مالیگاؤں بم دھماکوں میں ممکنہ طور پر ملوث ہونے کے سلسلے میں وشو ہندو پریشد کے سربراہ پروین توگڑیا کے بارے میں تحقیقات کر رہا

ہے۔ اگلے دن، قسمت کے ایک غیر معمولی پھیر سے، ہیمنت کرکرے ممبئی حملوں میں ہلاک ہو گیا۔ امکانات یہ ہیں کہ اے ٹی ایس کے اگلے سربراہ کے لیے، خواہ وہ کوئی بھی ہو، اس سیاسی دباؤ کی مزاحمت کرنا نہایت دشوار ہوگا جس کا مالیگاؤں دھماکوں کے سلسلے میں ڈالا جانا یقینی ہے۔

اگرچہ سنگھ پریوار اس سلسلے میں ابھی کسی واضح نتیجے پر پہنچتا دکھائی نہیں دے رہا کہ اب پولیس کی کارروائی پر اعتراض کرنا قوم دشمنی اور خودکشی پر مائل ہونا ہے یا نہیں، لیکن ٹائمز ناؤ ٹی وی چینل کے اینکر پرسن ارناب گوسوامی نے بہر حال اس جانب ایک قدم بڑھا دیا ہے۔ اس نے باقاعدہ نام لے کر شرانگیز الزامات لگانا اور پولیس اور مسلح افواج کی ایمانداری پر اعتراض اٹھانے والے لوگوں کو کھلم کھلا دھمکانا شروع کر دیا ہے۔ میرا اور معروف وکیل پرشانت بھوشن کا نام کئی بار لیا گیا ہے۔ ایک موقعے پر، ایک سابق پولیس افسر کا انٹرویو کرتے ہوئے، ارناب گوسوامی نے کیمرے کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا، ''ارن دھتی رائے اور پرشانت بھوشن! امید ہے تم لوگ بھی سن رہے ہو گے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ تم گھناؤنے لوگ ہو۔'' آج جس قسم کا جنونی اور ہیجان خیز ماحول ہے، اس میں ایک ٹی وی اینکر کی جانب سے اس قسم کی بات دھمکی بھی ہے اور لوگوں کو ہمارے خلاف بھڑکانے کی کوشش بھی، اور کسی اور قسم کے حالات میں اس کا نتیجہ اس صحافی کی ملازمت سے علیحدگی کی صورت میں نکل سکتا تھا۔

چنانچہ وہ شخص جو ہندوستان کا اگلا وزیر اعظم بننے کا خواہشمند ہے، اور وہ جو ایک مین اسٹریم ٹی وی چینل کا نمائشی چہرہ ہے، دونوں کا موقف یہ ہے کہ شہریوں کو پولیس کے بارے میں کسی قسم کے سوالات اٹھانے کا کوئی حق نہیں۔ اور یہ بات ایک ایسے ملک میں کہی جا رہی ہے جو مشتبہ دہشت گرد حملوں، مشکوک تفتیشوں، اور جعلی ''مقابلوں'' کی ایک نیم تاریک تاریخ رکھتا ہے۔ ایک ایسا ملک جہاں پولیس کی حراست میں ہونے والی ہلاکتوں کی تعداد دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہے اور اس کے باوجود وہ ایذا رسانی کے خلاف بین الاقوامی معاہدے پر دستخط کرنے سے انکاری ہے۔ ایک ایسا ملک جہاں اذیت گاہوں تک پہنچنے والے لوگ خوش قسمت سمجھے جاتے ہیں کہ کم سے کم وہ ہمارے ''انکاؤنٹر اسپیشلسٹوں'' کے ہاتھوں ''مقابلے'' میں ہلاک کر دیے جانے سے بچ نکلے۔ ایک ایسا ملک جہاں انڈرورلڈ اور انکاؤنٹر اسپیشلسٹوں کے درمیان کوئی حد فاصل وجود نہیں رکھتی۔

ہم میں سے وہ لوگ جن کے دل ان تمام باتوں کے علم کے باعث مریض ہو چکے ہیں، ممبئی

حملوں کو کس طرح دیکھیں اور ان کے بارے میں کیا کریں؟ ایک طرف ایسے لوگ ہیں جن کا خیال ہے کہ امریکہ کی حکمت عملی اس اعتبار سے کامیاب رہی ہے کہ نائن الیون کے بعد سے اس کی سرزمین پر کوئی اور حملہ نہیں ہوا۔ تاہم دوسری طرف ایسے لوگ بھی ہیں جن کے خیال میں امریکہ اب اس سے بدتر حالت سے گزر رہا ہے۔ اگر نائن الیون کے دہشت گرد حملوں کا مقصد یہ تھا کہ امریکہ کو اپنے اصل رنگ میں سامنے آنے پر اکسایا جائے، تو اس مقصد میں اس سے بڑی کامیابی کیا ہو سکتی ہے؟ امریکی فوج دو ایسی جنگوں میں الجھ گئی ہے جن کا جیتا جانا ممکن نہیں اور جنھوں نے امریکہ کو دنیا کا سب سے نفرت انگیز ملک بنا دیا ہے۔ ان جنگوں نے امریکی معیشت کے اُدھڑنے کے عمل میں کلیدی کردار ادا کیا ہے اور کون جانے، شاید امریکی ایمپائر کی شکست بھی انھی کے نتیجے میں واقع ہو۔ (کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ بمباری اور ہلاکت کا شکار افغانستان، جو روس کا قبرستان بنا تھا، اس دوسری ایمپائر کے خاتمے کا بھی سبب بن جائے؟) ہزاروں امریکی سپاہیوں سمیت لاکھوں افراد عراق اور افغانستان میں ہلاک ہو چکے ہیں۔ باقی دنیا میں امریکی اتحادیوں/ ایجنٹوں (بشمول ہندوستان) پر اور امریکی مفادات پر ہونے والے دہشت گرد حملوں کی تعداد میں نائن الیون کے بعد سے ڈرامائی اضافہ ہو گیا ہے۔ جارج بش، جس نے نائن الیون کے امریکی ردعمل کی قیادت کی، نہ صرف بین الاقوامی طور پر بلکہ امریکی عوام کی نظر میں بھی ایک مکروہ کردار بن کر رہ گیا ہے۔ کون ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ امریکہ دہشت گردی کے خلاف جنگ جیت رہا ہے؟

امریکہ میں ہوم لینڈ سکیورٹی پر کئی بلین ڈالر خرچ آیا ہے۔ دنیا میں بہت کم ملک ایسے ہیں، ہندوستان تو ہرگز نہیں، جو اس قسم کے خرچ کا بوجھ اٹھا سکیں۔ اور اگر ہم اٹھا بھی سکتے، تو حقیقت یہ ہے کہ ہمارا ہوم لینڈ اس طریقے سے محفوظ نہیں بنایا جا سکتا، نہ پولیس کی ہمہ گیر نگرانی میں رہ سکتا ہے جیسا امریکہ میں ہوا ہے۔ یہ اس قسم کا ہوم لینڈ ہے ہی نہیں۔ ہمارے پڑوس میں نیوکلیئر ہتھیاروں سے مسلح ایک دشمن ریاست موجود ہے جو رفتہ رفتہ قابو سے باہر ہوتی جا رہی ہے، کشمیر میں ہمارا فوجی قبضہ ہے اور 15 کروڑ سے زیادہ کی مسلمان آبادی ہے جسے شرمناک طریقے سے زیادتیوں کا نشانہ بنایا اور غریب کیا جاتا رہا ہے اور جسے بطور گروہ ہدف بنا کر دیوار سے لگا دیا گیا ہے، جس کے نوجوانوں کو افق پر انصاف کا کوئی نشان دکھائی نہیں دیتا اور جو امید ترک کر کے اگر شدت پسندی اختیار کر لیں تو صرف

Scanned with CamScanner

ہندوستان ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کو خطرے میں ڈال سکتے ہیں۔ اگر دس افراد این ایس جی کمانڈوز اور پولیس کو تین دن تک الجھائے رکھ سکتے ہیں، اور اگر وادی کشمیر کو دبا کر رکھنے کے لیے پانچ لاکھ سپاہیوں کی ضرورت پڑتی ہے، تو آپ خود حساب کر لیجیے۔ کس قسم کی ہوم لینڈ سکیورٹی ہو سکتی ہے جو ہندوستان کو تحفظ فراہم کر سکے؟

اور کوئی زود اثر حل بھی موجود نہیں ہے۔ دہشت گردی کے خلاف بنائے جانے والے قوانین دہشت گردوں کے لیے نہیں ہوتے؛ وہ ان لوگوں کے لیے ہوتے ہیں جو حکومتوں کے ناپسندیدہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ان قوانین کے ذریعے سزا تک پہنچنے والوں کا تناسب دو فیصد سے کم ہے۔ یہ قوانین صرف ناپسندیدہ افراد کو لمبی مدت تک ضمانت کے بغیر قید میں رکھنے اور پھر آخر کار رہا کر دینے کے لیے ہیں۔ ضمانت سے محرومی یا آخر کار پھانسی پانے کا امکان ممبئی پر حملہ آور ہونے والے دہشت گردوں جیسے لوگوں کو جرم سے باز نہیں رکھ سکتا۔ یہی تو وہ شے ہے جو انھیں درکار ہے۔

جو کچھ ہمارے سامنے آ رہا ہے وہ عشروں تک اختیار کیے جانے والے زود اثر حلوں اور غلیظ ہتھکنڈوں کا مجموعی نتیجہ ہے۔ قالین ہمارے پیروں کے نیچے دلدل بنا جا رہا ہے۔

دہشت گردی کو محدود کرنے کا واحد طریقہ (اسے ختم کرنے کی بات تو سادہ لوحی ہوگی) یہ ہے کہ ہم آئینے میں اپنی صورت دیکھیں۔ ہم ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں سے آگے راستہ دو شاخہ ہو گیا ہے۔ ایک طرف جانے والی تختی پر لکھا ہے: ''انصاف''، اور دوسرے پر ''خانہ جنگی''۔ کوئی تیسری تختی موجود نہیں اور واپس لوٹنا ناممکن ہے۔ ہمیں اپنا راستہ چننا ہے۔

❀❀

چودھری محمد نعیم

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

لشکر کی مائیں

کتاب کا عنوان ہے ہم مائیں لشکر طیبہ کی؛ اس کی مرتب خود کو 'امّ حماد' کہتی ہیں اور یہ کتاب دارالاندلس، لاہور، نے شائع کی ہے۔ اس کی تینوں جلدوں کا خون آلود سرورق ایک ہی ہے جس میں ایک بہت بڑا گلابی رنگ کا گلاب دکھایا گیا ہے جس میں سے خون ٹپک رہا ہے اور پس منظر میں پہاڑ اور دیودار کے درخت دکھائی دے رہے ہیں۔ کتاب کی پہلی جلد، جس کے صفحات کی تعداد 381 ہے، نومبر 1998 میں شائع ہوئی اور پھر اسے اپریل 2001 میں دوبارہ شائع کیا گیا۔ دوسری اور تیسری جلد (جو بالترتیب 377 اور 262 صفحات پر مشتمل ہیں) اکتوبر 2003 میں شائع ہوئیں۔ ان میں سے ہر اشاعت کی تعداد گیارہ سو تھی۔ کتاب کے اقتباسات — غالباً اس کا بڑا حصہ — لشکر کے رسالے مجلة الدعوة میں قسط وار چھپے۔ کتاب کے ناشر محمد رمضان اثری نے کتاب کے مشمولات اور مقصد کو یوں بیان کیا ہے:

> زیرِنظر کتاب ''ہم مائیں لشکر طیبہ کی'' محترم آپا ام حماد مسئولہ شعبہ خواتین جو کہ ام الشہیدین [1] بھی ہیں کی دن رات کی بھرپور محنت اور دور دراز کے سفروں کا خلاصہ اور مجموعہ

1 ''ام الشہیدین'' کے لغوی معنی ''دو شہیدوں کی ماں'' کے ہیں۔ ممکن ہے یہ میری نظر کا سہو ہو، لیکن مجھے کتاب میں مصنفہ کے کسی بیٹے کی شہادت کا کوئی ذکر نہیں ملا۔ یہاں صرف ایک بیٹے حماد کا ذکر آیا ہے، جو قطعی طور پر زندہ ہے اور جسے ام حماد ''مجاہد'' قرار دیتی ہیں۔

Scanned with CamScanner

ہے۔محترمہ کا پورا گھر اور پوری زندگی جہاد کے لیے وقف ہے۔ان کے شعری مجموے زبان زد مجاہدین ہیں۔ کتنے ہی نوجوان ان کی جہادی نظمیں پڑھ اور سن کر میدان جہاد کی طرف نکل کھڑے ہوئے اور کتنے ہی جنتوں کے وارث بن چکے ہیں۔... کارکنان کو چاہئے کہ [اس کتاب کو] گھروں میں خواتین کے مطالعہ میں شامل کریں تاکہ ہماری ماؤں بہنوں میں یہ جذبہ جہاد بیدار ہو۔

''سرگذشت'' کے عنوان سے اپنے تعارفی مضمون میں ام حماد اپنی قلب ماہیت کا حال قدرے تفصیل سے یوں بیان کرتی ہیں:

یہ ان دنوں کی بات ہے جب راقمہ جہاد کو فساد کہنے اور سمجھنے والوں میں شامل تھی، چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کو گھروں سے بھگا لے جانے، سکولوں سے ورغلا کر لے جانے اور کشمیر کی لڑائی میں جھونک دینے اور قربانی کے بکرے بنا کر غیر ملکی ایجنٹوں کے ریال، ڈالر کھانے والوں کے اس ٹولے سے کہ جس کا نام ''مرکز الدعوۃ والارشاد'' تھا، سخت متنفر تھی کہ اسی دوران مجھے محسوس ہوا کہ میرے میاں آصف علی ابوحماد (تنظیمی نام) حافظ محمد سعید صاحب سے بہت قریب ہو گئے ہیں، اگرچہ ان کا رابطہ، ملنا ملانا اور صحبت ونشست تو کئی سال سے تھی لیکن اب وہ اس بات کا برملا اعتراف واظہار کرنے لگے تھے کہ میں بنک جاب کر کے سود کی کمائی سے اپنے بچوں کو پال رہا ہوں، یہیں سے میرا ماتھا ٹھنکا اور میں نے یہ اندازہ لگالیا کہ یہ آدمی نام نہاد جہاد کشمیر کے ٹھیکیداروں کے ہتھے چڑھ گیا، لہٰذا میں نے احتیاطی اقدامات اور تدابیر کرنا شروع کر دیں۔ بنک سے جتنے قرضہ جات ملنے ممکن تھے سارے نکلوا لیے تاکہ جتنا ہو سکے یہ بندہ قرضوں کے بوجھ تلے دب جائے۔قصہ مختصر کہ ابوحماد رزق حرام کے احساس کے بوجھ تلے دبے جا رہے تھے اور میں قرضوں کے بوجھ تلے دبا کر اپنا مستقبل اور آسائش بھری زندگی محفوظ کرنا چاہ رہی تھی، انہیں دلاسے دے رہی تھی کہ ہم تو اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے ہیں، محنت کرتے ہیں، ڈیوٹی کرتے ہیں، شیطان تمام دلائل وتدابیر سے میری مدد کر رہا تھا اور اللہ برتر اپنے ایک معصوم اور نیک نیت بندے پر اپنی مدد اور ہدایت کے دروازے کھولنے پر اتر آیا تھا۔ بات بہت لمبی ہو

Scanned with CamScanner

باقی ہے پھر اللہ کا ایک بندہ اپنی ڈیوٹی پر صبح سویرے گھر سے نکلا اور استعفیٰ لکھ کر مینجر کے حوالے کیا، بنک کی دہلیز سے توبہ کر کے قسم کھا کر اللہ سے عہد کیا کہ آئندہ اس دروازے میں قدم نہ رکھوں گا، اپنے مرکز پہنچا اور وہاں سے سیدھا افغانستان میں مجاہدین لشکر طیبہ کے اولین تربیتی سنٹر جاجی چلا گیا۔ پورے خاندان پر قیامت گذر گئی۔ مرکز الدعوۃ اور امیرِ مرکز کے لیے جتنی گالیاں، جتنی دشنام طرازیاں اور جتنی زبان درازیاں ممکن ہوسکیں، وہ کیں لیکن انتقام کی آگ سرد نہ ہوئی۔ پھر خاندان والوں کے مشورے پر حافظ محمد سعید صاحب سے ایڈریس لیا اور اس فراڈی گروپ کو کوستی ہوئی مرکز طیبہ مظفر آباد جا پہنچی اور جو کچھ وہاں جا کر کیا وہ سارا شیطان کو خوش کرنے کے لیے بہت اچھا افسانہ تھا۔ اللہ تعالیٰ میرے گناہوں کو معاف فرمائے۔ چند دن وہاں رہ کر مجاہدین کی زندگی، ان کی مشقت، ان کا جذبہ اور ایمان دیکھا تو اپنے گھناؤنے ماضی اور اندھے گونگے بہروں والی گذری زندگی پر غور کر کے شرم وندامت اور پچھتاوے کا ذلت ناک احساس ہوا۔ اساتذہ اور مجاہدین کے دروس سنے تو پتہ چلا کہ جہاد فی سبیل اللہ جو اللہ برتر کے مسلمان بندوں کو، کلمہ پڑھنے والوں کو ساری دنیا کی شاہی اور عزت و وقار عطا کرتا ہے اس سے تو تمام زندگی بے خبر رہے، کبھی سوچا کرتی تھی کہ مسلمان روزے بھی رکھتے ہیں، نمازیں بھی پڑھتے ہیں، حج بھی کرتے ہیں تو پھر ان پر یہ ذلت، یہ مظالم اور پستی کیوں مسلط ہے کہ دنیا میں ہر جگہ کفار نے انہیں مشق ستم بنا رکھا ہے پھر قرآن پاک سے رجوع کیا۔ سورۂ انفال، سورۂ توبہ اور جہاد کے دیگر ابواب سنے پڑھے تو دین اسلام کا وہ تابناک اور درخشاں رخ سامنے آیا کہ جو ہماری تاریخ میں صلاح الدین ایوبی، طارق بن زیاد اور محمود غزنوی کی ماؤں کے تصور کو زندہ کرتا ہے۔ الحمدللہ ثم الحمدللہ۔

جہاد کے سفر کا پہلا معجزہ رونما ہوا، دل کی دنیا بدل گئی، اللہ برتر کی نظر احسان و کرم نے گناہ گار، سیاہ کار بندوں کو ناپاک رزق اور ناپاک زندگی کی دلدل سے نکالا اور جہاد جیسے افضل عمل کی توفیق بخشی۔ اللہ برتر ہمارے انیس برس تک سود کھا کر، بنک کی کمائی کھا کر، اللہ تعالیٰ سے جنگ کرنے کے عظیم گناہ کو معاف فرما دے، ہماری حقیر قربانیوں کو

قبول فرمالے اور تمام بھٹکے ہوئے مسلمانوں کو راہ راست دکھادے۔ آمین ثم آمین۔

ایک اور تعارفی تحریر بعنوان ''گذارشِ احوال'' میں ام حماد نے اس کتاب اور لشکر طیبہ کی سرگرمیوں کے آغاز پر کچھ روشنی ڈالی ہے۔ ان کے مطابق، اس گروپ نے اپنی مسلح کارروائیاں جاجی، افغانستان، میں شروع کیں اور وہاں نورستان کے سلفی مسلک کے افغانوں کے ساتھ مل کر سوویت فوجوں کے خلاف لڑائی میں حصہ لیا۔ (کتاب میں بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح متعدد ''شہیدوں'' نے اپنی فوجی تربیت افغانستان میں حاصل کی اور وہیں جنگ میں حصہ لیا۔ ایک باب میں ہونے والے ''شہید'' کی زبانی یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ عرب مجاہدین اپنے ساتھ لڑنے والے پاکستانیوں کا کس طرح مذاق اڑاتے تھے۔) بعد میں لشکر کشمیر میں داخل ہوا، اور اپنے ''سات سو سے بھی کم مجاہدین کے ساتھ سات لاکھ شیطانی فوج کے مقابل صف آرا ہو گیا۔''

مجاہدین کی مفروضہ فتوحات کی غلو آمیز رزمیہ تحسین کے بعد ام حماد اپنی بات جاری رکھتی ہیں:

پھر اس ٹوٹے پھوٹے قلم نے محسوس کیا کہ لشکر طیبہ کے مجاہدین کے لہو میں نہائے جسموں میں جن ماؤں بہنوں کی آرزوؤں اور امیدوں کا خون ہے، جن کے خوابوں اور خواہشات کا خون ہے، وہ پردے کے پیچھے ہیں چنانچہ تصویر کے اس رخ سے پردہ اٹھانا اپنا فرض اور قرض سمجھ کر بندی ناچیز نے امیرِ مرکز حافظ سعید صاحب کے سامنے اس خیال کو پیش کیا جنہوں نے اس کی بہت تائید و تلقین کی۔ چند روز بعد امیر لشکر طیبہ ذکی الرحمان لکھوی اور عبدالرحمان الداخل امیر مقبوضہ وادی پاکستان کے صوبہ پنجاب کے شہداء کے رابطہ عید کے لیے نکلے تو عزیزم حماد الرحمٰن کو پتہ چلا اور محترم امیر مرکز کی اجازت سے [اس نے] بطور محرم میرے ساتھ چلنے کا فیصلہ کیا اور یہ قافلہ [16 دسمبر 1995 کو] اللہ کی توفیق سے ضلع فیصل آباد کے شہید عمران مجید بٹ کے گھر شہید کی والدہ سے پہلی ملاقات کے لیے روانہ ہوا۔ . . اور پھر ایک سو سے زیادہ شہداء لشکر طیبہ کی عظیم ماؤں بہنوں کے دلوں سے ٹپکے ہوئے لہولہو الفاظ اور ستاروں کی طرح جگمگاتے ہوئے جذبے صفحۂ قرطاس پر اکٹھا کرتے ہوئے یکم رمضان المبارک 11 جنوری 1996 کو یہ قافلہ اپنے اپنے گھروں کو لوٹا۔

Scanned with CamScanner

بعد میں ام حماد نے اسی طرح کراچی اور سندھ کے دیگر علاقوں کا بھی دورہ کیا۔ جب قافلے کے مردشر کا خاندانوں کے مردار کان سے بات کررہے ہوتے تھے، ام حماد گھر کی عورتوں سے مل کر ان کے ''شہید'' بیٹوں یا بھائیوں کی یادیں قلمبند کیا کرتی تھیں۔ یہ کتاب بیشتر ان کی انھی یادداشتوں پر مبنی ہے، لیکن خالی جگہیں بھرنے کے لیے موقع بہ موقع انھوں نے لشکر کے جریدے مجلة الدعوة کی فائلوں سے بھی مواد حاصل کیا ہے۔

کتاب کی پہلی جلد تو واضح طور پر ام حماد ہی کی مرتب کردہ معلوم ہوتی ہے، لیکن باقی دونوں جلدیں، گو کہ ان پر بھی نام ام حماد ہی کا ہے، یوں لگتا ہے کہ جماعت کے کسی کارکن محرر کے قلم سے نکلی ہیں۔ خاص طور پر تیسری جلد میں شامل ابواب میں ان تمام چھوٹی چھوٹی شخصی تفصیلات کی کمی بری طرح کھٹکتی ہے جو ام حماد نے پہلی جلد میں شامل کہانیوں میں جابجا شامل کی ہیں۔ تیسری جلد میں محض ان غلو آمیز بیانات کو یکجا کر دیا گیا ہے جو پہلے پہل مجلہ میں شائع ہوئے تھے۔

کتاب کی پہلی جلد میں 81 ''شہیدوں'' کا احوال بیان کیا گیا ہے، دوسری جلد میں 58 اور تیسری جلد میں 45 کا۔ اگر بعض مقامات پر سامنے آنے والی تکرار اور فہرست سے باہر کے اضافوں کو بھی شامل کر لیا جائے، تو ان کا حاصل جمع 184 بنتا ہے۔ اس مختصر نمونے میں۔ لشکر کا دعویٰ ہے کہ ان کے ''شہدا'' کی تعداد اس سے کئی گنا زیادہ ہے۔ بیشتر خاندانوں کا تعلق دیہی علاقوں سے معلوم ہوتا ہے اور وہ مالی اعتبار سے زیادہ خوشحال نہیں لگتے، اور زیادہ تر ''شہید'' بیس بائیس سال یا اس سے کم عمر کے ہیں۔ ان میں سے بیشتر نے میٹرک یا اس کی مساوی سطح تک تعلیم حاصل کی ہے۔ ان میں سے محض چند ایک ایسے ہیں جنھوں نے کسی مدرسے میں تعلیم پائی ہے۔

کتاب کا ہر باب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے، زیادہ طویل حصے میں ''شہید'' کی زندگی اور کردار کو، زیادہ تر اس کی ماں یا بہن کے لفظوں میں، اجاگر کیا جاتا ہے، اگرچہ خاندان کے مردار کان کی باتیں بھی کہیں کہیں شامل کی گئی ہیں۔ یہاں ہمیں اس نوجوان کے پس منظر، اس کے خاندان اور محلے کے بارے میں معلوم ہوتا ہے، قلب ماہیت سے پہلے کے حالات سے واقفیت حاصل ہوتی ہے اور بیشتر صورتوں میں اس حصے کا اختتام نوجوان کی موت کے حالات کی تفصیل پر ہوتا ہے۔ دوسرا حصہ، جو مقابلتاً مختصر ہے، ''شہید'' کی جانب سے اپنے گھر والوں کو بھیجے گئے ''آخری پیغام'' پر مشتمل ہوتا ہے۔

Scanned with CamScanner

کڑے رسمی انداز کے حامل اور توقع کے مطابق گھڑے گھڑائے فقروں اور تراکیب سے مزین ان پیغامات میں بھی کہیں کہیں اس فرد کی جھلک دکھائی دے جاتی ہے جو ''شہید'' کے عمومی تصور کے پیچھے پوشیدہ ہے۔

ذیل میں کتاب کی پہلی جلد سے ایک ''شہید'' کی کہانی پیش کی جا رہی ہے۔ اپنے لہجے اور طرز بیان کے اعتبار سے اسے دوسری کہانیوں کا نمائندہ کہا جا سکتا ہے، فرق صرف یہ ہے کہ اس کہانی میں اس کا اپنے اصل نام کے علاوہ کوئی جہادی نام (لقب یا کنیت) نہیں ہے۔ (ناموں کے سلسلے میں مزید تبصرہ آگے چل کر ہوگا۔)

عمران عبدالمجید شہید رحمتہ اللہ علیہ

فیصل آباد کے محلہ خالد آباد کے دو منزلہ مکان میں نیچے کی منزل میں ایک کمرہ ہے۔ جس میں ایک بستر بچھا ہے، ایک میز اور کرسی رکھی ہے۔ میز پر مجلّوں اور دیگر جہادی کتابوں کا ایک مجموعہ رکھا ہے، جہادی فقرات اور آیات سے مزین کچھ اسٹیکر اور ایسی ہی دیگر اشیا ہیں اور کپڑوں کی ایک الماری ہے جو عمران مجید شہید کے کپڑوں اور دوسری چیزوں سے بھری پڑی ہے۔ یہ عمران شہید کا کمرہ ہے، اب اس کمرے میں عمران کے والدین نے بسیرا کر لیا ہے۔ والدہ کہتی ہیں: یہیں سوتی ہوں، یہیں عبادت کرتی ہوں، دل کو بہت سکون ملتا ہے۔

عمران مجید شہید اپنی چار بہنوں سے بڑے بھائی تھے۔ ایک بھائی سب بہنوں سے چھوٹے ہیں، عمران کی والدہ گریجویٹ ہیں۔ نہایت متین اور صابرہ وشاکرہ خاتون، عمران کی یادوں میں کھو کر گویا ہوئیں کہ:

''عمران بہت خوش پوشاک، سنجیدہ مزاج، نفاست پسند بچہ تھا۔ فرمائش کر کے لباس اور جرسیاں بنواتا، دوستوں سے گریز کرتا، البتہ کرکٹ کا بہت رسیا اور آل راؤنڈر کھلاڑی، جہاں کہیں ٹورنامنٹ ہوتے عمران کو بلایا جاتا تھا اور اس کام میں بہت زیادہ دلچسپی، کبھی فلاں ٹیم کی طرف سے کھیل رہا ہے، کبھی فلاں ٹیم کی قیادت کر رہا ہے۔

Scanned with CamScanner

’’پڑھائی میں بھی بہت ہونہار طالب علم تھا۔ بی اے تک نہایت دل جمی سے پڑھتے رہے اور بی اے نمایاں پوزیشن سے پاس کرلیا۔ بی اے پاس کرنے کے بعد ’سی ایس ایس‘ کی تیاری شروع کر دی۔ اس کے خاندان کا فیصل آباد میں کافی زیادہ اثرورسوخ ہے، لہٰذا بہت سی اچھی ملازمتوں کی پیش کشیں ہوئیں، سفارش بھی میسر تھی، لیکن عمران اعلیٰ ملازمت حاصل کرنے کے شوق میں سب کو ٹالتا رہا۔ اسی دوران میں انڈیا اور پاکستان کے درمیان کرکٹ میچ آ گیا۔ کہنے لگا: امی جان مجھے ٹی وی لے کر دیں۔ میں نے میچ دیکھنا ہے۔ ہمارے محلے میں بہت سارے گھر ہیں۔ میں نے کہا کہ عمران آپ کے پھوپھی، تایا کسی کے بھی گھر میں جا کر ٹی وی پر میچ دیکھ لینا۔ لیکن اس کی یہی ضد تھی کہ ٹی وی خرید کر میچ دیکھوں گا۔

’’انڈیا پاکستان کا میچ جب بھی ہوتا تو وہ اتنا پرجوش ہو جایا کرتا تھا کہ جیسے جنگ ہو رہی ہو، لہٰذا اس نے ٹی وی خرید کر ہی چھوڑا۔‘‘ یہ سن کر مجھے خیال آیا کہ عمران کے اندر اسلام دشمنوں کے لئے نفرت ہی تھی، جس کا اصل راستہ ذرا دیر سے ملا اور وہ میچوں کے سامنے بیٹھ کر اپنی نفرت اور دشمنی کا علاج کرتا رہا اور قدرت نے اس کے جذبوں کو حق و صداقت کے راستوں پر ڈال دیا۔ نجانے کتنے ایسے نوجوان ہیں جو کرکٹ میچ کے ذریعے اپنی نفرت اور دشمنی کو بھارت کے لئے ظاہر کرتے ہیں، اگر انہیں صحیح رہنمائی دی جائے تو وہ اس نفرت کو صحیح راستے پر ڈال کر راہ جہاد کو پہچان لیں۔ ان کے اندر کے طوفانوں سے بھارت کا زعم خس وخاشاک کی طرح بہہ جائے۔ بات ہو رہی تھی عمران مجید کی، خیالات کا ربط ٹوٹ گیا۔ عمران کی تینوں بہنیں بھی میرے پاس بیٹھ چکی تھیں اور پوری توجہ سے اپنی امی کو بولتے سن رہی تھیں۔ عمران کی بڑی ہمشیرہ بتانے لگیں کہ:

’’بی اے کرنے کے بعد عمران بھائی بہت بدلنے لگے تھے، قریبی مسجد کے امام اور خطیب مولانا ارشاد الحق صاحب نمازیوں سے کہا کرتے کہ ایک لڑکا ہے جس کا نماز میں خشوع وخضوع اور قیام دیکھ کر مجھے دلی خوشی ہوتی ہے۔ انہی مولانا کی صحبت میں عمران کو جہاد کا شعور حاصل ہوا۔ عمران جب تراویح کی نماز پڑھاتے تو ان کی بہنیں کہتیں، مانی

Scanned with CamScanner

بھائی! آپ بہت لمبا قیام کرواتے ہیں، ہم تو کھڑے کھڑے تھک جاتے ہیں۔ عمران خاموشی سے مسکرادیتے۔ عمران کی سوچوں نے راہ جہاد کا سفر شروع کر دیا تھا اور بس اب قدم اٹھانے کی دیر تھی، لہٰذا عمران نے والدہ سے اکیس دن کی تربیت کے لئے اجازت مانگ لی، انہیں اجازت مل گئی تو معسکر طیبہ چلے گئے۔ وہاں جاتے ہی مفصل خط لکھا۔ وہ معسکر طیبہ کے ماحول سے حاصل ہونے والی روحانی بالیدگی اور ایمانی پختگی سے مالامال ہو چکے تھے کہ وہ ٹی وی جو اتنے اصرار کے بعد لیا تھا وہ توڑنے کا ارادہ کر لیا۔ ایمان وہ معجزہ ہے جو قلب پروارد ہوتا ہے تو سینے ایمانی طہارت سے کس طرح منور ہو جاتے ہیں۔ نگاہیں کون ومکاں سے ماوراء تک کس طرح دیکھنے لگتی ہیں اور سوچوں کی اڑان عمل کی معراج تک کیسے پہنچ جاتی ہے۔ عمران مجید اب ٹی وی توڑنے کا مطالبہ اس لئے کرنے لگا ہے کہ اس کے بازوؤں میں اللہ برتر نے وہ طاقت بھر دی ہے جو خود بندوق اٹھا کر اللہ کے منکروں کا منہ توڑنے کے لئے مومن کو میدان جنگ میں لے جاتی ہے۔ اب نگاہیں جھوٹی تسکین کے سامان سے نفرت کرنے لگی تھیں، لہو کی گردش تیز ہو گئی تھی۔

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

عقابی روح اپنے شکار پر جھپٹنے کے لئے بیدار اور خبردار ہو چکی تھی۔ عمران نے واپس آ کر سب کو حیران کر دیا۔ اس کا چہرہ سنت رسول ﷺ سے مزین ہو چکا تھا۔ مزید سب گھر والوں نے دیکھ کر کہا موسمی پرندے تو نہیں بن جاؤ گے کہ چار دن بعد پھر منڈوا دو۔ لیکن عزم پختہ رہا۔ ایک روز عمران نے افغانستان جا کر جہاد میں شریک ہونے کا ارادہ والدہ پر ظاہر کر دیا، والدہ پریشان ہو گئیں۔ عمران کے اندر رونما ہوتے ہوئے انقلاب کو مدت سے دیکھ رہی تھیں، معاملہ کو بھانپ گئیں اور پھر سنبھل کر کہنے لگیں، ''عمران، یہ راستے جو تم نے چنے ہیں، بہت روشن ہیں، لیکن میری ذمہ داریاں میری مجبوری ہیں۔''

''عمران نرم دل تھا۔ ماں کو دکھ دینا اسے ہرگز گوارا نہ تھا، چپ ہو گیا۔ لیکن جہاد کی فضیلت اور شہادت کے انعامات بیان کرتا رہتا۔'' عمران کی والدہ نے بتایا کہ ''میں

Scanned with CamScanner

نے اسے ہمیشہ ناانصافی اور ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی نصیحت کی۔ میں خود بھی ظلم اور ناانصافی کے بہت خلاف ہوں۔"

"پھر وہ افغانستان چلے گئے اور افغان جہاد میں شریک ہو گئے۔ کبھی گھر آ جاتے، کچھ روز رکتے پھر چلے جاتے۔ لیکن ہمیں علم نہ ہو سکا کہ وہ کہاں آتے جاتے ہیں۔ البتہ ان کی خالہ صفیہ جو کہ گورنمنٹ ہائی سکول برکی میں ہیڈ مسٹریس ہیں، وہ ان کی رازدار تھیں اور ان کی حوصلہ افزائی بھی مسلسل کر رہی تھیں۔ والدہ کو تھوڑا تھوڑا علم ہو چکا تھا کہ عمران کی منزل کیا ہے اور وہ کس راستے پر چل رہا ہے، انہوں نے بالواسطہ طریقے سے اس کی توجہ اس طرف دلانا چاہی اور کہا کہ "عمران آپ کی چار بہنیں ہیں اور جوان ہو رہی ہیں۔ ان کے فرائض سے سبکدوش ہو جاؤ پھر تم جہاد کے لئے وقف ہو جانا۔" وہ اکثر جواب میں خاموش رہتا لیکن جب وہ زیادہ قائل کرنے کی کوشش کرتیں تو کہتا، "امی! آپ کی بیٹیاں گھر کی چاردیواری میں رہتی ہیں، امن و امان میں ہیں، محفوظ ہیں۔ پورا خاندان آس پاس میں رہتا ہے اور آپ کو ان کی فکر ہے، لیکن ان بیٹیوں کا بھی خیال کریں جو ہر وقت دشمنوں میں گھری ہیں، غیر محفوظ ہیں اور ہماری راہ دیکھ رہی ہیں۔" وہ لاجواب ہو جاتیں، اس بات پر تو ان کا دل بھی گواہی دیتا تھا۔

"عمران کو رابطہ اور ایکشن کے علاوہ کئی طرح کی تربیت دی گئی جو اس نے نہایت چابکدستی سے بہت کم وقت میں حاصل کر لی اور ہر طرح کے وائرلیس سیٹ کی تکنیک پر عبور حاصل کر لیا اور اسی مقصد کے لئے وہ وادی میں بھیجے جانے کے لئے منتخب ہوئے تھے۔ چونکہ ان دنوں وادی میں مجاہدین کا رابطہ آپس میں کمزور تھا اور اس میدان میں ماہر آدمی کی ضرورت تھی۔ عمران کو اس پر عبور حاصل تھا اس لئے وہ منتخب کئے گئے۔ گویا وہ کرکٹ کی طرح اس میدان میں بھی آل راؤنڈر ثابت ہوئے اور اسی مشن پر وادی میں گئے۔

"وادی میں جانے سے قبل جب ملنے کے لئے گھر آئے تو بہت کھوئے کھوئے رہے اور پہلے کی طرح ہنسی مذاق چھوڑ دیا۔ بقول والدہ یوں لگتا تھا جیسے کشمیری مظلوموں کا

غم اس کی روح میں بس چکا ہے اور وہ ساری محبتوں اور خوشیوں سے بے نیاز ہو چکا ہے۔
اور اسی طرح اسی حالت میں اس نے اپنی جان بھی اللہ کے حضور پیش کر دی۔''

عمران شہید کی والدہ سے ملنے جب عمران کی خالہ ام طلحہ اور دیگر خواتین کے ہمراہ ہم عمران کی شہادت سے تین روز بعد فیصل آباد ان کے گھر گئے تو اس وقت کی کیفیت بھی یاد آئی جب عمران کی والدہ نے سب مہمان خواتین کو کھانے کے وقت کہہ کر شروع کرنے کی دعوت دی کہ ''یہ عمران کی دعوت ولیمہ ہے، بسم اللہ کریں۔'' تب ساری خواتین نے حیرت بھری نظروں سے انہیں دیکھا تو وہ اطمینان سے بسم اللہ کہہ کر کھانا شروع کر چکی تھیں۔ لہٰذا انہیں بھی ان کی تقلید کرنا پڑی۔ آج ان کے خیالات سن کر یہ سمجھ میں آیا کہ اللہ نے ایسے ہی صابر و شاکر بندوں کے لئے آخرت میں دار الحمد تیار کر رکھے ہیں۔

عمران کی والدہ کے ساتھ ساتھ ان کی بہنیں، ان کے والد اور سب سے بڑھ کر ان کی خالہ صفیہ قابل تحسین ہیں۔ انہوں نے برابر اس کی حوصلہ افزائی کی اور ان کی مددگار بنیں۔ پھر اپنی بہن یعنی عمران کی امی اور بہنوں کی ذہن سازی کی۔ انہیں عمران کے جذبوں اور ارادوں کی بلندی اور عظمت کی اہمیت سمجھائی، پھر اس کی شہادت کے بعد بھی جہاد کے مشن کی پرستار ہیں اور مجاہدین کے لئے مالی مدد اور دعاؤں کے ساتھ دل و جان سے شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اجر عظیم عطا فرمائے اور شہید کی شفاعت کا حق دار بنائے۔ آمین!

عمران شہید کی والدہ اپنے جذبات کو شعر کی شکل میں ڈھالتی رہتی ہیں، جن میں عمران کی یاد کے ساتھ ساتھ جذبہ جہاد کی پر اثر آمیزش نظر آتی ہے۔ ان کے جذبات کا رنگ ملاحظہ ہو، ان میں شعری فکر و فن سے قطع نظر ان کی قلبی واردات کو ملحوظ خاطر رکھیے۔

تو ہوا شہید، میں شہید کی ماں
الٰہی یہ دامن مرا اور تیری سوغات
اللہ میں نے قبول کیا اپنے آنگن کا اندھیرا
مظلوموں کو عطا کر دے تاروں بھری رات

الٰہی! میرا لخت جگر، میرا جوان رعنا، میرا شہید
جو زخم زخم ہو کے گرا تو تیرے لئے
جو لہو لہو ہو کے بہا تو تیرے لئے
یہ جو مامتا لہولہان ہوئی تو تیرے لئے
میں منتظر ہوں جب تو پکار کے کہے اے رب جلیل
یہ لہو لہو گل و گلاب کس ماں کا ہے
میں فخر سے کہوں الٰہی! میں ہوں ام الشہید
تیری راہ میں کٹنے والا لخت جگر میرا ہے
یہ خوشبودار خون جو بہہ رہا ہے میرا ہے

جب عمران کی شہادت ہوئی تو دکان والے عبدالحمید نے بتایا کہ عمران کو جب باتوں میں پتہ چلا کہ میں قرآن پاک نہیں پڑھا ہوا تو اس نے مجھے قرآن پڑھانا شروع کر دیا۔ وہ سودا بیچتا رہتا اور میں ایک طرف بیٹھ کر سبق یاد کرتا رہتا تھا۔ بعد میں گھر والوں پر یہ عقدہ کھلا کہ عمران کے دکاندار سے تعلقات کا مقصد کیا تھا۔

عمران عبدالمجید بٹ شہیدؒ کا [آخری] پیغام

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ:

محترم والدین! امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ میں بھی یہاں خیریت سے ہوں۔ میں ان شاء اللہ آج اپنے فرض کی ادائیگی کے لئے مقبوضہ کشمیر جارہا ہوں۔ مجھے کشمیر میں بسنے والے مسلمان بہن بھائیوں کی آہیں اور سسکیاں بلا رہی ہیں۔ آج کافر نے ہمیں للکارا ہے اور ہم نے کافر کی للکار کا منہ توڑ جواب دینا ہے، آج کافر ہمیں ذلیل کر کے ہماری غیرت کا امتحان لے رہا ہے، مسجدوں کو گرا رہا ہے، میں اس بات کو برداشت نہیں کر سکتا کہ کافر ہماری ماؤں بہنوں کی عزت سے کھیلے اور ہم چپ کر کے تماشہ دیکھتے رہیں۔ میں اپنے غصے کی پیاس دشمن کی شہ رگ کاٹ کر بجھانا چاہتا

ہوں۔ یہاں تک کہ میرا رب میرا سینہ ٹھنڈا کر دے اور اسلام کو غالب کر دے۔ زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جو موت میدان میں آئے اس کا مقابلہ کسی اور جگہ آنے والی موت نہیں کر سکتی۔

امی جان اور ابو جان! میرے جانے کے بعد گھر اسلامی ماحول کے مطابق چلائیں اور پردے کا خاص اہتمام کریں، بہنوں کو پردے، محرم اور غیر محرم کی پہچان کرائیں۔ اس کے علاوہ وہ خاندان کے دوسرے افراد کو بھی اسلامی اقدار کی پہچان کروائیں اور جہاد کی طرف راغب کریں۔ رشتہ داروں سے اور خاندان والوں سے اچھے تعلقات پیدا کریں اور ہر قسم کی رنجش ختم کر دیں۔ اللہ نے زندگی دی تو پھر ملیں گے۔ میں نے کسی کا کوئی قرض نہیں دینا۔ تمام گھر والوں اور خاندان والوں کو السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ۔

مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کر دیں۔

آپ کا بیٹا

عمران عبدالمجید

❁

یہ کتاب واضح طور پر پراپیگنڈا کے زمرے سے تعلق رکھتی ہے، چنانچہ اس میں دنیا کا ایک بند، انتہائی محدود تصور پیش کیا گیا ہے۔ یہ پڑھنے والوں کی نظروں سے دانستہ طور پر بے شمار چیزوں کو اوجھل رکھتی ہے جو نہ صرف پاکستان کے لوگوں کے تجربات میں شامل ہیں بلکہ جنوبی ایشیا اور دنیا بھر کے کروڑوں مسلمانوں کی مذہبی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کا فوکس نہایت تنگ ہے۔ اس کا ہدف اس بات پر اصرار کرنا ہے کہ جہاد اس زمین پر اسلام کا، خاص طور پر پاکستان کے مسلمانوں کا اعلیٰ ترین مقصد ہے۔ اس کتاب کے صفحات میں ان لاتعداد خرابیوں کی جانب کوئی اشارہ نہیں ملتا جن سے تمام پاکستانیوں کو اپنی روزگار کی جگہوں، اسکولوں، ہسپتالوں اور شہری محلوں میں سابقہ پڑتا ہے۔ پاکستان سے اس کتاب کا سروکار محض اتنا ہے کہ یہ وہ جغرافیائی علاقہ ہے جہاں سے لشکر کو اپنے مجاہدین بھرتی

Scanned with CamScanner

کرنے ہیں۔

کشمیر — بلکہ ''وادیٔ کشمیر'' — سے بھی اس کا سروکار اس سے زیادہ نہیں۔ کتاب میں کشمیری عوام کا ایسا کوئی ادراک نہیں پایا جاتا کہ وہ کس طرح دو قومی ریاستوں میں بٹے ہوئے مفلس اور محصور انسانوں کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس میں کشمیریوں کا ذکر محض یہ الزام عائد کرنے اور اس کی مذمت کرنے کے مقصد سے آتا ہے کہ کشمیری ماؤں اور بہنوں کو وادی پر قابض ہندو فوجی ریپ کرنے میں مصروف ہیں۔ اس کے علاوہ اور کون سے دکھ اور زخم ہو سکتے ہیں جو ممکنہ طور پر کشمیریوں کو لاحق ہیں، یہ موضوع یہاں بحث سے قطعی طور پر خارج رکھا جاتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس موضوع پر بات کرنے کے لیے پاکستانی کشمیر کو بھی زیرِ بحث لانا ضروری ہوگا۔ جبکہ یہ وہ علاقہ ہے جہاں لشکر کے کیمپ قائم ہیں اور جہاں وہ مقامی حکام کے ساتھ بلا کسی عذر کے تعاون کی پالیسی پر کاربند ہے۔ کتاب میں اس بات کا کوئی سراغ نہیں ملتا کہ آیا لشکر کسی بھی طرح ایک آزاد کشمیری ریاست کی حمایت کرتا ہے۔

ہندوستانی کشمیر میں ریپ اور عورتوں کے خلاف تشدد کی دوسری صورتوں کے مبینہ اور رپورٹ کیے گئے واقعات کو جھٹلانا ہرگز مقصود نہیں، لیکن میں اس بات کی نشان دہی ضرور کرنا چاہتا ہوں کہ کافروں کے ہاتھوں مسلمان عورتوں کے ساتھ جنسی زیادتیوں پر جہادی تشویش اپنی ایک تاریخ بھی رکھتی ہے۔ جنوبی ایشیا میں جہادی لٹریچر کا یہ لازمی عنصر ہے جس کا ذکر محمد بن قاسم کے سندھ پر حملے (آٹھویں صدی) سے لے کر افغانستان کی سرحد پر سکھوں کے خلاف سید احمد بریلوی کے جہاد (انیسویں صدی) تک برابر ملتا ہے۔ اگرچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ سید احمد کی تحریک میں ان مسلمان عورتوں کے فائدے کے لیے بھی چند اقدامات کیے گئے جو سکھوں کے تسلط سے باہر تھیں — مثلاً اس میں بیواؤں کی دوسری شادی کے حق پر زور دیا گیا، جو اُس دور کی قدامت پرستی کو دیکھتے ہوئے ایک بڑا قدم تھا — تاہم لشکر اس قسم کا کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا۔ بیواؤں کی شادی کی حوصلہ افزائی ضرور کی جاتی ہے لیکن صرف مرنے والے کے قریبی رشتہ داروں میں یا لشکر کے کارکنوں کے ساتھ۔ ''شہیدوں'' کی بیواؤں کی ہرگز حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی کہ وہ اپنے طور پر اپنی زندگی کی تعمیر کر سکیں۔ بلکہ کئی ''شہیدوں'' نے اپنے والدین سے صاف لفظوں میں یہ مطالبہ کیا ہے کہ وہ گھر کی لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم

Scanned with CamScanner

دلانے سے احتراز کریں اور اس کے بجائے انھیں جلد از جلد کسی اچھے ''جہادی'' گھرانے میں بیاہ دیں۔ یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ لشکر یا کسی اور انتہا پسند اسلامی گروہ نے مسلمان عورتوں کے خلاف مسلمان مردوں کے تشدد کے ان بے تحاشا واقعات کے بارے کبھی کسی قسم کی تشویش ظاہر نہیں کی جو پاکستان میں غیرت کے نام پر قتل، تیزاب سے جلانے اور کاروکاری کی وارداتوں کی صورت میں سامنے آتے رہتے ہیں، گھروں میں عورتوں پر ہونے والے روزمرہ کے تشدد کی تو بات ہی جانے دیجیے۔

اس تاریخ کو دیکھتے ہوئے، لشکر کی جانب سے ماؤں کی یہ ستائش کسی قدر تعجب خیز معلوم ہوتی ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے باپوں کے بارے میں ایسی کوئی کتاب مرتب نہیں کی گئی۔ درحقیقت، ان میں سے بہت سی کہانیاں ایسی ہیں جن میں باپ منظر سے بالکل غائب ہیں۔ اکثر وہ جسمانی طور پر بھی غیر موجود ہیں، کہیں مشرق وسطیٰ میں محنت مزدوری کر کے اپنے گھر والوں کے لیے فقط مالی وسائل مہیا کرنے میں مصروف۔ باپ کی عدم موجودگی بھی غالباً مجاہدین کی بھرتی کے سلسلے میں لشکر کی کوششوں میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ بیٹوں کو گھر پر نسوانی حاکمیت کے خلاف تھوڑی سی بغاوت کرنے کا موقع ملتا ہے، یا وہ منظر سے غائب باپ کا متبادل لشکر کے کمانڈو میں تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، یا یہ دونوں باتیں پیش آتی ہیں۔ لیکن جنوبی ایشیا میں ایسے خاندانوں کی صورت حال کا نتیجہ بیٹوں اور ان کی ماؤں کے درمیان جذباتی انحصار کے ایک طاقتور جذبے کی صورت میں بھی سامنے آتا ہے۔ یہ بات لشکر کے رہنماؤں کی نظر سے اوجھل نہیں ہے۔ وہ یقینی طور پر جانتے ہیں کہ دور دراز مقامات پر اپنے مقصد حاصل کرنے کے لیے ان کا پنجاب اور سندھ کی ماؤں کی حمایت حاصل کرنا لازمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاد کا دعویٰ تقریباً مکمل طور پر کشمیری ماؤں اور بیٹیوں کی خاطر کیا جاتا ہے۔ اور اس مریضانہ کوشش کی بھی یہی وجہ ہے کہ اپنے بیٹوں سے محروم ہو جانے والی ماؤں کو ''عزت'' دیتے ہوئے یہ دکھایا جائے کہ وہ اپنے بیٹوں کو لشکر کے خون آلود مقصد کے لیے قربان کرنے پر نہایت شوق سے آمادہ ہیں۔ یہ کتاب عورتوں کے بارے میں ہے اور اسے مرتب اور تحریر کرنے والی بھی ایک عورت ہے، لیکن اس کی زبان اور اس میں مضمر اقدار اسلام کے اسی انتہائی متشدد مردانہ پن میں مبتلا تصور سے تعلق رکھتی ہیں جو جنوبی ایشیا کے ان ہلاکت خیز/فرقہ وارانہ گروہوں کا خاصہ ہے۔

Scanned with CamScanner

اگرچہ لشکر اپنے دعوے کے مطابق اپنے غیظ وغضب کا نشانہ صرف ان ہندوستانی سکیورٹی فورسز کو قرار دیتا ہے جو کشمیر کی وادی میں تعینات ہیں، لیکن بہ حیثیت مجموعی ہندوستان سے — جس کا ذکر اردو میں بھی یا تو ''انڈیا'' کے نام سے کیا جاتا ہے یا ''بھارت'' کے نام سے؛ ہندوستان کے نام سے تقریباً بالکل نہیں — ان کی نفرت کئی طرح ظاہر ہوتی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اپنی تربیت کے ایک حصے کے طور پر ''شہیدوں'' کو ایک خاص حدیث کے موضوع پر لیکچر دیے جاتے ہیں جس کا ذکر ان میں سے بہت سوں نے اپنے ''آخری پیغام'' میں بھی کیا ہے۔ مبینہ طور پر اس حدیث میں کہا گیا ہے: ''میری امت کے دو گروہ جہنم سے آزاد کر دیے گئے ہیں۔ ایک وہ جو ہندوستان سے جہاد کرے گا، دوسرا جو عیسیٰ ابن مریم سے مل کر دجال سے لڑے گا۔'' (البتہ اس مبینہ حدیث کو نقل کرتے ہوے ''ہندوستان'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ غالباً لشکر کے ایڈیٹر کو بھی یہ احساس ہو گیا کہ یہاں ''بھارت'' یا ''انڈیا'' کا لفظ کچھ زیادہ ہی نامناسب معلوم ہوگا۔) لشکر اس بات پر عقیدہ رکھتا ہے اور اسی کی تعلیم دیتا ہے کہ وہ اس حدیث میں بیان کردہ پہلا گروہ ہے۔ اسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ حدیث اتنی ہی متنازع اور مشکوک ہے جتنی یہ حدیث کہ ''مجھے ہندوستان کی سمت سے روح پرور ہوا آتی محسوس ہوتی ہے''، یا یہ حدیث کہ ''میں نے اپنے رب کو گھونگھریالے بالوں والے ایک حسین نوجوان کے روپ میں دیکھا ہے۔'' سچی دینداری کے حامل افراد حدیث کی کتابوں سے ہمیشہ رجوع کرتے رہے ہیں، لیکن اخلاقی رہنمائی حاصل کرنے کے لیے، نہ کہ دوامی لشکر کشی کا جواز ڈھونڈنے کی غرض سے۔ کتاب کی پشت پر لشکر کی چند اور مطبوعات کا اشتہار دیا گیا ہے جن میں سے ایک کا عنوان غزوۂ ہند ہے۔ غالباً اس کی بنیاد اسی مذکورہ بالا حدیث پر ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اس میں جہاد نہیں بلکہ ''غزوہ'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ مسلمان لکھنے والے غزوہ کا لفظ عموماً ان جنگوں کے لیے استعمال کرتے ہیں جن میں پیغمبر اسلام نے خود حصہ لیا، اور اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ یہ جنگیں ''دفاعی'' نوعیت کی تھیں۔ یہاں اس لفظ کا استعمال بظاہر لشکر کے اس اعلان کردہ موقف کو تقویت دینے کے لیے معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر میں اس کی کارروائیاں دفاعی نوعیت کی ہیں، لیکن اس سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس کے عزائم محض وہ [illegible] میر تک محدود نہیں

ہیں۔

تاہم لشکر کی ہندوستان سے اس شدید نفرت کا دوسرا رخ بھی موجود ہے، جیسا کہ اس قسم کی مریضانہ تنگ نظری کی مثالوں میں اکثر دیکھنے کو ملتا ہے۔ ہندوستانی—یا بلکہ ہندو— لشکر کی نگاہوں میں بربریت کے بدترین نمونے ہی سہی، لیکن اس کے باوجود ان میں غیر معمولی شجاعت کو سراہنے کی صلاحیت ضرور پائی جاتی ہے۔ چنانچہ ہمیں دو تین مقامات پر پڑھنے کو ملتا ہے کہ کس طرح کسی بھارتی فوجی افسر نے ''شہید'' کے لیے اپنے احترام کا اظہار کیا۔ ان میں سے ایک مقام پر، جس کا بیان خاصے لرزہ خیز انداز میں کیا گیا ہے، ایک ہندوستانی کرنل اپنے آدمیوں کو حکم دیتا ہے کہ ''شہید'' کی لاش کو اٹھا کر کھڑا کریں تاکہ وہ اسے خراج عقیدت کے طور پر سلیوٹ کر سکے۔

❁

جب میں نے اس کتاب کو پہلی بار دیکھا تو اس کے خون آلود سرورق اور عنوان میں ماؤں کے ذکر کے علاوہ جس بات نے میرے تجسس کو تحریک دی وہ اس کی مصنفہ کا نام تھا: ام حماد۔ انتہا پسند مسلمان تنظیموں کی شائع کردہ پروپیگنڈا پر مبنی کتابوں پر مصنف کے طور پر کسی عورت کا نام شاذ و نادر ہی دکھائی دیتا ہے۔ بلکہ جہاں تک میری محدود معلومات کا تعلق ہے، یہ مشتبہ اعزاز صرف مریم جمیلہ کے حصے میں آیا ہے۔ لیکن وہ ایک امریکی تھیں جو یہودی سے مسلمان ہوئی تھیں اور جماعت اسلامی پاکستان کی رکن کے طور پر انگریزی میں لکھتی تھیں۔ ہندوستان یا پاکستان میں، اردو یا انگریزی میں کسی مقامی عورت کا نام اس سلسلے میں آسانی سے ذہن میں نہیں آتا۔

عربی انداز کے اس نام —ام حماد— نے مجھے ایک اور زمانے کی یاد دلا دی جب اس قسم کے نام جنوبی ایشیا کی مسلمان عورتوں کی ایک سماجی پیش رفت کی جانب اشارہ کرتے تھے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں، جب مسلمان عورتیں سنجیدگی سے اردو میں لکھنے کی طرف متوجہ ہوئیں، تب ان میں اس قسم کے قلمی نام اختیار کرنا عام تھا۔ وہ نئے راستے پر چلنے والی عورتیں تھیں؛ انھوں نے ایک پورے معاشرے کو، بلکہ پوری دنیا کو، اپنی ان کم نصیب بہنوں کے سامنے کھول کر رکھ دیا جو پردہ نشین ہونے کے باعث اسے دیکھنے سے محروم تھیں۔ اب اس قسم کا نام اختیار کرنے والی ایک ایسی عورت کا ظہور ہوا

ہے جس کا مقصد اس کے قطعی برعکس ہے۔ 'بنت نذر الباقر' نے ایک ایسی بیٹی کی پرورش کی جس نے اپنے اصل نام 'قرۃ العین حیدر' سے شہرت اور عزت حاصل کی، لیکن زیرِ نظر کتاب سے ایسا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ ان ''شہیدوں'' میں سے کسی کی ماں یا بہن کے لیے، کسی بھی نام سے، اپنی کسی قسم کی آزادانہ زندگی حاصل کرنے کا کوئی امکان ہو سکتا ہے۔

''شہیدوں'' کی ماؤں اور بہنوں کی دنیا کا، جیسا کہ کتاب میں بار بار اعلان کیا گیا ہے، ان حدود میں رہنا ضروری ہے جو لشکر کے نظریہ سازوں نے متعین کر رکھی ہیں، جن کی رو سے ریاست پاکستان کو یا خود پاکستانیوں کے بسر کردہ اسلام کو ان معاملات میں کچھ کہنے کی قطعی اجازت نہیں۔

لشکر کے قائدین ناموں کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ ہر مجاہد یا ممکنہ ''شہید'' کو بھرتی کے وقت ایک نیا نام دیا جاتا ہے۔ کیا یہ محض ایک بے معنی شوق ہے؟ یا اس کا مقصد نئے بھرتی ہونے والے شخص کے موجودہ خاندانی رشتوں کو کمزور کرنا اور اسے ایک نئے، پاکیزہ اور منتخب، خاندان کا حصہ بنانا ہے؟ جو بھی ہو، یہ نیا نام یا کنیت ہمیشہ خالص عربی زبان میں ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ لشکر کے نزدیک عربی ہی واحد اسلامی زبان ہونے کی حقدار ہے۔ مزید یہ کہ نیا نام اپنے رجحان کے اعتبار سے تقریباً ہمیشہ متشدد مردانہ پن کے تصور کا حامل ہوتا ہے۔ کتاب میں خواہ ''شہیدوں'' کی ماؤں کے عزم اور حوصلے کو سراہا گیا ہو، لیکن اپنے مجاہدوں کے لیے لشکر جن ناموں کا انتخاب کرتا ہے ان میں کسی عورت کا کوئی حوالہ نہیں ہوتا؛ وہ ''شہید'' کا ذکر ہمیشہ ''ابوفلاں'' جیسے کسی نام سے کرتے ہیں، جس میں ''فلاں'' کوئی مردانہ نام ہوتا ہے، عموماً قدیم عرب کے کسی مشہور مسلمان جنگجو کا نام۔ ابو کے سابقے کے ساتھ کسی ایسے بچے کا نام شاذونادر ہی سامنے آتا ہے جو واقعی ''شہید'' کی اولاد ہو۔ غالباً نیا نام دینے کا بڑا مقصد اصل شناخت کو چھپانا نہیں بلکہ حال کو ماضی سے مربوط کرنا ہوتا ہے۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ یہ نیا عربی نام عربی کے اتنے ہی عام رواج کے مطابق ''ابن فلاں'' کے نمونے پر ہرگز نہیں ہوتا، کیونکہ اس سے بھرتی ہونے والے کے ذہن میں اپنے باپ کے ساتھ خاندانی رشتے کے باقی رہنے کی گنجائش ہو سکتی تھی۔ لشکر کا مقصد اس قسم کے ہر رشتے کو تلف کر کے صرف لشکر کے ساتھ اس کے تعلق کو باقی رہنے دینا ہے۔

عرب اور عربی زبان سے اندھادھند وابستگی بعض اوقات قابلِ رحم نتائج بھی پیدا کرتی ہے،

Scanned with CamScanner

جیسا کہ محمد عمر نامی ایک ذہین لڑکے کے معاملے میں ہوا۔ عمر کا تعلق ایک خوشحال گھرانے سے تھا؛ اس کا باپ ایک اسکول کا پرنسپل تھا۔ عمر نے بچپن میں خاصی تخلیقی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ مصوری کرتا اور کھلونے بناتا تھا، پودوں اور پھولوں سے دلچسپی لیتا، اور اس کی آواز بہت دلکش تھی جسے وہ اذان دینے اور جہادی نغمے گانے کے لیے استعمال کرتا تھا۔ میٹرک کے فوراً بعد عمر تین ہفتوں کی ابتدائی تربیت کے لیے چلا گیا اور اس کے بعد تین مہینے کے چھاپہ مار جنگ کے کورس پر۔ بھرتی کے وقت عمر کو ایک نیا نام دیا گیا: ''ابوقعقاع''۔ گھر والوں کو ملنے والا اس کا آخری خط اس کی ماں کے نام تھا جس میں اپنے نئے نام کے بارے میں اس نے لکھا تھا:

''آپ نے کنیت کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کی سمجھ نہیں آئی۔ وہ میرے استاد نے رکھی ہے۔ تو آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ابوقعقاع بہت نامور صحابی رسول تھے اور بہت بڑے پہلوان تھے۔ نبی نے ان کو ستر ہزار کافروں کے مقابلے میں بھیجا اور ایک اور روایت میں آتا ہے کہ انہوں نے گھوڑے کی دم پکڑ کر اس کو دبا دیا تھا۔ میں نے بہت کوشش کی ہے مگر لڑکے مجھے اسی نام سے پکارتے ہیں اور استادوں کو بھی کہا کہ میں نے کنیت بدلنی ہے تو واقعات سنانے شروع کر دیتے ہیں۔ میں پھر زور دے رہا ہوں کہ خط زیادہ سے زیادہ لکھا کریں مجھے بڑی تسلی ہوتی ہے۔ اب میں اجازت چاہتا ہوں کیونکہ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا۔ سب بہن بھائیوں اور تمام رشتہ داروں کو سلام۔ والسلام علیکم، محمد عمر ابوقعقاع۔''

یہ خط پڑھ کر مجھے اپنے بچپن کے دن یاد آ گئے جب ''عرقِ نعناع''، جو عربی زبان میں کشید کیے ہوئے سرکے کو کہتے ہیں، بڑے مذاق کی چیز تھا۔ ہم اسے اکثر اپنے ہتھے چڑھ جانے والے کسی بے چارے لڑکے کی املا کی مہارت کی آزمائش کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ میں بے چارے عمر کی کیفیت کا تصور کر سکتا ہوں جو اسے ''ابوقعقاع'' کے نام سے پکارے جانے پر محسوس ہوتی ہوگی۔ عمر اپنی فوجی ٹریننگ کے دوران ایک پہاڑی ڈھلان سے پھسل کر زخمی ہو گیا اور کچھ دن بعد چل بسا۔ تب اس کی عمر محض سترہ برس تھی۔

عمر کے لیے آدمی کا دل اس وقت اور بھی دکھتا ہے جب یہ انکشاف ہوتا ہے کہ لشکر کے

Scanned with CamScanner

پروپیگنڈا والوں نے اس کی کہانی کو، کتاب کی آخری جلد میں، ایک بار پھر استعمال کیا، اور اس کے دلدوز آخری الفاظ میں اپنے مکروہ مقصد کے لیے تحریف کر ڈالی:

میری کنیت کے بارے میں آپ نے پوچھا ہے تو اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ابوقعقاع بہت نامور صحابی اور بہت بڑے پہلوان تھے۔ نبی کریم نے ان کو ستر ہزار کافروں کے مقابلے میں بھیجا۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ انہوں نے گھوڑے کو دم سے پکڑ کر روک لیا تھا۔ مجھے خط ضرور لکھتی رہیں، یہاں خط کی بہت اہمیت ہے، میرے لیے بہت دعا کیا کریں۔ والسلام آپ کا بیٹا محمد عمر ابوقعقاع

❁

اس کتاب کا ایک اور مریضانہ پہلو اس کے صفحات میں شاعری کی بے پناہ افراط ہے۔ ام حماد خود بھی بظاہر ایک بسیار گو شاعرہ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظمیں متواتر لشکر کے مجلے میں شائع ہوتی رہتی ہیں اور کتاب کی صورت میں بھی یکجا کی جا چکی ہیں۔ ہمیں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ ان کی بہت سی منظومات لشکر کے کارکنوں میں بہت مقبول ہیں، وہ انھیں زبانی یاد کر لیتے ہیں اور گاتے رہتے ہیں۔ (دراصل ایسی ایک ویب سائٹ کا بھی وجود ہے جہاں ان نغمات کو سنا جا سکتا ہے، لیکن میں اس کا پتا نہیں بتاؤں گا۔) کتاب میں ہر جگہ ام حماد نے اپنے بیانات کو اپنے ہی اشعار سے مزین کیا ہے، اور کبھی کبھی تو ''شہید'' کی تعریف میں پوری پوری نظمیں نقل کی ہیں۔ کئی ''شہیدوں'' کے احوال میں ایسے اشعار اور مختصر نظمیں بھی ملتی ہیں جو مرنے والے کی کسی خاتون رشتے دار کی لکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ اگرچہ ام حماد کی اپنی شاعری کا معیار نہایت نا قابل رشک ہے، پھر بھی وہ صدمے کی شکار ایک ماں کے دل سے نکلے ہوئے بعض پنجابی مصرعوں کو ناقص قرار دینے سے نہیں ہچکچاتیں۔ خود ان کی اپنی شاعری بدترین قسم کی نعرے بازی سے بڑھ کر کچھ نہیں، اور اس اعتبار سے ان کی نثر — اور کتاب کے گمنام مرد شریک مصنفوں کی نثر — سے زیادہ مختلف نہیں، جو پلک جھپکتے میں تمام ہندوؤں، یہودیوں اور عیسائیوں کے لیے بدترین نوعیت کی بیہودہ گفتاری میں اتنی ہی آسانی سے ڈھل جاتی ہے جس آسانی سے خود اپنے گروہ کے ارکان کے لیے غلو آمیز اور مضحکہ خیز تحسین و ستائش میں۔ یہ کہنا غیر ضروری ہے

کہ شاعری بطور ایک ایسے منطقے کے جہاں تخیل حکمرانی کرتا ہے اور ابہام اور قول محال اپنا بھرپور کھیل دکھاتے ہیں، لشکر والوں کے مطلب کی شے نہیں۔ میر تقی میر کے اس یادگار شعر کا دھیما طنزیہ لہجہ لشکریوں پر قطعی بے اثر رہے گا:

اے آہوانِ کعبہ، نہ اینڈو حرم کے گرد
کھاؤ کسی کا تیر، کسی کے شکار ہو

❁

لشکریوں کی سماجی مراتب اور اشرافیہ سے مرعوب ہونے کی ذہنیت اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ انھیں پست مالی حیثیت رکھنے والے ''شہیدوں'' کے پسماندگان کے خراب حالات پر کوئی تشویش نہیں ہوتی جبکہ دوسری طرف بعض دوسرے ''شہیدوں'' کی نسبتاً خوشحالی یا اعلیٰ پیشہ ورانہ یا تعلیمی سطح کا خوب بڑھ چڑھ کر ذکر کیا جاتا ہے۔ جزوی طور پر اس کی وجہ اس الزام کا رد کرنے کی بے تابی ہو سکتی ہے کہ لشکری جہادی پروپیگنڈے کے زور پر مفلس اور ان پڑھ لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے اس کی بنیادی وجہ اقتصادی اور معاشرتی نظام کی تبدیلی کے شعور سے ان کی محرومی ہے۔ لشکر کی خیراتی سرگرمیاں — اسکولوں اور شفاخانوں کا اہتمام — اسے اس بات پر آمادہ نہیں کرتیں کہ وہ جمہوریت اور مساوات کی قدروں سے وابستگی پیدا کرے۔ اس کے نزدیک حاکمیت عام لوگوں کے لیے نہیں بلکہ خاص افراد کے ایک چھوٹے سے گروہ کے لیے مخصوص ہے۔

صرف ایک ''شہید'' کی کہانی ایسی ہے جس میں اس کی ماں نے اپنے غصے اور مزاحمت کا اظہار کیا ہے، اور اس کہانی سے یہ بھی عیاں ہو جاتا ہے کہ لشکری موقع پڑنے پر کس قدر چالاکی سے کام لے سکتے ہیں۔ ام حماد محمد اشرف نامی ایک ''شہید'' کے گھر والوں سے ملاقات کے لیے پہنچتی ہیں، جس کا ذکر راویہ کے اپنے لفظوں میں یوں آتا ہے: ''مجاہدانہ شان کے ساتھ ساتھ ان میں جو انفرادی خوبی تھی وہ ساتھیوں کی خدمت گزاری تھی۔ وہ زیادہ تر کھانے کے شعبے سے وابستہ رہے۔ اپنے مجاہد ساتھیوں کے لیے کھانا تیار کرتے، ان کے روزے کا بندوبست کرتے اور خوب خدمت بجا لاتے۔''
ام حماد نے ان کے گھر کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

Scanned with CamScanner

ملتان شہر کی چھوٹی سی گلی میں ایک تنگ وتاریک کوٹھڑی نما کمرے اور تاریک چھت والے آنگن میں جس کو کچن باتھ روم اور دیگر تمام کاموں کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے ابوعبدالمصور کی بیمار والدہ اور چھوٹی بہن کمزور بوڑھے والد اور ایک چھوٹا بھائی رہتے ہیں۔ایک بڑا بھائی سعودیہ میں ملازمت کرتا ہے۔ جب کہ ایک ہمشیرہ شادی شدہ ہیں۔ چھوٹی بہن مقامی اسکول میں پڑھاتی ہیں۔

ام حماد نے:

جب اس گھر میں داخل ہو کر والدہ محترمہ سے تعارف کروایا کہ ہمارا تعلق مرکز سے ہے، آپ کا حال احوال پوچھنے آئے ہیں تو وہ آگ بگولہ ہو کر بولیں: ''کس لیے آئے ہیں یہ مرکز والے میرے گھر میں؟ اب کیا لینا ہے مرکز والوں نے مجھ سے؟ میرا شیر جوان بچہ مروادیا۔'' شہید کی بہن کے چہرے پر بھی تلخی پھیل گئی۔ وہ شعلہ بار نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا کہ آپ کو پتہ ہے شہادت کی کتنی سعادت ہے۔ کہنے لگیں، ''چپ رہ تو، نام مت لیجیو شہادت کا میرے سامنے۔ تم مرکز والے اپنے بچے کیوں نہیں بھیجتے شہید ہونے کے لئے؟ ارے تمہیں جنت کی ضرورت نہیں جو ہمیں جنت کا لالچ دینے آجاتے ہو؟'' غرض انہوں نے جی بھر کر صلواتیں سناڈالیں۔ جب خاموش ہوئیں تو میں نے کہا ''بہن جی آپ کو پتہ ہے میں کتنی دور سے آئی ہوں، لاہور سے آئی ہوں آپ کی زیارت کرنے، آپ نے چائے پانی کا بھی نہیں پوچھا، مہمان کے ساتھ ایسا سلوک تو نہیں ہونا چاہئے۔'' وہ ایک دم شرمندہ ہو کر اپنی بیٹی کی طرف دیکھنے لگیں۔ وہ اٹھ کر گئی اور ایک کپ چائے بنا کر ساتھ کچھ مالٹے لے آئی۔

اس کے بعد ام حماد کو دونوں عورتوں کو باتوں سے بہلا پھسلا کر رام کرنے میں کچھ زیادہ دشواری نہیں ہوتی:

میں نے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا کہ آپ ہمارے ساتھ چلیں اور مظفرآباد میں جا کر دیکھیں۔ وہاں مجاہدین ٹریننگ لے کر بارڈر پار کرتے ہیں پھر جہاد کر کے شہید ہوتے ہیں۔ خود میرا اپنا بیٹا بھی گیا ہوا ہے وادی میں۔

Scanned with CamScanner

''شہید'' کے پسماندگان حقیقت حال جاننے کے لیے مظفرآباد نہیں گئے، ملتان ہی میں رہے۔ تاہم لشکر والوں نے ان کی امداد میں کسی قدر اضافہ کر دیا۔

❁

لشکر کا عقیدہ ہے کہ اسلام کے غلبے کے لیے ایک کبھی نہ ختم ہونے والے عالمی جہاد میں شریک ہونا مسلمان کہلانے کے لیے لازمی ہے۔ دوسرے لفظوں میں، لشکر کی انتہاپسندانہ فکر نہ صرف اس تسلیم شدہ قانونی موقف سے منکر ہے کہ جہاد کے اعلان سے پہلے بعض مخصوص شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے، بلکہ اس دیندارانہ موقف سے بھی انکاری ہے کہ سب سے بڑا جہاد اپنے نفس پر قابو پانا ہے۔ اس کے برعکس لشکر کے نظروں میں بنی نوع انسان ''ہم'' اور ''وہ'' کے دو متحارب زمروں میں منقسم ہے۔ خدا کے کلام پر عقیدہ رکھنے کے تمام تر دعووں کے باوجود لشکر کو خدا کی زمین پر پائے جانے والے تنوع اور رنگارنگی میں کوئی مقصد دکھائی نہیں دیتا جسے خود قرآن میں دانستہ اور حکمت پر مبنی قرار دیا گیا ہے۔

جیسا کہ کسی بھی سخت گیر فرقہ وارانہ گروہ کے لیے فطری بات ہے، لشکر کی فکر ظاہری افعال اور شعائر کی ہو بہو پابندی پر بہت زور دیتی ہے۔ (کتاب میں شامل کئی کہانیوں میں یہ ذکر آتا ہے کہ کس طرح کسی شخص کی نماز غلط ہوتی تھی لیکن اب درست طریقے سے پڑھنے لگا، یا شلوار کے پائنچے ٹخنوں سے اوپر رکھنے لگا۔) اس پہلو پر اس قدر مبالغے کے ساتھ زور دینے کے ذریعے دراصل لشکر روایتی اسلام کے ایک بنیادی پہلو کی نفی کرتا ہے جس کی رو سے ہر فعل کا ایک ظاہر اور ایک باطن ہوتا ہے، اور باطن ہمیشہ ظاہر پر فوقیت رکھتا ہے۔ لشکر کی محنتوں کے پھل — یعنی ''شہیدوں'' کے چھوڑے ہوئے آخری پیغامات — پر نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کے نزدیک محض ظاہری فعل ہی اہمیت رکھتا ہے۔ ان آخری پیغامات میں ''شہید'' اپنے پسماندگان پر زور دیتے ہیں کہ وہ نماز ''درست'' طریقے سے ادا کریں، ٹی وی سیٹ اٹھا کر پھینک دیں، داڑھیاں رکھیں اور گھر کی عورتوں سے پردے کی پابندی کروائیں۔ (وہ اپنی ماؤں اور بہنوں سے یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ ترجمے کی مدد سے قرآن پڑھیں، جو ایک عمدہ خیال ہے، لیکن ان کی مراد غالباً ان کے اپنے فرقہ اہل حدیث کے تیار کردہ کسی مخصوص ''درست'' ترجمہ سے ہوگی۔)

Scanned with CamScanner

ان تمام ''آخری پیغامات'' میں ایک عنصر مشترک ہے جو مجھے بہت متاثر کن معلوم ہوا۔ ان میں سے ہر ''شہید'' اپنے ستر اقربا کو بذریعۂ شفاعت جنت میں لے جانے کا وعدہ کرتا ہے۔ جس کی بنیاد ایک حدیث پر ہے جو جہادی لٹریچر میں بہت مقبول ہے۔ بیشتر صورتوں میں یہ وعدہ اس پچھتاوے کے پہلو بہ پہلو سامنے آتا ہے کہ ''شہید'' اپنے خاندانی فرائض اِس دنیا میں پورے کرنے سے قاصر رہا۔ یہ وعدہ انھی کاموں کی تلافی کے طور پر ہے جنھیں انجام دینا نہ صرف اس کی سماجی ذمے داری تھی بلکہ اس کی اپنی خواہش بھی تھی، لیکن جنھیں وہ انجام نہ دے سکا۔ اسی طرح شادی شدہ ''شہید'' اپنی بیویوں کو یقین دلاتے ہیں کہ مرنے کے بعد جب وہ اپنے شوہر سے جا ملیں گی تو انھیں جنت کی حوروں کا سردار مقرر کیا جائے گا۔ ان کا خاندان — جو اِس زمین پر ایسی وجوں سے شکست و ریخت کا شکار ہو رہا ہے جو اس خاندان کے ارکان کی سمجھ سے بالاتر ہیں اور جن پر قابو پانا ان کے بس سے باہر ہے — ان کی ''شہادت'' کی بدولت جنت میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یکجا ہو جائے گا — اس قسم کا وعدہ ہر ''شہید'' اپنے گھر والوں خصوصاً اپنی ماں سے ضرور کرتا ہے۔

ان پیغامات کی ایک آخری بات جس کی میں خاص طور پر نشان دہی کرنا چاہتا ہوں، دل پر اثر کرنے والی اور نہایت ایماندارانہ ہے: ''شہیدوں'' کے خاندانوں کی نظر میں اپنی ''عزت'' کی اہمیت۔ مرنے والے کی مائیں اور بہنیں تواتر سے یہ بات کہتی ہیں — بلکہ بعض کے باپ بھی کہتے ہیں — کہ اپنے بیٹے یا بھائی کے مرنے کے بعد وہ، جنھیں معاشرے میں کوئی عزت حاصل نہ تھی، ''باعزت'' بن گئے۔ ''اب ہر شخص ہماری عزت کرتا ہے۔'' یا یہ کہ بیٹے یا بھائی کی موت نے انھیں ان بدتر حالات سے بچا لیا جو ممکنہ طور پر پیش آ سکتے تھے۔ ''اگر میرا بیٹا زندہ رہتا اور بعد میں ہیروئن کی لت میں مبتلا ہو کر مرتا تو میں کیا کرتی؟'' ایسے بیانات پڑھنے والے کو ان عورتوں اور خاندانوں کے لیے گہرا دکھ محسوس ہوتا ہے۔ انھیں اگر کسی چیز کی خواہش ہے تو محض تھوڑی سی عزت کی، اس کی کہ وہ باوقار طریقے سے زندہ رہ سکیں۔ کتنی المناک بات ہے کہ انھیں یہ عزت تبھی ملتی ہے جب وہ اپنا بیٹا یا بھائی کھو بیٹھتے ہیں۔ کیسی سنگین فردِ جرم ہے یہ اس ریاست اور اس معاشرے کے خلاف جو اس صورت حال کو روا رکھتا ہے۔ دوسری طرف لشکر کے قائدین لوگوں کی اس ضرورت سے واقف ہیں، اور اسے پورا کر کے اپنا مقصد حاصل کرتے ہیں۔ جب کوئی ''مجاہد'' کشمیر میں ''شہید'' ہوتا ہے تو وہ پاکستان میں اس

Scanned with CamScanner

کے گھر پہنچتے ہیں خواہ وہ کسی بھی دور افتادہ مقام پر کیوں نہ ہو، اور ایک اچھی خاصی قابل دید تقریب منعقد کرتے ہیں۔ وردیاں پہنے اور آٹومیٹک اسلحہ اٹھائے ہوئے افراد سے بھری ہوئی جیپیں پہنچتی ہیں؛ مریدکے یا مقامی ہیڈکوارٹر سے بڑے بڑے شہری ناموں والے قائدین قدم رکھتے ہیں، تدفین میں شریک ہونے کے لیے دور دور سے سیکڑوں لوگوں کو لایا جاتا ہے؛ جہاد اور شہادت کے موضوعات پر وعظ کیے جاتے ہیں، اور لشکر کے ممتاز رہنما رسمی طور پر ''شہید'' کے گھر جاتے ہیں۔ بعد میں وہ متاثرہ خاندان کو مستقل مالی اور دیگر امداد بھی فراہم کرتے ہیں۔ تھوڑی سی عزت کی یہ طلب، جس سے ان غم نصیب لوگوں کو نہ صرف جسم و جاں کی یکجائی قائم رکھنے بلکہ وقار سے زندہ رہنے کا موقع مل سکے، اس قابل ہے کہ اس پر توجہ دی جائے، نہ صرف پاکستان میں بلکہ اس کے باہر بھی۔ اس طلب کو پورا کرنا لازمی ہے کیونکہ بغیر ایسا کیے وہ مسائل حل نہیں ہو سکیں گے جو آج ہمیں لاحق ہیں۔ ہمیں کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ اپنے زعم میں ہم بعض لوگوں کو کتنا ہی حقیر کیوں نہ سمجھتے ہوں، ہر انسان یہ چاہتا ہے کہ افلاس اور دشوار حالات کے باوجود وہ دنیا میں وقار سے زندہ رہ سکے۔

❁❁

Scanned with CamScanner

چودھری محمد نعیم

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

حجاب اور میں

'حجاب' میرے لیے نسبتاً نیا لفظ ہے۔ جن دنوں میں بڑا ہو رہا تھا، یہ میرے ذخیرۂ الفاظ میں شامل نہ تھا۔ اس سے میں بہت بعد میں آشنا ہوا، جب میں نے اردو کی مذہبی اور ادبی تحریریں پڑھنی شروع کیں۔ اسی طرح میں تہذیبی معنوں کے حامل کئی اور لفظوں سے بھی واقف ہوا، مثلاً عشق، سیاست، اور تصوف۔ اس کے مترادف جس لفظ سے میں بچپن میں واقف تھا وہ 'پردہ' تھا۔ اور میں نے اس لفظ اور اس کے متعدد معنوں سے، شمالی ہندوستان کے ایک چھوٹے سے شہر بارہ بنکی میں رہنے والے اپنے متوسط طبقے کے خاندان کی عورتوں کے طرزِ عمل کے مشاہدے کے ذریعے واقفیت حاصل کی۔

امی یعنی میری دادی کے لیے پردے کا مطلب تھا کبھی گھر سے باہر قدم نہ نکالنا۔ جن شاذ و نادر موقعوں پر انھیں گھر سے باہر جانے کی ضرورت پیش آتی تب یہ ایک نہایت تفصیلی رسمیاتی عمل ہوتا تھا۔ محلے میں کسی کے گھر جانے کے لیے بھی — مجھے یاد ہے کہ ایسا صرف اس وقت ہوتا جب کوئی سانحہ پیش آیا ہوتا — وہ ڈولی میں سوار ہوتیں۔ یہ ایک اسٹول یا پیڑھی ہوتی تھی جو ایک لمبے بانس کے درمیان میں لٹکی ہوتی اور اس بانس کے دونوں سروں کو دو آدمی کندھوں پر اٹھا کر چلتے تھے۔ وہ اسے لا کر مکان کے پچھلے دروازے کے پاس رکھ دیتے اور خود پیچھے ہٹ کر پردے کی دیوار کی اوٹ میں ہو جاتے۔ امی ایک بڑی سفید چادر اوڑھ کر اس پیڑھی پر اکڑوں بیٹھ جاتیں اور خاص اسی مقصد سے تیار کیا ہوا ایک بھاری غلاف امی اور ان کی ڈولی پر ڈال دیا جاتا۔ تب دونوں کہار واپس آ جاتے اور

Scanned with CamScanner

ڈولی کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر روانہ ہو جاتے۔

جب کبھی امی اپنے بیٹے یعنی میرے والد کی موٹر میں سوار ہوتیں تو خود کو اسی طرح چادر میں لپیٹ لیتیں، اور گاڑی کے پچھلے حصے کو کھڑکیوں پر کپڑے ڈال کر مکمل طور پر پوشیدہ کر دیا جاتا۔ اس سے برسوں پہلے وہ اپنی بیٹی اور داماد کے ساتھ حج کرنے مکہ جا چکی تھیں۔ مجھے نہیں معلوم اس سفر کے دوران انھوں نے خود کو کس طرح ڈھانپا ہوگا، لیکن اُس متبرک شہر میں ان کا طرزِ عمل بلاشبہ وہی رہا ہوگا جس کی عورتوں کو ہدایت کی گئی ہے: یعنی مردوں کے ساتھ حج کی رکمیں یا ارکان اس طرح ادا کرنا کہ ان کا بدن اور بال ڈھکے رہیں اور چہرہ پورا کھلا ہوا ہو۔ انھوں نے مکہ میں وہی کیا جو ان کے مذہب اسلام کا ان سے مطالبہ تھا، جبکہ بارہ بنکی میں وہ وہی کرتی تھیں جو ان کی ثقافت کا، یعنی اودھ کے شرفا کی تہذیب کا، تقاضا تھا۔

آپا یعنی میری والدہ ان سے اگلی نسل کی تھیں۔ وہ برقع اوڑھتی تھیں۔ ان کا برقع جدید وضع کا تھا، یعنی اس کے دو حصے تھے، جبکہ پرانی چال کا برقع، جسے میری بہنیں مذاق سے 'شٹل کاک' کہا کرتی تھیں، اوپر سے نیچے تک ایک ہوتا تھا اور خاندان کی زیادہ عمر کی یا پرانے خیال کی عورتوں کو مرغوب تھا۔ مجھے یاد ہے کہ عمر رسیدہ عورتوں کے برقعے عموماً سفید ہوتے تھے جبکہ نئی وضع کے برقعے ہمیشہ سیاہ ہوتے تھے۔

آپا کا برقع ایک اسکرٹ نما نچلے حصے اور اوپر سر سے لے کر رانوں تک اوڑھے جانے والے بالائی حصے پر مشتمل تھا۔ دو حصے ہونے کی وجہ سے اسے پہن کر چلتے ہوئے ٹانگوں اور بازوؤں کو زیادہ آسانی سے حرکت دی جا سکتی تھی۔ بالائی حصے میں ایک نقاب لگی ہوتی تھی جسے چہرے پر ڈال لیا جاتا تھا جسے آپا جب عورتوں کے پاس ہوتیں، مثلاً ٹرین کے زنانہ ڈبے میں، الٹ کر پیچھے ڈال لیتی تھیں، یا خریداری کرتے ہوئے کسی چیز کو غور سے دیکھنے کے لیے ذرا سا ایک طرف ہٹا لیتی تھیں۔ آپا نے ساری عمر برقع اوڑھا، سوائے اس موقعے کے جب وہ حج کرنے مکہ گئیں۔ وہاں انھوں نے احرام کی ویسی ہی چادریں پہنیں جیسی ان سے پہلے امی نے پہنی تھیں۔ حج کرنے والی اُس زمانے کی اور آج کل کی تمام عورتوں کی طرح انھوں نے اپنے بال ضرور ڈھانپے لیکن چہرہ سب کے سامنے کھلا رکھا۔

میری بڑی بہنوں نے لکھنؤ میں اسکول میں داخلہ لیا اور وہاں ہوسٹل میں رہیں۔ جب وہ بارہ

بنکی آتیں تو آپا کی طرح کا برقع اوڑھتیں۔ لکھنؤ میں بھی وہ غالباً اسکول کی دوسری لڑکیوں کے ساتھ، بلاشبہ ایک یا دو استانیوں کی نگرانی میں، کہیں باہر جاتے ہوئے وہی برقع اوڑھتی ہوں گی۔ بڑی بہن نے شادی کے بعد برقع اوڑھنا ترک کر دیا، لیکن ابا کی زندگی میں جب بھی بارہ بنکی آتیں تو ہمیشہ برقع اوڑھ کر آتیں۔ باہر وہ اپنے شوہر کی بیوی ہوتی تھیں لیکن بارہ بنکی میں وہ وہی طرز عمل اختیار کرتیں جو وہاں کے ایک خاص خاندان کی بیٹی کے لیے مناسب تھا۔

البتہ ہمارے رشتہ داروں میں آپا کی کئی رشتے کی بہنیں ایسی تھیں جنھوں نے برقع کبھی نہ اوڑھا، اور ان میں سے دو نے، جب وہ کانونٹ اسکول میں گئیں تو مغربی لباس بھی پہنا۔ اُس زمانے میں بھی بارہ بنکی جیسے قصبے میں ایسے خاندان موجود تھے جن میں نوجوان لڑکیوں نے کبھی برقع نہیں اوڑھا، اور جب وہ محلے میں کسی جگہ جانے کے لیے نکلتیں تو چادر سے خود کو بے پروائی سے ڈھانپ لیتیں؛ دوسرے موقعوں پر ان کا طرز عمل میری بہنوں کا سا ہوتا۔

مجھے یہ یاد دلانا نہ بھولنا چاہیے کہ اُس دور میں — میں 1940 کے عشرے کی بات کر رہا ہوں — اس خاص طبقے کی ہندو عورتوں، خصوصاً شادی شدہ عورتوں کے لیے بھی یہ بات معیوب سمجھی جاتی تھی کہ وہ گھر سے باہر ایسی حالت میں نکلیں کہ ان کے بال اور چہرہ کھلا ہوا ہو۔ ظاہر ہے وہ برقع تو نہیں اوڑھتی تھیں — یہ صرف مسلمانوں تک محدود تھا۔ اس کے بجائے وہ اوڑھنی، سفید چادر یا ساری کے پلو سے بدن کے وہ حصے ڈھانپ لیتیں جو غیروں کے دیکھنے کے لیے نہ تھے۔ وہ بھی ایسے مکانوں میں رہتی تھیں جن میں زنانہ اور مردانہ حصے الگ الگ ہوتے تھے۔ مسلمان لڑکیوں کی طرح ان کی بیٹیاں بھی روز اسکول جاتے ہوئے ایسی گاڑی میں بیٹھتیں جو چاروں طرف سے پردوں سے ڈھکی ہوئی ہوتی تھی اور جسے دو آدمی دھکیلتے تھے۔ (یہ اسکول صرف لڑکیوں کا تھا اور اس کی عمارت کے گرد بہت اونچی چاردیواری تھی۔)

اسی متوسط طبقے کی ہندو اور مسلمان عورتوں کے درمیان ایک واضح فرق یہ بھی تھا کہ ہندو عورتیں تانگے میں سوار ہونے سے نہیں ہچکچاتی تھیں۔ وہ تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھتیں جہاں ان کا ساری میں لپٹا ہوا نچلا بدن سب کی نظروں کے سامنے ہوتا تھا۔ مسلمان عورتیں اس کے برعکس یکّے کو ترجیح دیتیں جس کی اونچی سیٹ پر یا تو وہ برقع اوڑھ کر سمٹ سمٹا کر بیٹھ جاتیں یا پوری سیٹ کو ان سمیت

چادر سے ڈھانپ دیا جاتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، میری بہنوں کو یکے کی سواری سے نفرت تھی اور بارہ بنکی میں وہ اس پر اسی وقت سوار ہوتیں جب کوئی اور چارہ نہ ہوتا۔ لکھنؤ میں وہ بھی تانگے میں سفر کرتی تھیں۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جو عورتیں ہمارے گھر میں کسی نہ کسی طرح کی خدمت انجام دیتی تھیں — گھر میں رہنے والی خادمائیں یا باہر سے آنے والی روایتی ملازمائیں — اور جو غریب عورتیں شہر بھر میں سخت محنت کے کام کیا کرتی تھیں، وہ کسی قسم کا پردہ نہیں کرتی تھیں۔ پیدل اسکول جاتے ہوئے میں ایک چھوٹی سی بستی سے گزرتا تھا جہاں مسلمان جلاہوں کے گھر تھے۔ ان کی عورتیں اپنے روزمرہ کے کام عام لباس پہنے پہنے انجام دیتیں، یہاں تک کہ پیڑوں کے نیچے کام کرتے ہوئے بھی کوئی پردہ نہ کرتیں۔ ان کے مرد بہت سے اور مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ دیندار سمجھے جاتے تھے — انگریز تو انھیں ''جنونی جلاہے'' کہا کرتے تھے — لیکن نہ معلوم کتنی پیڑھیوں سے ان دیندار مسلمانوں نے اپنی عورتوں پر پردے کی پابندی عائد نہ کی تھی۔ ان کی زندگی کے ڈھب کو دیکھتے ہوئے ان کے لیے ایسا کرنا ممکن بھی نہ تھا۔ صرف جوان شادی شدہ عورتیں اپنا چہرہ جھکائے رکھتیں اور اسے اپنے دوپٹے کا گھونگھٹ نکال کر تھوڑا بہت ڈھک لیتیں، بالکل اسی طرح جیسے اس بستی کی ہندو عورتیں کرتی تھیں۔

دوسرے لفظوں میں، جس مقام اور جس دور میں میں بڑا ہو رہا تھا وہاں لفظ 'پردہ' بہت سے مختلف معنی رکھتا تھا۔ اس سے مراد محض کپڑے کا ایک پارچہ نہیں تھا بلکہ عادتوں کا ایک پورا سلسلہ اس کے معنوں میں شامل تھا۔ بنیادی طور پر اس کی تاکید ہمیشہ حیادار طرزِ عمل پر رہتی تھی جس میں 'بڑوں' کے ساتھ ادب سے پیش آنا بھی شامل تھا۔ پردے کی تعریف، بارہ بنکی میں، مذہبی اصولوں کی بنیاد پر متعین نہیں ہوتی تھی بلکہ یہ مقامی طرزِ عمل اور طرزِ احساس کی بنیاد پر وجود رکھتا تھا۔ اور اس میں تبدیلی کی گنجائش ہمیشہ رہتی تھی۔

تبدیلیوں کی رفتار 1947 کے واقعات کے بعد سے زیادہ تیز ہوگئی۔ زیادہ سے زیادہ مسلمان عورتیں برقع ترک کرتی اور عام لباس میں، خصوصاً ساریوں میں، گھروں سے باہر دیکھی جانے لگیں۔

Scanned with CamScanner

بارہ بنکی اور لکھنؤ میں برقع پوش عورتیں اب بھی دکھائی دیتیں، لیکن لکھنؤ کے فیشن ایبل تجارتی علاقوں میں ان کے نظر آنے کا امکان کم ہوتا تھا۔ بارہ بنکی میں جو گاڑی متوسط طبقے کی لڑکیوں کو اسکول لے جاتی تھی پہلے اس کے ارد گرد تنے ہوئے پردے اترے، اور پھر خود اس کا استعمال ختم ہو گیا۔ لڑکیاں پیدل یا سائیکل رکشا میں اسکول جانے لگیں۔ اب اگر کوئی مجھ سے ڈولی دکھانے کی فرمائش کرتا تو مجھے اس کو سول ہسپتال لے جانا پڑتا جہاں ایک آدھ ڈولی ایسے مریضوں کو لانے کے لیے استعمال ہوتی تھی جو کمزوری کے باعث کسی اور طریقے سے سفر کرنے قابل نہ رہتے تھے۔

پردوں سے ڈھکی موٹریں اور یکے اب دکھائی دینے بند ہو گئے تھے۔ لوگ سائیکل رکشا میں سفر کرنے لگے تھے۔ آپا کی پیڑھی کی عورتیں برقع اوڑھتی رہیں، لیکن میری چھوٹی بہنوں کی ہم عمر لڑکیوں میں شاید ہی کوئی برقعے والی ہوگی۔ اور جو برقع اوڑھتی بھی تھیں وہ اپنا چہرہ کھلا رکھتیں۔ کہا جا سکتا تھا کہ جدیدیت نے مذہب کے تقاضے پورے کر دیے تھے اور اسے اپنا لیا تھا۔ جوں جوں یہ تبدیلیاں آتی گئیں، لوگ انفرادی اور خاندانی سطحوں پر فیصلے کرتے گئے۔ کسی مذہبی کارندے نے میانجی گری کا کام اپنے ہاتھ میں نہ لیا۔ ان تبدیلیوں کی بابت کوئی عمومی شور و غل بھی بلند نہ ہوا، بس کبھی کبھار کوئی آہ سنا دے جاتی۔

❋

سر پر اوڑھی جانے والی جس شے کو 'حجاب' کہا جاتا ہے اس سے میرا سامنا پہلی بار 1961 میں اس وقت ہوا جب میں نقل مکانی کر کے شکاگو آیا جہاں سیاہ فام مسلمانوں کی ایک روز افزوں کمیونٹی رہتی تھی۔ اس کمیونٹی کا قائد عزت مآب الائیجاہ محمد ہمارے ہی محلے، ہائیڈ پارک، کین وُڈ، میں رہتا تھا، اور ان لوگوں کی مسجد اور اس میں قائم اسکول ہمارے اپارٹمنٹ سے چند بلاک کے فاصلے پر واقع تھا۔ ان کی عورتیں باہر کہیں سر پر بندھے ہوئے اس اسکارف کے بغیر نہیں دیکھی جاتی تھیں۔ لمبے چغے پہنے، جن میں ان کا صرف چہرہ دکھائی دے رہا ہوتا، ان کی موجودگی ہر جگہ نمایاں ہوتی۔ لیکن پہلے پہل وہ مجھے ان ننوں سے زیادہ مختلف نہیں لگیں جنھیں میں نے ہندوستان اور امریکہ میں دیکھا تھا۔ بلکہ ان کے سروں پر بندھا ہوا اسکارف مجھے بعض ننوں کے اسکارف کے مقابلے میں کم عجیب معلوم ہوا۔

جب میں نے محلے کے شاپنگ ایریا میں آنا جانا شروع کیا اور ان عورتوں سے میرا سامنا اکثر

Scanned with CamScanner

ہونے لگا، تب میں نے ایک خاص بات نوٹ کی۔ یہ اُن عورتوں کی بابت اردگرد کے لوگوں کا ردعمل تھا ــ تجسس اور احترام کا ایک آمیزہ جسے باقاعدہ محسوس کیا جا سکتا تھا۔ لوگ ان کی طرف تکنے سے تو خود کو باز نہ رکھ پاتے لیکن ان کے آس پاس کھڑے یا چلتے ہوئے وہ قدرے زیادہ شائستگی کا برتاؤ کرتے۔ یہ ردعمل ان علاقوں میں زیادہ نمایاں تھا جہاں کی آبادی صرف کالوں پر مشتمل تھی، مثلاً 47ویں یا 63ویں اسٹریٹ کے تجارتی علاقے۔ جب یہ عورتیں وہاں سے گزرتیں تو گندی زبان اور ناشائستہ طرزِ عمل پر ایک طرح کی روک لگ جاتی۔ اس کا سبب ان کے مردوں کا خوف بھی ہو سکتا تھا کیونکہ محلے میں کوئی بھی ان سے الجھنے کی خواہش نہ رکھتا تھا، لیکن مجھے محسوس ہوتا تھا کہ لوگ ان کے حیادار اور پُرغرور انداز کے باعث بھی ان کا احترام کرتے تھے۔

برسوں بعد یہ حجاب یونیورسٹی آف شکاگو کے کیمپس میں بھی دیکھا جانے لگا جہاں میں پڑھاتا تھا۔ پہلے صرف ایک لڑکی تھی جو حجاب پہنتی تھی، پھر بہت سی ہو گئیں، اور ہوتے ہوتے حجاب سے ڈھکے ہوئے سر کیمپس میں اتنے عام ہو گئے کہ لوگوں نے ان پر توجہ دینا چھوڑ دیا۔ لڑکوں کے ساتھ پڑھنے والی ان مسلمان لڑکیوں میں سے بعض میری کلاسوں میں بھی آئیں۔ ان کے ساتھ میرا تجربہ کسی اعتبار سے غیر معمولی نوعیت کا نہ تھا۔ ایمانداری کی بات یہ ہے کہ مجھے اس پر خاصی حیرت ہوئی۔ میرے ذہن میں بھی ایسے احمقانہ تصورات تھے کہ یہ لڑکیاں اجتماعی طور پر دوسرے طالب علموں سے مختلف ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے، ایسا بالکل نہیں تھا۔ ویسے ان میں ہر ایک دوسروں سے مختلف یا مماثل تھی جیسے کوئی بھی غیر مسلم طالبہ ہو سکتی تھی۔ بلاشبہ ساری مسلمان لڑکیاں حجاب نہیں پہنتی تھیں۔ اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ دونوں گروہ آپس میں اور دوسرے طالب علموں کے ساتھ آزادانہ میل جول رکھتے تھے۔

❋

ستمبر کی وہ صبح شکاگو میں بھی اتنی ہی روشن اور صاف تھی جتنی نیویارک میں جب وہ کچھ پیش آیا جو اس سے پہلے کبھی پیش نہیں آیا تھا۔ معمول کے مطابق میں نے ریڈیو چلا رکھا تھا اور اپنا ناشتہ تیار کرتے ہوئے اسے تقریباً بے دھیانی کے عالم میں سن رہا تھا جب یہ خبر آئی کہ ایک ہوائی جہاز ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے ایک ٹاور سے ٹکرا گیا ہے۔ کوئی چھوٹا طیارہ ہو گا، میں نے سوچا، جسے کوئی احمق شخص شیخی

بگھارنے کے لیے اڑا رہا ہوگا۔ چند منٹ بعد میں نے سنا کہ دوسرے ٹاور سے بھی ایک ہوائی جہاز ٹکرا گیا ہے۔ میں نے لپک کر ٹی وی کھولا۔ وہاں جو منظر دکھائی دیا وہ میرے حافظے پر نقش ہو گیا ہے۔

دمکتا ہوا نیلا آسمان؛ دو ٹاوروں کی شبیہیں جو اپنے اردگرد کی ہر شے سے اوپر سر اٹھائے کھڑی ہیں، اور ان میں سے دھویں کے بادل نکل رہے ہیں۔ پھر بار بار دکھایا جانے والا یہ منظر تبدیل ہونے لگا۔ ٹاور دھماکے سے پھٹ گئے، پھر نمودار ہو گئے؛ دونوں ہوائی جہاز ٹکرائے، پھر اڑنے لگے، پھر ٹکرائے، اور یہی ہوتا رہا۔

پھر واشنگٹن اور پنسلوینیا سے خبریں آئیں۔ رپورٹر اور تبصرہ کار مسلسل بولتے رہے۔ دنیا بھر کے لاکھوں لوگوں کی طرح میں بھی سکتے اور تعجب کے عالم میں بیٹھا رہا۔

جوں جوں دن گزرتا گیا، سکتے کی کیفیت ایک طرح کے فالج کی سی حالت میں منقلب ہوتی گئی۔ تعجب نے ایک ایسی کیفیت کی صورت لے لی جو میرے تجربے میں کبھی نہیں آئی تھی: یہ طیش اور شرمندگی اور خوف کا ایک آمیزہ تھا جو ذہن کو مختل کیے دیتا تھا۔ طیش ان لوگوں پر جنھوں نے اس ہولناک جرم کا ارتکاب کیا، شرمندگی اس پر کہ وہ میرے ہم مذہب تھے، اور اس کے نتیجے کے طور پر امریکہ میں رہنے والے مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہونا متوقع تھا اس کا سرد کر دینے والا خوف۔

مجھے یقین ہے کہ اس وقت یہ احساسات مجھ اکیلے کے نہیں تھے۔ میں رات دیر تک ٹی وی سے چپکا بیٹھا رہا، اور اس کے بعد بھی سو جانا میرے لیے آسان نہ تھا۔

اگلی صبح بھی میری انتڑیوں میں جمی برف پگھلی نہ تھی۔ میں اپنی بالکونی میں جا کھڑا ہوا اور نیچے فٹ پاتھ پر چلتے لوگوں کو دیکھنے لگا۔

میں نے ایک پڑوسی کو چل کر اپنی کار تک جاتے اور کار میں بیٹھ کر روانہ ہوتے دیکھا۔ میں نے پکار کر اس سے سلام دعا نہیں کی۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ نہ معلوم میری طرف کس طرح دیکھے۔ مجھے نیچے جا کر دوسرے لوگوں کے پاس جانے، ان سے مخاطب ہونے اور اپنے مخاطب کیے جانے کے خیال سے خوف آ رہا تھا۔ پچھلے چھتیس گھنٹوں میں میں نے کسی انسان سے ذرا بھی بات نہیں کی تھی۔ پچھلے روز کسی کا فون نہیں آیا تھا، نہ میں نے کسی کو فون کیا تھا۔ میرے کانوں میں اگر کچھ پڑا تھا تو صرف ٹی وی سے اٹھنے والی گمبھیر آوازیں یا میری اپنی بڑبڑاہٹ۔

صبح کا وقت جوں جوں گزر رہا تھا، میری بے چینی بڑھ رہی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ اگر اس وقت میں نے کچھ نہ کیا تو پھر کبھی کچھ نہ کر پاؤں گا۔ میں 1957 سے امریکہ میں رہ رہا تھا اور چالیس برس پڑھانے کے بعد میں نے حال ہی میں قبل از وقت ریٹائرمنٹ لی تھی تاکہ ہندوستان میں آپا کے ساتھ زیادہ وقت گزار سکوں۔ میری زندگی کے جتنے برس ہندوستان میں گزرے تھے اس کے دگنے میں یہاں امریکہ میں گزار چکا تھا۔ میں ویت نام کی جنگ کے خلاف شکاگو میں ہونے والے مارچوں میں شریک ہوا تھا اور اِس ملک اور دوسرے ملکوں میں شہری حقوق سے متعلق کیمپس میں اور اس کے باہر ہونے والے بہت سے اجتماعات میں شامل رہا تھا۔

1968 میں جب میں نے اپنی یونیورسٹی میں احتجاج کرنے والے طالب علموں کے حق میں اور انھیں سزا دینے والی انتظامیہ کے خلاف ایک مضمون شائع کرایا تو کسی احمق نے مجھے فون کر کے کہا کہ وہ مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہے اور بہت جلد مجھ سے نمٹ لے گا۔ 1979 میں (یا شاید 1980 میں) جب امریکی باشندے ایران میں یرغمال بنے ہوئے تھے، ایک روز میں لیک شور ڈرائیو پر جا رہا تھا جب ایک شخص اپنی کار میرے ساتھ ساتھ چلاتے ہوئے کئی دہشت ناک منٹ تک مجھے گالیاں بکتا اور بیئر کے کین (جو خالی نہیں تھے) تاک تاک کر مجھے مارتا رہا۔

ان واقعات نے مجھ پر کوئی اثر نہ چھوڑا تھا۔ لیکن آج میری کیفیت بالکل مختلف تھی۔ میں مشکل سے گھنٹہ دو گھنٹے سونے کے بعد صبح سویرے اٹھ بیٹھا تھا۔ زبردستی تھوڑا بہت ناشتہ کیا تھا۔ ٹی وی پھر چل پڑا تھا لیکن میں اسے بھی مزید دیکھنے کی حالت میں نہیں تھا۔ میں جانتا تھا مجھے باہر نکلنا ہی ہوگا، آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں۔ لیکن میں دنیا کا سامنا کرنے سے ڈرتا تھا، میں اس بات سے خوفزدہ تھا کہ دنیا میرے ساتھ نہ معلوم کیا سلوک کرے۔

آخرکار دوپہر کے قریب جب میرا اپنے قریب ترین پڑوسیوں سے سامنا ہونے کا کوئی خاص امکان نہ رہا، میں زینہ اتر کر نیچے گیا۔ اپنے جانے پہچانے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے میں خود کو عجیب اور گھبرایا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ عادت کے زیرِ اثر کیمپس کی جانب چلتے ہوئے، خوش قسمتی سے کسی جاننے والے سے میری ملاقات نہ ہوئی۔ مجھے یقین ہو رہا تھا کہ راستے میں ملنے والا ہر شخص مجھے شک اور حقارت سے دیکھ رہا ہے۔ میں نے اپنی نظریں جھکا لیں اور، اپنی عادت کے برخلاف، آہستہ آہستہ،

Scanned with CamScanner

کسی خاص عزم کے بغیر، چلتا رہا اور چلتے ہوئے مسلسل مڑ کر گھر لوٹ جانے کی خواہش کو دباتا رہا۔

جلد ہی، اگرچہ کسی ارادے کے بغیر، میں نے خود کو کیمپس میں پایا۔ گرمیوں کا سیشن ختم ہونے کے بعد پوری یونیورسٹی، سوائے انتظامی دفاتر کے، بند پڑی تھی۔ جب میں بڑے چوک میں پہنچا تو اس کے بیچ میں ایک چھوٹا سا ہجوم اکٹھا ہو رہا تھا۔ مجھے پتا چلا کہ مرنے والوں کی یاد میں ایک جلسہ شروع ہونے والا ہے ــ میں نے اس میں شریک ہونے کے لیے وہیں رکنے کا فیصلہ کر لیا۔

جلد ہی وہاں کوئی دو سو افراد جمع ہو گئے۔ ان میں کچھ مانوس چہرے بھی تھے لیکن وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر تھے اور میں نے ان سے نظر نہ ملانا ہی مناسب سمجھا۔ جلسے کا باقاعدہ آغاز یونیورسٹی کے صدر نے کیا۔ وہ اور کوئی درجن بھر مقرر ایک پلیٹ فارم پر دائرے کی شکل میں کھڑے تھے اور ان کے گرد سننے والوں نے گھیرا ڈال رکھا تھا۔ بیشتر مقرر مختلف مسیحی گروہوں کے نمائندے تھے؛ ان کے علاوہ دو ربائی تھے اور دو طالبات جن میں سے ایک یونیورسٹی کے ہندوؤں کی نمائندگی کر رہی تھی اور دوسری مسلمانوں کی۔

جب میں اس مسلمان لڑکی کی موجودگی سے باخبر ہوا تو کافی دیر تک اپنی نظریں اس پر سے ہٹا نہ سکا۔ دعاؤں سے بھری کئی تقریریں سنتے ہوئے میری نظریں بار بار پلٹ کر اس کے دبلے پتلے پیکر کی طرف جاتی رہیں۔ مجھے یہ سننے کا بہت تجسس تھا کہ وہ لڑکی کیا کہنے والی ہے۔ اس کی وجہ یہ اتنی نہیں تھی کہ وہ مسلمان تھی اور یوں کسی نہ کسی طرح میری بھی نمائندگی کرتی تھی، جتنی یہ کہ وہ حجاب پہنے ہوئے تھی۔ میرے تجسس میں تشویش بھی شامل تھی۔ اس موقعے پر ایک حجاب پوش لڑکی کیا کہے گی؟ کیا کہہ سکتی ہے؟ اور اگر اس نے کوئی غلط بات کہہ دی تو کیا ہوگا؟ میری تقریباً یہ خواہش تھی کہ کاش یہ لڑکی یہاں نہ ہوتی۔

آخر اس کی باری آ گئی۔ اس نے قدم آگے بڑھایا؛ محض ایک دُبلی جیسی لڑکی، وہ اسٹینڈرڈ قسم کی جینز اور کرتی پہنے تھی اور اس کا چہرہ حجاب کے گھیرے میں لپٹا ہوا تھا جس نے اس کے بالوں اور کندھوں کو ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ واضح طور پر گھبرائی ہوئی سی دکھائی دے رہی تھی اور جب اس نے قرآن کی پہلی سورت ــ سورۂ فاتحہ ــ یادداشت سے پڑھنی شروع کی تو اس کی آواز مجھے بمشکل سنائی دے رہی تھی۔ اس کے بعد اس نے ایک پرچی میں سے، جسے وہ پورے وقت اپنی مٹھی میں دبائے رہی

تھی، اس کا انگریزی ترجمہ پڑھ کر سنایا۔ پھر ایک قدم پیچھے ہٹ کر پہلے والی مقرر کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

کیا فرسودہ بات ہے! میں نے سرپرستانہ انداز میں سوچا۔ اس نے اگر کچھ کیا تو بس وہی جو دنیا بھر کے مسلمان اس وقت کرتے ہیں جب انھیں موقعے کے مناسب کوئی دعا نہ سوجھ رہی ہو۔ اس نے محض فاتحہ پڑھ دی، جسے امریکہ میں ایسے کسی موقعے پر پڑھی جانے والی 'دی لارڈز پریئر' (The Lord's Prayer) کا اسلامی مماثل کہا جا سکتا ہے۔ یہاں موجود لوگوں تک اگر اس لڑکی کی آواز پہنچی بھی ہوگی تو سورۂ فاتحہ میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کے ان کے لیے کیا معنی ہو سکتے ہیں؟ میں نے خواہش کی کہ اس لڑکی نے تخیل سے کچھ کام لیا ہوتا اور ہمدردی کے کچھ الفاظ تلاش کیے ہوتے۔ جیسے اس سے پہلے تقریر کرنے والی ہندو طالبہ نے اُپنشد کا اقتباس پڑھا تھا۔ جلد ہی مجمع چھٹنے لگا۔ میں بھی مڑا اور واپس گھر کی طرف چل دیا۔

تب جس معاملے کا میں نے ابھی مشاہدہ کیا تھا اس کی اہمیت رفتہ رفتہ، غیر متوقع طور پر، مجھ پر منکشف ہونے لگی۔ ایک طرف میں تھا، اس لڑکی سے تین گنا عمر کا مرد، جو ابھی چند گھنٹے پہلے تک اپنے اپارٹمنٹ سے باہر قدم رکھنے سے ڈر رہا تھا کیونکہ میرا خیال تھا کہ میرا حلیہ مسلمانوں جیسا ہے، اور دوسری طرف یہ لڑکی تھی جو پورے اعتماد کے ساتھ اپنا حجاب پہنے ہوئے تھی جیسے اس کی جلد کی رنگت اور اس کا ناک نقشہ اسے کسی نسل پرست کے حملے کا ممکنہ ہدف بنا دینے کے لیے کافی نہ ہو۔

مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ وہاں کامیاب رہی جہاں میں، جو اپنی نگاہ میں اس سے کہیں زیادہ پختگی اور دانائی کا حامل تھا، ناکام رہا تھا۔ اس نے ہمت اور دانائی حاصل کر کے اس اجتماعی احساسِ جرم میں مبتلا ہونے سے انکار کر دیا جسے بہت سے لوگ بہت عجلت کے ساتھ تمام مسلمانوں پر لادنے لگے تھے۔ وہ ایک فائٹر تھی۔ میرے برخلاف اس دبلی پتلی نوجوان لڑکی نے اپنے اندر وہ کچھ کرنے کی قوت تلاش کر لی تھی جسے وہ اس لمحے کرنا درست سمجھتی تھی۔ وہ پورے عزم کے ساتھ اس بات پر جمی رہی جو اس کے لیے ایک مستقل قدر کا درجہ رکھتی تھی۔

میں نے تصور کیا کہ وہ اس دعائیہ جلسے میں شریک ہونے کے لیے شہر کے کسی مضافات سے اپنی کار چلا کر آئی ہوگی، یا شاید وہ شکاگو کے شمالی حصے سے ٹرین میں سوار ہوئی ہو۔ راستے میں لوگ

Scanned with CamScanner

اسے گھورتے رہے ہوں گے۔ کچھ لوگوں نے اسے چوکنی نظروں سے دیکھا ہوگا اور کچھ نے اس کے بارے میں آپس میں شرانگیز سرگوشیاں کی ہوں گی۔ لیکن میں نے تصور کیا کہ وہ اپنا حجاب پوش سر اوپر اٹھائے سیدھی اپنے سامنے دیکھتی رہی ہوگی۔

اپنے اپارٹمنٹ کا طویل زینہ چڑھتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ میرے قدم اب اتنے بھاری نہیں رہے جتنے چند گھنٹے پہلے زینہ اترتے ہوئے تھے۔ ''شکریہ، ننھی بہن، اپنی سچائی پر قائم رہنے کے لیے تمھارا شکریہ''۔ میں نے یہ الفاظ اس وقت تو ادا نہیں کیے تھے، لیکن اب انھیں ادا کرنا مجھ پر لازم ہے۔

میں نے یہ مضمون لکھنا اس وقت شروع کیا جب میں نے فرانسیسی حکومت کے اس فیصلے کی خبر پڑھی جس کے تحت فرانسیسی سرکاری اسکولوں میں پڑھنے والی مسلمان لڑکیوں کے حجاب پہننے پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ اس وقت اسکولوں کے کھلنے میں صرف ایک دو دن باقی تھے اور ان کے کھلتے ہی یہ پابندی عائد ہوگئی۔ اس دوران، مجھے معلوم ہوا، عراق میں مسلح شدت پسندوں نے دو فرانسیسی صحافیوں کو اغوا کر کے یرغمال بنالیا اور مذکورہ قانون کو واپس نہ لیے جانے کی صورت میں انھیں ہلاک کرنے کی دھمکی دی۔

فرانسیسی صدر نے ایک کمیشن کا اجلاس طلب کیا کہ وہ فرانس میں خستہ حال شہری محلّوں میں بسنے والے مسلمان تارکین وطن کی زندگیوں میں بہتری لانے کے طریقے تجویز کرے۔ کمیشن نے فوری اقدامات کے لیے کوئی درجن بھر تجویزیں پیش کیں جو اقتصادی اور معاشرتی، دونوں قسم کی تھیں۔ اس فہرست میں سے صدر شیراک نے صرف ایک پر عمل کرنے کا ارادہ کیا: سرکاری اسکولوں میں مذہبی علامات کی نمائش کی اجازت نہیں ہوگی۔ غالباً شیراک کا خیال تھا کہ حجاب نہ پہننے سے تنگ و تاریک محلّوں میں رہنے والی مسلمان لڑکیوں کی حالت بہتر ہو جائے گی اور وہ جدید دور کی فرانسیسی عورت کے مثالی تصور کے قریب آ سکیں گی۔

عراق میں، کچھ خودساختہ مجاہدین اسلام نے، جو اپنے آس پاس رہنے والی عراقی عورتوں اور بچوں کے مصائب سے قطعی بے پروا ہیں، فرانس میں رہنے والی چند اسکولی لڑکیوں کے حجاب پہننے کے حق کا دفاع کرنے کا فیصلہ کیا اور اس مقصد کے لیے دو بے گناہ فرانسیسی باشندوں کو اغوا کر کے یرغمال بنالیا۔

Scanned with CamScanner

بہت عرصہ نہیں گزرا جب امریکی حکومت نے طالبان کی حکومت میں رہنے والی افغان عورتوں کے مصائب کو اپنے فوجی حملے کے جواز کے طور پر پیش کیا تھا۔ اب طالبان جا چکے ہیں اور جو جنگی سردار اس وقت اقتدار میں ہیں وہ افغان عورتوں کے ساتھ ان سے کچھ مختلف سلوک نہیں کر رہے۔ لیکن اب واشنگٹن سے عورتوں کی حالت زار کے بارے میں کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔

1980 کے عشرے میں بھی یہی ہوا تھا جب پاکستان میں جنرل ضیا نے اسلامائزیشن کے نام پر پاکستانی عورتوں کے خلاف خوفناک قوانین نافذ کر دیے تھے۔ لیکن واشنگٹن کو اپنی سرد جنگ کے سلسلے میں جنرل ضیا کی ضرورت تھی۔ وہ کابل کے کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کو، جنھوں نے افغان عورتوں کے فائدے کے لیے اس وقت تک سب سے زیادہ کام کیا تھا، ختم کرنے اور افغانستان کو سوویت یونین کا ویت نام بنانے کا خواہش مند تھا۔ چنانچہ صدر ریگن نے پاکستانی انٹیلی جنس اور افغان جنگی سرداروں کے ساتھ مل کر 'جہاد' کی بنا ڈالی، اور اپنی مجرمانہ بے پروائی کا مظاہرہ کیا کہ اس کے نتائج افغان عورتوں اور بچوں کے لیے کس نوعیت کے ہوں گے۔

اب واشنگٹن سے نہ تو افغان عورتوں کے بارے میں کوئی آواز سنائی دیتی ہے اور نہ ان عراقی عورتوں کے بارے میں جو صحت، تعلیم اور پیشہ ورانہ سرگرمیوں کے میدانوں میں، حالیہ جنگ اور اس سے قبل عراق پر عائد بین الاقوامی پابندیوں کا نشانہ بننے سے پہلے، بہت پیش رفت کر چکی تھیں۔ یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ سعودی عرب کی عورتوں کی زندگیاں واشنگٹن کے لیے کسی تشویش کا سبب نہیں ہیں — چنانچہ جب 2002 میں پندرہ سعودی لڑکیاں محض اس وجہ سے آگ میں جل کر مر گئیں کہ سعودی عرب کی مذہبی پولیس نے انھیں جلتی ہوئی عمارت سے ننگے سر باہر نہیں نکلنے دیا تو واشنگٹن نے اس پر کوئی احتجاج نہ کیا۔ البتہ آج کل اپنے حملے کے اگلے شرانگیز ہدف کا ذکر کرتے ہوئے وہ ایرانی عورتوں کی حالت کا ذکر کرنے سے کبھی نہیں چوکتا۔

مجھے لگتا ہے کہ مسلمان عورتوں کا مسئلہ اٹھانے کا عمل اب اسی طرح ہر بدمعاش کا آخری عذر بن گیا ہے جیسے پہلے کبھی وطن کی محبت کہی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ تو ایک بدمعاش خود ہی طے کر لیتا ہے کہ اٹھایا جانے والا مسئلہ یا عذر کون سا ہوگا۔

❄❄

Scanned with CamScanner

چودھری محمد نعیم

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

متشدد مردانہ پن اور اسلام

2001 میں یونیورسٹی آف شکاگو میں تدریس سے ریٹائر ہونے سے چند سال پہلے کی بات ہے کہ مجھے ایک ایسا تجربہ ہوا جو اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ میری کلاس کا ایک نوجوان مسلمان طالب علم — جس کے جنوبی ایشیائی والدین امریکہ میں کامیاب زندگی گزار رہے تھے — کلاس ختم ہونے کے بعد دروازے کے پاس رک گیا اور جب میں کمرے سے باہر نکل رہا تھا تو مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا، ''نعیم صاحب، آپ نماز کیوں نہیں پڑھتے؟'' میں اس کی بات پر چونک پڑا۔ میرا یا کسی اور کا نماز پڑھنا یا نہ پڑھنا — بلکہ خود نماز کا موضوع — کلاس میں کبھی زیر بحث نہیں آیا تھا۔ تاہم میں جمعے کی اس نماز میں کبھی شامل نہیں ہوا جو کیمپس میں باقاعدگی سے ادا کی جاتی تھی (اور اب بھی کی جاتی ہے، اور جس میں یہ طالب علم غالباً شریک ہوتا تھا)۔

تعجب کے عالم میں، اور اپنی ایک احمقانہ عادت کے زیر اثر، میں نے فضول سے ایک فقرے سے اس کے سوال کا جواب دیا: ''شاید اس لیے کہ مجھے جنت میں جانے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔'' نوجوان نے مزید کچھ نہ کہا اور چلا گیا۔ ہمارے درمیان اس موضوع پر پھر کبھی بات نہ ہوئی۔ پھر، چند مہینے بعد، اسی پس منظر کے حامل ایک اور نوجوان نے مجھ سے ٹھیک وہی سوال کیا۔ ایک بار پھر متعجب ہو کر میں نے اسے بھی وہی جواب دیا، اور ساتھ میں کچھ اور بھی جوڑ دیا، جواب، پانچ برس بعد، مجھے کچھ اس طرح یاد آتا ہے کہ میں ایسے لوگوں سے بچنا چاہتا ہوں جنھیں یہ زعم ہے کہ ان کا جنت میں جانا

Scanned with CamScanner

یقینی ہے۔ اس دوسرے نوجوان نے بھی اس موضوع پر اور کچھ بات نہ کی۔ لیکن ان دو واقعات نے مجھے غور کرنے پر اکسایا، ان کے سوال پر اتنا نہیں جتنا اس حقیقت پر کہ یہ سوال کرنے والے دو نوجوان لڑکے تھے۔

جس پس منظر سے میں تعلق رکھتا ہوں، اس کے لحاظ سے میں کسی ایسے شخص سے اس سوال کی توقع کر سکتا تھا جو عمر میں میرے برابر یا مجھ سے بڑا ہو، اور ساتھ ہی مجھ سے بہت قریب بھی ہو، اور ماحول کچھ ایسا ہو جو اس قسم کے سوال کے لیے مناسب ہو۔ یا پھر اس سوال کی توقع کسی بالکل اجنبی شخص، مثلاً تبلیغی جماعت کے کسی رکن سے کی جا سکتی تھی جن کی ٹولیاں شکاگو میں گشت پر آتی رہتی ہیں۔ اپنے نوعمر طالب علموں سے میں اس قسم کے سوال کی توقع نہیں کر سکتا تھا۔ انھیں مجھ سے یہ سوال کرنے پر کس بات نے اکسایا ہوگا؟ میں نے اس پر غور کیا اور چند جوابات تک پہنچا۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ جو بات مجھے پریشان کر رہی ہے وہ کچھ اور ہے — ایک مختلف سوال: ان نوجوان لڑکوں کو یہ سوچ کیسے ملی کہ وہ کسی سے یہ سوال کرنے کا حق رکھتے ہیں؟

میری پرورش شمالی ہندوستان کے ایک چھوٹے سے شہر میں رہنے والے ایک بالائی متوسط طبقے کے مسلمان گھرانے میں ہوئی۔ میرے والد نے شروع میں کچھ عرصے تک لکھنؤ کی معروف سنی مذہبی درسگاہ فرنگی محل میں تعلیم حاصل کی تھی اور بعد میں ایک سرکاری ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا تھا۔ ہمارے کنبے کے فرنگی محل سے کچھ اور رشتے بھی تھے، اور وہاں والد کے ایک سابق ہم سبق اکثر ہمارے گھر آیا کرتے تھے۔ لیکن میں نے اپنی مذہبی تربیت والد یا ان کے دوستوں سے نہیں حاصل کی۔ میں نے یہ تربیت اپنی آپا (ماں) اور امی (دادی) سے حاصل کی۔ میں نے اپنے والد کو پانچوں وقت کی نماز پڑھتے اس وقت دیکھا جب وہ بسترِ مرگ پر تھے۔ لیکن آپا اور امی کسی وقت کی نماز قضا نہ کرتی تھیں۔ نہ وہ اور نہ ماما، یعنی ہماری چہیتی انا جو جوانی میں بیوہ ہونے کے بعد آپا کی خدمت کے لیے، تقریباً ان کے جہیز میں شامل ہو کر آئی تھیں۔

امی نے مجھے نماز پڑھنے کا طریقہ سکھایا؛ وہ مجھ سے دو کتابوں میں سے پڑھوا کر سنتی بھی تھیں۔ ان میں سے ایک کتاب قصص الانبیا تھی اور دوسری پیغمبر اسلام کی ایک عمدہ سیرت جو خاص طور پر بچوں کے واسطے لکھی گئی تھی۔ ایک مولوی صاحب ہر روز مجھے ناظرہ قرآن پڑھانے آتے تھے۔

Scanned with CamScanner

میں نے قرآن کے کئی پارے اس طرح پڑھے، اور کوئی بیس سورتیں زبانی یاد کرلیں تاکہ روزمرہ کی نماز میں پڑھ سکوں۔ نماز پڑھنے کے سلسلے میں میری حوصلہ افزائی کی جاتی تھی، لیکن اس پر مجبور نہیں کیا جاتا تھا۔ میرا جب جی چاہتا نماز پڑھتا، اور جب کبھی نماز پڑھتا، مجھے اچھا لگتا۔ یہ انھی دنوں کی بات ہے کہ امی یعنی میری دادی نے مجھے ایک غیر معمولی سبق سکھایا۔

والد کے ایک رشتے کے بھائی، جو شیعہ تھے اور جنھیں ہم بشیر بابا کہتے تھے، ایک بار ہمارے ہاں آئے ہوئے تھے۔ وہ کسی گاؤں میں رہتے تھے اور اپنی مقدمہ بازیوں کے سلسلے میں اکثر شہر آیا کرتے اور ہمیشہ ہمارے ہاں ٹھہرتے تھے۔ میرے دوسرے چچا ان کے شیعہ ہونے پر انھیں ہلکے پھلکے انداز میں چھیڑا کرتے تھے۔ ہم سب سُنّی تھے۔ اُس دن بشیر بابا اندر زنانے میں امی کو سلام کرنے آئے ہوئے تھے۔ جب عصر کی نماز کا وقت قریب آیا تو گھر کے کئی افراد نماز پڑھنے چلے گئے۔ بشیر بابا نہیں گئے۔ شاید میں بھی نماز کو جانے کے لیے اٹھا ہوں گا، لیکن میں اب یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ بہرحال، جب میں نے دیکھا کہ وہ دوسروں کے ساتھ نماز کو نہیں اٹھے تو میں نے ان سے پوچھ لیا، ''آپ عصر کی نماز نہیں پڑھیں گے؟'' انھوں نے کوئی گول مول سا جواب دیا، پھر کچھ دیر اور امی سے بات چیت کرنے کے بعد مردانے میں اپنے کمرے میں چلے گئے۔ تب امی نے مجھ سے اپنے پاس بیٹھنے کو کہا اور سخت لہجہ اختیار کرتے ہوئے مجھے ہدایت کی کہ آئندہ کسی سے اس کے نماز پڑھنے نہ پڑھنے کے بارے میں کوئی سوال نہ کروں۔

جہاں تک میں اب یاد کرسکتا ہوں، انھوں نے کہا تھا، ''تمھیں کیا پتا کہ کوئی شخص کس سبب سے نماز نہیں پڑھ رہا؟ یاد رکھو، یہ معاملہ اس کے اور اللہ کے درمیان ہے۔ تمھارا سوال اس کے لیے محض شرمندگی کا باعث بنے گا، فائدہ کچھ نہ ہوگا۔'' میری دادی نے مجھے جو سبق دیا تھا وہ غالباً مجھ سے سوال کرنے والے ان دو نوجوانوں کے گھرانے میں نہیں دیا جاتا ہوگا۔ انھوں نے یہ سبق کہیں اور بھی نہ سیکھا ہوگا۔ میں جوں جوں اس معاملے پر غور کرتا گیا، ایک بات میرے ذہن میں واضح ہوتی گئی: اہم ترین بات یہ تھی کہ میں نے اپنا مذہب اپنے گھر کی عورتوں سے سیکھا تھا جبکہ ان نوجوانوں کی مذہبی تربیت ان کے باپ یا محلے کی مسجد سے متعلق مردوں نے کی تھی۔

میں عورتوں کے اسلام سے سیکھتے ہوئے بڑا ہوا، وہ اسلام جس پر وہ گھر کے یا باہر کے کسی مرد

Scanned with CamScanner

کے براہ راست اثر کے بغیر عمل کیا کرتی تھیں ۔ نماز روزے کی شرعی رسوم اس کا حصہ ضرور تھیں لیکن ان کے علاوہ عقیدت اور دینداری کی اور رسمیں بھی تھیں ۔ ان میں اولیا اور مرحوم خاندانی بزرگوں کی یاد منانا، مناجاتیں پڑھنا اور اَور بہت کچھ شامل تھا۔ ان تمام افعال میں مشترک اہم بات یہ تھی، جسے میں نے بہت بعد میں جانا، کہ ان میں دینداری کا کوئی ایسا اظہار قطعی نہیں تھا جس کا تعلق اقتدار اور حاکمیت سے ہو۔

اس کے برعکس ان مذہبی رسوم سے، ان کی ادا کرنے والیوں کی طرف سے حد درجہ انکسار اور محتاجی ظاہر ہوتی تھی ۔ شاید مجھے اول الذکر لفظ پر زیادہ زور دینا چاہیے۔ خدا اور اس کے منتخب بندوں کے سامنے انکسار وہ طاقتور ترین تاثر تھا جو مجھے امی، آپا اور گھر کی دوسری عورتوں کے مذہبی افعال کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا۔ ان میں بہ حیثیت مسلمان خود کو خدا کے نزدیک کوئی خاص انسان سمجھنے کی قطعی کوئی رمق نہ پائی جاتی تھی؛ بلکہ مسلمان ہونا درحقیقت ان کے نزدیک یہ معنی رکھتا تھا کہ انسان حشر و نشر کے معاملے میں خود کو انکسار اور غیر یقینی پن کے ساتھ خدا پر چھوڑ دے ۔ بلاشبہ یہ رویہ، جیسا کہ میں اب دیکھ سکتا ہوں، گھر کے نظام میں خود ان کے اپنے مقام سے قریبی تعلق رکھتا تھا۔ زنانے میں اور خاندانی معاملوں میں ان کا خواہ کتنا ہی زور کیوں نہ چلتا ہو، ان کے لیے حتمی بات مردوں کے کیے ہوئے فیصلوں کو تسلیم کرنا تھا۔ یہ بات کہنے کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ اپنے بچوں کی زندگی کے تشکیلی برسوں میں، جب لڑکے اور لڑکیاں دونوں زنانے میں رہتے تھے، عورتیں نہایت اہم کردار ادا کرتی تھیں۔ اس قسم کے گھرانوں کے بالغ مرد تو یوں بھی اپنا بیشتر وقت گھر کی عورتوں سے، اور چنانچہ اپنے نوعمر لڑکوں سے بھی، دور رہ کر گزارتے تھے۔

جو بات میں نے بیان کی ہے وہ صرف مجھ تک محدود نہ تھی ۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے تک ان لوگوں میں جنھیں 'شرفا' کہا جاتا تھا، بچے ایسے گھروں میں پروان چڑھتے تھے جن کے زنانہ اور مردانہ حصے الگ الگ ہوتے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کوئی ایسی دور کی کوڑی لانا نہیں کہ اپنی پرورش کے دنوں میں مکان کی یہ تقسیم اس اسلام کی خصوصیات متعین کرنے میں بھی بہت اثر انگیز ہوتی تھی جسے ہم بڑے ہوتے ہوئے سیکھتے تھے۔ بالکل اسی طرح مجھ سے سوال کرنے والے نوجوان مردوں کے سیکھے ہوئے اسلام پر بھی ان کے گھروں کی مکانی خصوصیات کا اثر پڑا ہوگا۔

Scanned with CamScanner

امریکی مکانوں میں زنانہ اور مردانہ حصوں کی تقسیم نہیں ہوتی۔ (اور یہی قصہ آج کل برصغیر جنوبی ایشیا کے شہروں میں واقع مکانوں اور فلیٹوں کا بھی ہے۔) اب گھر کی عورتیں اور بچے ان جگہوں میں رہتے ہیں جہاں مرد — شوہر اور باپ — ہمیشہ موجود، لہٰذا ہمیشہ بااختیار، ہوتے ہیں۔ آج کل کے ان شریف گھرانوں میں یہ بات طے کرنے میں مردوں کا کردار کہیں زیادہ غالب ہوتا ہے کہ گھر کے لوگوں کی مذہبی یا روحانی زندگی کس قسم کی ہوگی۔ اس کے علاوہ یہ عورتیں اور مرد ایسے حالات میں رہتے ہیں جہاں مسجدوں اور اسلامی مراکز میں انھیں نہ صرف بتایا جاتا ہے بلکہ اس کا عملی مظاہرہ بھی کیا جاتا ہے کہ مذہبی تعلیم اور تربیت دینا مردوں کا کام ہے — خواہ وہ گھرانوں کے سربراہ ہوں، گشت پر نکلی ہوئی تبلیغی جماعت کے ارکان ہوں یا امامت کے لیے برصغیر سے خاص طور پر بلوائے گئے امام ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ اب لڑکیاں بھی ایسے ماحول میں بڑی ہو رہی ہیں جہاں ان پر مذہبی معاملوں میں اپنے باپ یا دیگر مردوں کے اثرات اُس ماحول کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں جو کچھ عرصہ پہلے برصغیر میں دیکھے جاتے تھے۔

مذہبی معاملوں میں عورتوں کی فعالیت میں آنے والے زوال کا نتیجہ یہ ہے کہ میری پیڑھی کے لوگ اپنے مذہبی تجربے میں شعریت، ابہام اور انکسار کی جو خصوصیات محسوس کرتے تھے وہ میرے نوجوان طالب علموں کے تجربے سے غائب ہو چکی ہیں۔ میں شعریت اور ابہام کے الفاظ پر دوبارہ زور دینا چاہتا ہوں، کیونکہ زنانے میں پائی جانے والی بیشتر دانائی شاعری، ضرب الامثال، کہاوتوں اور زبانی روایتوں پر مشتمل ہوتی تھی؛ ان میں ابہام کا عنصر موجود رہتا تھا اور ایک قسم کے شعروں یا کہاوتوں کے مقابلے میں دوسری طرح کے شعر اور کہاوتیں پیش کی جاسکتی تھیں۔

اس کے برخلاف امریکہ میں رہنے والے نوعمر مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کی مذہبی تربیت کرنے والے بالغ مرد غالباً اسلام کی ایک ایسی طے شدہ، تحریری صورت سکھا رہے ہیں جو — اپنے فرقے کو واحد درست فرقہ ماننے کے جوش سے لبریز — اور انکسار کے اثرات سے پوری طرح آزاد، ایسا اسلام ہے جس کی توجہ جارحانہ انداز میں اختیار حاصل کرنے اور اس پر قبضہ برقرار رکھنے کے عمل پر مرکوز ہے۔

اس مفروضہ اسلام کا اپنے تیقّنات پر اصرار ہیبت ناک ہے۔ متشدد مردانہ پن کے تصوّر پر مبنی یہ

Scanned with CamScanner

اسلام پرانے روایتی پدرسری اسلام کا اور زیادہ سفاک روپ معلوم ہوتا ہے، اور اس کی بے تابانہ کوشش یہ رہتی ہے کہ عورتوں اور بچوں کو زیر کر کے اپنی حاکمیت قائم کرے اور پھر اسے برقرار رکھے۔ ایران، افغانستان، سوڈان اور پاکستان کی حالیہ تاریخ پر غور کیجیے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ اسلام کا یہ نیا روپ وہاں کیا کردار ادا کرتا رہا ہے اور اب بھی کر رہا ہے۔ ذرا سوچیے کہ خود کو 'اسلامی ریاست' کہنے والی ہر مقتدر طاقت کا پہلا کام اپنے ملک کے بچوں کے ذہنوں اور اپنی عورتوں کے بدنوں کو پوری طرح اپنا تابع بنانا کیوں ہوتا ہے۔

❋❋

Scanned with CamScanner

ہیرلڈ پنٹر

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

فن، سچ اور سیاست

1951 میں میں نے لکھا تھا:

"جو کچھ حقیقی ہے اور جو کچھ غیر حقیقی ہے اس کے درمیان کوئی ٹھوس امتیازات نہیں ہیں، اور نہ جو کچھ سچ ہے اور جو کچھ جھوٹ ہے اس کے درمیان۔ کسی چیز کا سچ یا جھوٹ ہونا ضروری نہیں ہوتا؛ وہ بیک سچ بھی ہو سکتی ہے اور جھوٹ بھی۔"

میں ان باتوں کو اب بھی معقول مانتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ ان کا اطلاق فن کے ذریعے سے حقیقت کی تلاش پر اب بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک لکھنے والے کی حیثیت سے میں اب بھی ان باتوں پر قائم ہوں، لیکن ایک شہری کی حیثیت سے ان پر یقین نہیں رکھ سکتا۔ ایک شہری کے طور پر میرے لیے یہ سوال کرنا ناگزیر ہے: کیا چیز سچ ہے؟ کیا چیز جھوٹ ہے؟

ڈراما میں سچ کبھی ہاتھ نہیں آتا۔ آپ اسے پا نہیں سکتے لیکن اسے تلاش کرتے رہنے پر مجبور

انگریزی زبان کے ممتاز معاصر ڈراما نگار، ہدایت کار، مضمون نگار اور شاعر ہیرلڈ پنٹر (Harold Pinter) 1930 میں مشرقی لندن میں پیدا ہوئے اور 24 دسمبر 2008 کو وفات پائی۔ انھیں 2005 میں ادب کا نوبیل انعام پیش کیا گیا۔ زیرِ نظر متن ان کے نوبیل انعام قبول کرنے کے موقعے پر کی جانے والی تقریر ہے۔ وہ اس تقریب میں خرابیِ صحت کے باعث خود شریک نہ ہو سکے۔ انھوں نے اپنا یہ خطاب وڈیو پر ریکارڈ کروا کر بھیجا، جسے اس تقریب میں دکھایا اور سنوایا گیا۔

Scanned with CamScanner

ہیں۔ تلاش ہی دراصل کوشش جاری رکھنے کا محرک ہوتی ہے۔ تلاش ہی آپ کا کام ہے۔ بہت بار اندھیرے میں آپ کی سچ سے مڈبھیڑ ہوتی ہے، آپ اس سے ٹکرا جاتے ہیں یا آپ کو محض کوئی ایسی جھلک یا ایسی شکل دکھائی دے جاتی ہے جو سچ سے مماثلت رکھتی معلوم ہوتی ہے، اور اکثر اس وقت آپ کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ لیکن اصل سچائی یہ ہے کہ فنِ ڈراما میں ایسی کسی چیز کا کبھی وجود نہیں ہوتا جو واحد سچ ہو۔ بہت سے سچ ہوتے ہیں۔ یہ سچ ایک دوسرے کو للکارتے ہیں، ایک دوسرے سے دور بھاگتے ہیں، ایک دوسرے میں عکس ڈالتے ہیں، ایک دوسرے کو نظرانداز کرتے ہیں، ایک دوسرے کو چھیڑتے ہیں، ایک دوسرے کی بابت نابینا رہتے ہیں۔ کبھی کبھی آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ کسی خاص لمحے کا سچ آپ کے ہاتھ میں آ گیا؛ پھر وہ آپ کی انگلیوں سے پھسل جاتا ہے اور گم ہو جاتا ہے۔

مجھ سے اکثر یہ سوال کیا گیا ہے کہ میرے کھیل کس طرح وجود میں آئے۔ میں نہیں جانتا۔ نہ میں اپنے کھیلوں کا نچوڑ بیان کرسکتا ہوں، سوائے اس کے کہ یہ کچھ پیش آیا تھا۔ کرداروں نے یہ کچھ کہا۔ انھوں نے یہ کچھ کیا۔

بیشتر کھیل کسی ایک سطر، ایک لفظ یا ایک پیکر (image) سے پیدا ہوتے ہیں۔ اکثر اس مخصوص لفظ یا فقرے کے پیچھے پیچھے پیکر بھی چلا آتا ہے۔ میں دو سطروں کی دو مثالیں دوں گا جو اچانک پتا نہیں کہاں سے میرے دماغ میں آ گئیں، اور ان کے تعاقب میں ایک پیکر، اور اس کے تعاقب میں میں۔

یہ دو کھیل ہیں The Homecoming اور Old Times۔ گھرواپسی کی پہلی سطر ہے: ''تم نے قینچی کیا کی؟'' پرانے دن کی پہلی سطر ہے: ''سیاہ۔''

دونوں موقعوں پر میرے پاس اس سے آگے کوئی اطلاع نہ تھی۔

پہلے موقعے پر ظاہر تھا کہ کوئی شخص قینچی ڈھونڈ رہا ہے اور کسی دوسرے شخص سے جس پر اسے قینچی چرا لینے کا شبہ ہے، اس کا پتا پوچھ رہا ہے۔ لیکن مجھے کسی نہ کسی طرح یہ معلوم تھا کہ وہ دوسرا شخص قینچی کی ذرہ بھر پروا نہیں کرتا؛ یہی نہیں، اسے سوال کرنے والے کی بھی کچھ پروا نہیں۔

''سیاہ'' کو میں نے کسی کے بالوں کے رنگ کے بیان کے طور پر سمجھا، کسی عورت کے بال، اور یہ لفظ کسی سوال کے جواب میں ادا کیا گیا تھا۔ دونوں موقعوں پر میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا

Scanned with CamScanner

کہ معاملے کا تعاقب کروں۔ یہ بصری طور پر واقع ہوا، نہایت سست روی کے ساتھ، سائے روشنی میں ڈھلتے گئے۔

میں ہمیشہ کھیل کا آغاز کرداروں کو الف، ب، ج کے نام دے کر کرتا ہوں۔

جس کھیل نے گھروا پسی کی صورت اختیار کی، اس میں میں نے ایک آدمی کو ایک اُجاڑ کمرے میں داخل ہوتے اور ایک نسبتاً کم عمر آدمی سے، جو ایک بدوضع صوفے پر بیٹھا گھڑ دوڑ کا اخبار پڑھنے میں مشغول تھا، یہ سوال کرتے دیکھا۔ کسی نہ کسی طرح مجھے شبہ تھا کہ الف باپ ہے اور ب اس کا بیٹا، لیکن میرے پاس اس کا کوئی ثبوت نہ تھا۔ تاہم اس بات کی کچھ آگے چل کر تصدیق ہو گئی جب ب (جو بعد میں لینی بنا) الف سے (جو بعد میں میکس بنا) کہتا ہے، ''ڈیڈ، اگر میں موضوع بدل دوں تو تم برا تو نہیں مانو گے؟ ایک بات پوچھتا ہوں۔ ہم نے ابھی جو کھانا کھایا، اس کا نام کیا تھا؟ تم اسے کیا کہتے ہو؟ تم ایک کتا کیوں نہیں خرید لیتے؟ تم ایک کتا باورچی ہو۔ سچ۔ تم سمجھتے ہو کہ تم بہت سے کتوں کے لیے کھانا پکا رہے ہو۔'' چنانچہ، چونکہ ب الف کو ''ڈیڈ'' کہہ کر پکارتا ہے، مجھے یہ فرض کرنا معقول بات لگی کہ وہ باپ بیٹا ہیں۔ یہ بھی ظاہر تھا کہ الف باورچی ہے اور معلوم ہوتا تھا کہ اس کے پکائے ہوئے کھانے کچھ زیادہ پسند نہیں کیے جاتے۔ کیا اس کا مطلب ہے کہ ماں کا وجود نہیں؟ مجھے نہیں معلوم تھا۔ لیکن، جیسا کہ میں نے اس وقت خود کو بتایا، ہمارے آغاز ہمارے انجاموں سے بے خبر ہوتے ہیں۔

''سیاہ۔'' ایک بڑی کھڑکی۔ شام کا آسمان۔ ایک آدمی، الف (جسے بعد میں ڈیلی بننا تھا)، اور ایک عورت، ب (جو بعد میں کیٹ بننے والی تھی)، بیٹھے شراب پی رہے ہیں۔ ''موٹی یا دبلی؟'' مرد پوچھتا ہے۔ یہ دونوں کس کے بارے میں بات کر رہے ہیں؟ لیکن تب مجھے کھڑکی میں ایک عورت، ج (جسے بعد میں اینا بننا تھا)، ایک مختلف قسم کی روشنی میں، ان دونوں کی طرف پیٹھ کیے، کھڑی دکھائی دی، سیاہ بالوں والی۔

یہ عجیب لمحہ ہوتا ہے، ان کرداروں کو تخلیق کرنے کا لمحہ جو اس لمحے تک وجود نہ رکھتے تھے۔ اس کے بعد جو کچھ پیش آتا ہے وہ ناہموار، غیر یقینی، یہاں تک کہ واہمہ انگیز (hallucinatory) عمل ہوتا ہے، اگرچہ بعض اوقات یہ کسی بے قابو سیلاب کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ مصنف کی حیثیت

Scanned with CamScanner

عجیب ہوتی ہے۔ ایک لحاظ سے کردار اسے خوش آمدید نہیں کہتے۔ کردار اس کی مزاحمت کرتے ہیں، اُن کے ساتھ رہنا آسان نہیں ہوتا، ان کی تعریف متعین کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ آپ ان پر حکم تو یقیناً نہیں چلا سکتے۔ ایک حد تک آپ ان کے ساتھ ایک ختم نہ ہونے والا کھیل کھیلتے ہیں، چوہے بلی کا کھیل، بلائنڈ مین بف، آنکھ مچولی۔ لیکن آخر کار آپ پاتے ہیں کہ آپ کے ہاتھوں میں گوشت پوست اور خون والے لوگ ہیں، جو اپنی مرضی اور اپنا انفرادی احساس رکھتے ہیں، جو ایسے اجزا کے جڑنے سے بنے ہیں جن کو بدلنا، من مانے طریقے سے برتنا، یا توڑنا مروڑنا آپ کے بس میں نہیں۔

چنانچہ فن میں زبان ایک انتہائی مبہم کارروائی ہے، کہیں دلدلی زمین، کہیں ترپال، کہیں منجمد تالاب جس کی اوپری تہہ آپ کے، مصنف کے، پیروں تلے کسی بھی وقت ٹوٹ سکتی ہے۔

لیکن جیسا کہ میں نے کہا، سچ کی تلاش کبھی رک نہیں سکتی۔ اسے نہ ملتوی کیا جا سکتا ہے اور نہ موخر۔ اس کا، وہیں، اسی مقام پر سامنا کرنا ہوتا ہے۔

سیاسی تھیٹر کے مسائل بالکل دوسری نوعیت کے ہوتے ہیں۔ خطبے دینے سے ہر قیمت پر احتراز کرنا ہوتا ہے۔ معروضیت لازم ہے۔ کرداروں کو اپنی ہوا میں سانس لینے دینا ضروری ہے۔ مصنف اپنے ذوق یا مزاج یا تعصب کی تسکین کی خاطر انھیں محدود یا محصور نہیں کر سکتا۔ اسے تیار رہنا ہوتا ہے کہ مختلف زاویوں سے، ہر قسم کے اور بلا جھجک تناظر سے ان کرداروں تک رسائی پا سکے، شاید کبھی کبھی انھیں بے خبری کے عالم میں پکڑ بھی سکے، لیکن اس کے باوجود انھیں ان کی مرضی کی سمت میں حرکت کرنے دے۔ یہ کارروائی ہمیشہ کامیاب نہیں ہوتی۔ اور جہاں تک سیاسی طنز کا تعلق ہے، وہ ان میں سے کسی اصول کی پابند نہیں ہوتی، بلکہ وہ اس کا ٹھیک الٹ کرتی ہے، اور وہی اس کا درست منصب ہے۔

اپنے کھیل The Birthday Party میں، میرا خیال ہے، میں امکانات کے ایک گھنے جنگل میں بہت سے متبادلوں کو بروئے کار آنے دیتا ہوں، اور آخر کار کمزور کو تابع کرنے کے فعل پر توجہ مرکوز کر دیتا ہوں۔

پہاڑی زبان اس پیچیدہ عمل کی متحمل ہونے کا سوانگ نہیں بھرتی۔ یہ سفاک، اکھڑی اکھڑی اور بھدی رہتی ہے۔ لیکن کھیل میں موجود سپاہی اس کے استعمال سے کچھ مزہ یقیناً اٹھاتے ہیں۔ ان

Scanned with CamScanner

میں سے ایک کبھی کبھی بھول جاتا ہے کہ تشدد کرنے والے آسانی سے اکتا جاتے ہیں۔انھیں اپنا حوصلہ بلند رکھنے کے لیے تھوڑا بہت ہنسنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ بلاشبہ اس بات کی تصدیق بغداد کے قید خانے ابوغریب میں ہونے والے واقعات سے ہو چکی ہے۔ پہاڑی زبان محض بیس منٹ چلتی ہے، لیکن یہ گھنٹوں، بلکہ متواتر جاری رہ سکتی ہے، اور وہی نمونہ گھنٹوں کے عمل میں خود کو بار بار دہرا سکتا ہے۔

اس کے برعکس Ashes to Ashes، مجھے پانی کی تہہ میں وقوع پذیر ہوتا معلوم ہوتا ہے۔ ایک ڈوبتی ہوئی عورت، اپنا بازو لہروں میں سے اوپر اٹھائے، نظروں سے اوجھل ہوتی ہوئی، دوسروں تک پہنچ پانے کی کوشش کرتی، مگر وہاں، پانی کے اندر یا باہر، کسی کو نہ پاتی ہوئی، صرف سایوں، عکسوں کو تیرتا دیکھتی ہوئی؛ عورت، ایک غرقاب ہوتے منظر میں گمشدہ شبیہ: ایک عورت، اس ناامیدی سے فرار ہونے کے ناقابل جو دوسرے لوگوں کی ناامیدی معلوم ہوتی ہے۔

لیکن جیسے وہ لوگ مرے، اسی طرح اِسے بھی مرنا ہے۔

سیاسی زبان، جیسا کہ اسے سیاست کار استعمال کرتے ہیں، ایسے کسی خطے میں داخل نہیں ہوتی، کیونکہ ان سیاست کاروں میں سے بیشتر، ہمیں دستیاب شہادتوں کی رو سے، سچ سے نہیں بلکہ اقتدار سے اور اس اقتدار کو برقرار رکھنے سے سروکار رکھتے ہیں۔ اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ عوام بے خبر رہیں، کہ وہ سچ سے، حتیٰ کہ خود اپنی زندگیوں کے سچ سے بھی، بے خبری کے عالم میں رہیں۔ چنانچہ جو شے ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے وہ بہت سے جھوٹ جوڑ کر بنائی گئی ہے، اور ہم اسی پر جیتے ہیں۔

جیسا کہ یہاں موجود ہر ایک شخص جانتا ہے، عراق پر حملے کا جواز یہ تھا کہ صدام حسین کے قبضے میں وسیع تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کی ایک نہایت خطرناک تعداد موجود تھی، جن میں سے بعض کو 45 منٹ کے اندر اندر فائر کیا جا سکتا تھا اور دہشت ناک غارت گری پھیلائی جا سکتی تھی۔ ہمیں یقین دلایا گیا کہ یہ سچ ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ عراق کا القاعدہ سے تعلق ہے اور وہ 11 ستمبر 2001 کو نیویارک میں ہونے والی سفاکی کی ذمے داری میں شریک ہے۔ ہمیں یقین دلایا گیا کہ یہ سچ ہے۔ یہ سچ نہیں تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ عراق دنیا کی سلامتی کے لیے خطرہ ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہ سچ ہے۔ یہ سچ

نہیں تھا۔

سچ اس سے بالکل مختلف چیز ہے۔ سچ کا تعلق اس سے ہے کہ امریکہ دنیا میں اپنے کردار کو کس طرح سمجھتا ہے اور اس کی تجسیم کے لیے کیا طریقہ اختیار کرتا ہے۔

میں حال پر واپس آنے سے پہلے ماضی قریب پر ایک نظر ڈالنا چاہتا ہوں، جس سے میری مراد دوسری عالمی جنگ کے خاتمے کے بعد سے اب تک کی امریکی خارجہ پالیسی سے ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ ہمارا فرض ہے کہ اس عرصے پر، خواہ بہت محدود طریقے سے ہی سہی، کسی نہ کسی طرح ضرور غور کریں۔ اور اس وقت اس پر محدود غور کرنا ہی ممکن ہے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ جنگ کے بعد کے عرصے میں سوویت یونین اور پورے مشرقی یوروپ میں کیا ہوا: منظم بربریت، وسیع پیمانے پر سفاکیاں، آزاد خیالی پر بے رحم جبر۔ یہ سب کچھ تفصیلی دستاویزات کی شکل میں مرتب کردہ اور تصدیق شدہ ہے۔

لیکن میں یہاں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسی عرصے میں امریکہ نے جو جرائم کیے ان کو محض سرسری انداز سے ریکارڈ کیا گیا ہے، انھیں دستاویزی صورت میں مرتب کرنے، تسلیم کرنے، جرم کے طور پر شناخت کیے جانے کا قطعی سوال نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس طرف توجہ کی جانی چاہیے، اور یہ بھی سمجھتا ہوں کہ سچ، دنیا اس وقت جہاں کھڑی ہے، اس پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ اگرچہ سوویت یونین کے وجود کے باعث امریکہ پر کسی قدر قیود عائد رہیں، لیکن دنیا بھر میں اس کے افعال نے یہ بات قطعی واضح کر دی کہ وہ اس نتیجے پر پہنچ چکا ہے کہ اسے جو کچھ اس کے جی میں آئے وہ کر ڈالنے کی کھلی آزادی ہے۔

کسی خودمختار ریاست پر براہ راست حملہ کرنا درحقیقت امریکہ کا پسندیدہ طریقہ کبھی نہیں رہا ہے۔ بیشتر صورتوں میں اس نے اس طریقے کو ترجیح دی ہے جسے وہ ''کم شدت کے تنازعے'' کا نام دیتا ہے۔ کم شدت کے تنازعے کا مطلب یہ ہے کہ ہزاروں لوگ مریں لیکن اس سے کہیں زیادہ سست رفتاری سے جیسا ان پر یکبارگی بم گرا دینے سے ممکن ہو سکتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ کسی ملک کے قلب کو مریض کر دیں، کہ آپ اس کے بدن میں ایک زہریلی بوحوتری کا بیج بو دیں اور پھر گینگرین کو پھلتے پھولتے دیکھتے رہیں۔ جب عوام کو دبا لیا جائے — یا مار مار کر ہلاک کر دیا جائے — جو ایک ہی بات ہے — اور آپ کے اپنے دوست، فوج اور عظیم کارپوریشنیں، اطمینان سے اقتدار پر قابض

ہوں، تب آپ کیمرے کے سامنے جا کر کہتے ہیں کہ جمہوریت کی فتح ہوئی ہے۔ جن برسوں کا میں ذکر کر رہا ہوں ان کے دوران امریکی خارجہ پالیسی میں یہ معمول کی بات تھی۔

نکاراگوا کا المیہ ایک نہایت اہم مثال ہے۔ میں نے یہاں اس کے ذکر کا انتخاب اس لیے کیا ہے کہ یہ دنیا میں اپنے کردار کی بابت امریکہ کے نقطۂ نظر کی، اُس وقت بھی اور آج بھی، ایک بھرپور مثال ہے۔

1980 کی دہائی کے آخری برسوں میں میں لندن کے امریکی سفارت خانے کے ایک اجلاس میں موجود تھا۔

امریکی کانگریس اس بات کا فیصلہ کرنے ہی والی تھی کہ ریاست نکاراگوا کے خلاف مہم چلانے والے باغیوں (Contras) کو مزید رقم دی جائے یا نہیں۔ میں نکاراگوا کی طرف سے بات کرنے والے ایک وفد کا رکن تھا لیکن اس وفد کا سب سے اہم رکن جان مٹکاف (John Metcalf) نامی ایک پادری تھا۔ امریکی ادارے کا سربراہ ریمنڈ سیٹز (Raymond Seitz) تھا جو اُس وقت امریکی سفیر کا نائب تھا اور بعد میں خود سفیر بنا۔ فادر مٹکاف نے کہا، ''سر، میں شمالی نکاراگوا میں ایک پیرش کا نگران ہوں۔ میرے پیرش کے ارکان نے ایک اسکول، ایک مرکزِ صحت اور ایک ثقافتی مرکز قائم کیا ہے۔ ہم امن سے رہتے آئے ہیں۔ چند ماہ پہلے ایک کونٹرا دستے نے پیرش پر حملہ کیا۔ انھوں نے سب کچھ تباہ کر ڈالا: اسکول، مرکزِ صحت، ثقافتی مرکز۔ انھوں نے انتہائی بہیمیت کے ساتھ نرسوں اور استانیوں کو ریپ کیا، ڈاکٹروں کے گلے کاٹے۔ انھوں نے وحشیوں کا سا برتاؤ کیا۔ براہ کرم یہ مطالبہ کیجیے کہ امریکی حکومت اس صدمہ انگیز دہشت گرد کارروائی کی حمایت ترک کر دے۔''

ریمنڈ سیٹز ایک معقول، ذمے دار اور نہایت مہذب شخص ہونے کی عمدہ شہرت رکھتا تھا۔ سفارتی حلقوں میں اس کا بہت احترام کیا جاتا تھا۔ وہ سنتا رہا، پھر کچھ توقف کر کے کسی قدر گمبھیر لہجے میں بولا۔ ''فادر،'' اس نے کہا، ''میں آپ کو ایک بات بتاتا ہوں۔ جنگ میں بے قصور لوگ ہمیشہ تکلیف اٹھاتے ہیں۔'' اس کے بعد ایک منجمد خاموشی تھی۔ ہم اس کی طرف تکتے رہے۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

بے قصور لوگ، بلاشبہ، ہمیشہ نقصان اٹھاتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

آخرکار کسی نے کہا، ''لیکن اس معاملے میں 'بے قصور لوگ' ایک ہولناک سفا کی کا شکار ہوئے ہیں جسے آپ کی حکومت کی سرپرستی حاصل ہے، اور اس قسم کی دیگر سفا کیوں کو بھی۔ اگر کانگریس نے کونٹرا باغیوں کو مزید رقم دی تو اس قسم کی مزید سفا کیاں پیش آئیں گی۔ کیا ایسا نہیں ہے؟ چنانچہ کیا آپ کی حکومت ایک خود مختار ریاست کے شہریوں کے خلاف قتل اور غارت گری کے افعال کو مدد فراہم کرنے کی مجرم نہیں ہے؟''

سیٹز کے سکون میں ذرا بھی خلل نہ پڑا۔ ''میں اس سے اتفاق نہیں کرتا کہ پیش کیے گئے حقائق آپ کی باتوں کی تصدیق کرتے ہیں،'' اس نے کہا۔

جس وقت ہم سفارت خانے سے باہر نکل رہے تھے، ایک امریکی مشیر نے مجھے بتایا کہ وہ میرے کھیل پسند کرتا ہے۔ میں نے جواب نہیں دیا۔

میں آپ کو یاد دلاؤں کہ اس موقعے پر صدر ریگن نے یہ بیان دیا تھا: ''کونٹرا ہمارے فاؤنڈنگ فادرز (founding fathers) کے مساوی اخلاقی مقام رکھتے ہیں۔''

امریکہ نے نکاراگوا میں سوموزا کی بہیمانہ آمریت کو چالیس سال تک حمایت فراہم کی تھی۔ نکاراگوا کے عوام نے 1979 میں، ساندینستا (Sandinistas) کی قیادت میں، اس کی حکومت کا تختہ الٹ دیا، جو ایک دھڑکتا ہوا عوامی انقلاب تھا۔

ساندینستا بے عیب نہیں تھے۔ ان میں رعونت کی اپنی مقدار موجود تھی اور ان کے سیاسی فلسفے میں کئی متضاد عناصر پائے جاتے تھے۔ لیکن وہ ذہین، معقول اور تہذیب یافتہ تھے۔ انھوں نے ایک پائیدار، شائستہ اور کثیر خیال معاشرہ قائم کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ سزائے موت ختم کر دی گئی تھی۔ مفلسی کے شکار لاکھوں کسانوں کو مُردوں کے زمرے سے واپس نکال لیا گیا تھا۔ ایک لاکھ سے زیادہ خاندانوں کو زمین کی ملکیت دے دی گئی تھی۔ دو ہزار اسکول قائم کیے گئے تھے۔ خواندگی کی ایک غیر معمولی مہم نے ملک میں ناخواندگی کو ساتویں حصے سے بھی کم سطح پر پہنچا دیا تھا۔ مفت تعلیم اور مفت علاج کی سہولت رائج کی گئی تھی۔ شیر خوار بچوں کی موت کی شرح ایک تہائی گھٹا لی گئی تھی۔ پولیو کا خاتمہ کر دیا گیا تھا۔

امریکہ نے ان حاصلات کو مارکسی/لینِنی باغیانہ کارروائی کہہ کر ان کی مذمت کی۔ امریکی

Scanned with CamScanner

حکومت کے نزدیک یہ ایک خطرناک مثال قائم کی جا رہی تھی۔ اگر نکاراگوا کو سماجی اور معاشی انصاف کی بنیادی روایت قائم کرنے دی گئی، اگر اسے علاج اور تعلیم کے معیارات کو بلند کرنے اور سماجی اتحاد اور قومی عزت نفس حاصل کرنے کی اجازت دی گئی، تو پڑوسی ملک بھی یہی سوال اٹھائیں گے اور یہی سب کام کریں گے۔ اس زمانے میں بلاشبہ ال سلوادور میں حالات کے جمود کے خلاف سخت مزاحمت جاری تھی۔

میں نے ابھی بہت سے جھوٹ جوڑ کر بنائی گئی شے کا ذکر کیا تھا جو ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ صدر ریگن نکاراگوا کا ذکر عموماً ایک ''آمرانہ زندان'' کے لقب سے کرتا تھا۔ اسی لقب کو ذرائع ابلاغ نے عمومی سطح پر، اور یقیناً برطانوی حکومت نے بھی، ایک درست اور منصفانہ بیان کے طور پر اپنا لیا تھا۔ لیکن درحقیقت ساندینستا حکومت کے خلاف قاتل جتھوں کی موجودگی کا کوئی ریکارڈ موجود نہ تھا۔ اذیت رسانی کا کوئی ریکارڈ موجود نہ تھا۔ کسی منظم یا سرکاری فوجی بہیمیت کا کوئی ریکارڈ موجود نہ تھا۔ نکاراگوا میں پادریوں کو کبھی قتل نہیں کیا گیا تھا۔ درحقیقت تین پادری، دو جیسوئٹ اور ایک میری نول مشنری، حکومت کا حصہ تھے۔ آمرانہ زندان دراصل سرحد کے پار ال سلوادور اور گواتے مالا میں تھے۔ امریکہ نے 1954 میں گواتے مالا کی جمہوری منتخب حکومت کا خاتمہ کر دیا تھا، اور تخمینہ لگایا گیا تھا کہ دو لاکھ سے زیادہ افراد اس کے بعد آنے والے کئی فوجی آمریتوں کا شکار ہو کر ہلاک ہوئے تھے۔

دنیا کے چھ ممتاز ترین جیسوئٹ افراد کو 1989 میں سان سلوادور کی سنٹرل امریکن یونیورسٹی میں اٹکاٹل رجمنٹ نے، جس کی تربیت فورٹ بیننگ، جارجیا، امریکہ، میں ہوئی تھی، درندگی سے ہلاک کیا تھا۔ اُس انتہائی جرأت مند شخص آرچ بشپ رومیرو کو اس وقت قتل کیا گیا جب وہ گرجا گھر میں وعظ کہہ رہا تھا۔ تخمینے کے مطابق پچھتر ہزار لوگ ہلاک ہوئے۔ کیوں ہلاک ہوئے؟ اس لیے ہلاک ہوئے کہ ان کا اعتقاد تھا کہ ایک بہتر زندگی ممکن ہے اور حاصل کی جانی چاہیے۔ اس اعتقاد نے انھیں فوری طور پر کمیونسٹ ٹھہرا دیا۔ وہ ہلاک کر دیے گئے کیونکہ انھوں نے جامد حالات، غریبی، بیماری، ذلت اور جبر کے بے انت پھیلاؤ پر سوال اٹھانے کی جسارت کی تھی، جو ان کا پیدائشی حق تھا۔

آخرکار امریکہ نے ساندینستا حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اس میں کچھ سال لگے اور خاصی مزاحمت

Scanned with CamScanner

ہوئی، لیکن متواتر اقتصادی گھیراؤ اور تیس ہزار لوگوں کی ہلاکت نے انجام کار نکاراگوا کے عوام کی ہمت کو پست کر ڈالا۔ وہ ایک بار پھر تھکن اور غریبی کی زد میں آ گئے۔ کیسینو ملک میں لوٹ آئے۔ مفت علاج اور مفت تعلیم ختم ہو گئی۔ بگ بزنس پوری طاقت سے عود کر آیا۔ ''جمہوریت'' کی فتح ہو گئی۔

لیکن یہ ''پالیسی'' صرف وسطی امریکہ تک محدود نہیں تھی۔ اس پر پوری دنیا میں عمل کیا گیا۔ یہ کبھی نہ ختم ہونے والی شے تھی۔ اور لگتا یوں ہے گویا اس کا وجود کبھی رہا ہی نہیں۔

امریکہ نے دوسری عالمی جنگ کے بعد کے عرصے میں دنیا کی ہر دائیں بازو کی فوجی آمریت کو حمایت فراہم کی اور ان میں سے بہت سی آمریتوں کو خود قائم کیا۔ میں انڈونیشیا، یونان، یوروگوے، برازیل، پاراگوے، ہائیتی، ترکی، فلپائن، گواتے مالا، ال سلواڈور اور، بے شک، چیلے کا ذکر کر رہا ہوں۔ امریکہ نے 1973 میں چیلے میں جو ہولناکیاں نازل کیں ان کی کبھی تلافی نہیں ہو سکتی اور ان کو کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔

ان ملکوں میں لاکھوں ہلاکتیں ہوئیں۔ لیکن کیا یہ واقعی ہوئیں؟ اور کیا تمام صورتوں میں اس کی ذمے داری امریکی خارجہ پالیسی پر عائد ہوتی ہے؟ جواب یہ ہے کہ ہاں، یہ ہلاکتیں واقعی ہوئیں اور ان کی ذمے داری امریکی خارجہ پالیسی پر عائد ہوتی ہے۔ لیکن آپ کو اس کا علم نہیں ہوگا۔

یہ کبھی نہیں ہوا۔ کچھ بھی کبھی نہیں ہوا۔ اُس وقت بھی جب یہ ہو رہا تھا، یہ نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ اس سے کسی کو سروکار نہ تھا۔ امریکہ کے جرائم منظم، متواتر، پُرکینہ، اور کسی پچھتاوے سے عاری ہیں، لیکن بہت کم لوگوں نے ان کے متعلق واقعی بات کی ہے۔ آپ امریکہ کو اس کی داد دینے پر مجبور ہوں گے۔ اس نے دنیا بھر میں اقتدار کو نہایت ماہرانہ چابکدستی سے استعمال کرتے ہوئے بھی، ہمہ گیر خیر کا اپنا بہروپ قائم رکھا ہے۔ یہ تنویم کا ایک عمدہ، یہاں تک کہ پُرلطف، اور نہایت کامیاب عمل ہے۔

میں آپ سے کہتا ہوں کہ امریکہ، کسی شک شبے کے بغیر، سڑک پر دکھایا جانے والا سب سے بڑا تماشا ہے۔ یہ سفاک، بے نیاز، پُرحقارت اور بے رحم چاہے ہو، لیکن یہ بڑی چالاکی کا حامل ہے۔ یہ ایک سیلز مین کی طرح ہے جو اپنے بل پر باہر نکلا ہے اور اس کا سب سے زیادہ بکنے والا مال خود پرستی (self love) ہے۔ یہ ایک فاتح ہے۔ ہر امریکی صدر کو ٹیلی وژن پر یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے

Scanned with CamScanner

دیکھیے: ''دی امیریکن پیپل'' — امریکی عوام — جیسے اس جملے میں: ''میں امریکی عوام سے کہتا ہوں کہ یہ دعا کا اور امریکی عوام کے حقوق کا دفاع کرنے کا وقت ہے اور میں امریکی عوام سے مطالبہ کرتا ہوں کہ وہ اپنے صدر پر اس اقدام کے سلسلے میں اعتماد کریں جو وہ امریکی عوام کی جانب سے اٹھانے والا ہے۔''

یہ ایک چکا چوند کردینے والی حکمت عملی ہے۔ یہاں زبان کو دراصل اس مقصد سے استعمال کیا جا رہا ہے کہ خیالات قریب نہ پھٹکنے پائیں۔ ''امریکی عوام'' کے الفاظ تسلی کا ایک سچ مچ پُرتعیش تکیہ فراہم کرتے ہیں۔ آپ کو سوچنے کی ضرورت نہیں۔ بس تکیے پر ٹیک لگائیے۔ یہ تکیہ چاہے آپ کی ذہانت اور آپ کی تنقیدی صلاحیتوں کا دم گھونٹ رہا ہو، لیکن یہ آرام دہ بہت ہے۔ بے شک اس کا اطلاق ان چار کروڑ امریکیوں پر نہیں ہوتا جو غریبی کی لکیر کے نیچے رہ رہے ہیں اور نہ ان بیس لاکھ مردوں اور عورتوں پر ہوتا ہے جو امریکہ کے طول و عرض میں پھیلے قید خانوں کے گلاگ میں بند ہیں۔

امریکہ کو اب کم شدت والے تنازعوں سے دلچسپی نہیں رہی۔ اب اسے رازداری، یہاں تک کہ گھنّے پن میں بھی کوئی فائدہ دکھائی نہیں دیتا۔ وہ اپنے پتے کسی خوف یا رعایت کے بغیر میز پر رکھ دیتا ہے۔ وہ اقوام متحدہ، بین الاقوامی قانون یا تنقیدی اختلاف رائے کو، جو اسے بے طاقت اور غیر متعلق معلوم ہوتا ہے، دو کوڑی کا بھی نہیں گردانتا۔ اور اس کی ایک اپنی پالتو، میں میں کرتی، بکری ہے جو اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہے، قابل رحم اور لدّھڑ برطانیہ عظمیٰ۔

ہمارے اخلاقی احساس کو کیا ہوا؟ کیا ہمارے پاس ایسی کوئی شے تھی بھی؟ ان لفظوں کا کیا مطلب ہے؟ کیا ان سے مراد وہ اصطلاح ہے جسے آج کل شاذونادر ہی استعمال کیا جاتا ہے — ضمیر؟ ضمیر جس کا تعلق نہ صرف ہمارے اپنے افعال سے ہو بلکہ دوسروں کے افعال میں ہماری مشترک ذمے داری سے بھی؟ کیا یہ سب کچھ مر چکا ہے؟ گوانتاناموبے پر نظر ڈالیے۔ سیکڑوں لوگ کسی الزام کے بغیر تین برس سے زیادہ عرصے سے قید ہیں، کسی قسم کی قانونی نمائندگی یا ضابطے کی کارروائی سے محروم، تکنیکی طور پر ہمیشہ کے لیے قید۔ اس قطعی ناجائز ساختے کو جنیوا کنونشن کی کھلی خلاف ورزی کرتے ہوئے قائم رکھا جا رہا ہے۔ جس شے کو ''بین الاقوامی برادری'' کہا جاتا ہے وہ اسے نہ صرف برداشت کر رہی ہے بلکہ اس کے بارے میں سوچتی تک نہیں۔ اس مجرمانہ زیادتی کا ارتکاب ایک ایسا ملک کر

رہا ہے جو خود کو ''آزاد دنیا کا رہنما'' قرار دیتا ہے۔ کیا ہم گوئنتانامو بے کے باشندوں کے بارے میں سوچتے ہیں؟ ذرائع ابلاغ ان کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ ان کا ذکر کبھی کبھی آجاتا ہے — صفحہ 6 پر ایک چھوٹی سی خبر کے طور پر۔ انھیں ایک ایسے نومینز لینڈ میں ڈال دیا گیا ہے جہاں سے ممکن ہے وہ کبھی واپس نہ آسکیں۔ اس وقت ان میں سے بہت سے، کئی برطانوی شہریوں سمیت، بھوک ہڑتال پر ہیں، انھیں زبردستی کھلایا جاتا ہے۔ زبردستی خوراک دینے کے اس عمل میں کسی طرح کے تکلفات نہیں برتے جاتے۔ کوئی خواب آور یا بے ہوشی کی دوا نہیں دی جاتی۔ بس آپ کی ناک اور حلق میں ایک ٹیوب داخل کر دی جاتی ہے۔ آپ خون کی الٹی کرتے ہیں۔ یہ اذیت رسانی ہے۔ برطانوی خارجہ سیکرٹری نے اس کے متعلق کیا کہا ہے؟ کچھ نہیں۔ برطانوی وزیراعظم نے اس کے متعلق کیا کہا ہے؟ کچھ نہیں۔ کیونکہ امریکہ نے کہہ دیا ہے: گوانتانامو بے میں ہمارے طرزِ عمل پر تنقید کرنا ایک غیر دوستانہ فعل ہوگا۔ چنانچہ بلیئر اپنی زبان بند رکھتا ہے۔

عراق پر حملہ ایک بدمعاشی کی کارروائی تھی، دیدہ دلیری سے کی گئی ریاستی دہشت گردی، جس سے بین الاقوامی قانون کی بابت مطلق حقارت ظاہر ہوتی تھی۔ یہ حملہ سلسلہ در سلسلہ جھوٹ کے انبار اور ذرائع ابلاغ کے ساتھ، اور ان کے ذریعے عام لوگوں کے ساتھ، سنگین فریب کاری کی بنیاد پر شروع کی جانے والی ایک بے اصول فوجی کارروائی تھی؛ ایک ایسی کارروائی جس کا مقصد مشرقِ وسطیٰ پر امریکہ کے فوجی اور اقتصادی کنٹرول کو مستحکم کرنا تھا، اور جس نے — آخری حربے کے طور پر — جب سارے دوسرے جواز خود اپنا جواز پیش کرنے میں ناکام ہو چکے تھے — خود کو آزادی دلانے کے عمل کے بہروپ میں پیش کیا۔ فوجی طاقت کا ایک زبردست استعمال ہزاروں ہزار بے قصور لوگوں کی ہلاکت اور اذیت کے لیے ذمے دار ہے۔

ہم نے عراقی عوام پر تشدد، کلسٹر بم، ڈپلیٹڈ یورینیم، اندھادھند قتل کی بے شمار وارداتیں، بربادی، ذلت اور موت نازل کی ہے اور اسے ''مشرقِ وسطیٰ میں آزادی اور جمہوریت لانے'' کا نام دیتے ہیں۔

کتنے لوگوں کو ہلاک کرنے کے بعد کوئی شخص قتلِ عام کا مرتکب اور جنگی مجرم کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے؟ ایک لاکھ؟ یہ تعداد بھی، میرے خیال میں، کافی سے زیادہ ہوتی۔ چنانچہ یہ منصفانہ بات ہے

کہ بش اور بلیئر کو بین الاقوامی فوجداری عدالت انصاف کے روبرو حاضر کیا جائے۔ لیکن بش چالاک ثابت ہوا ہے۔ اس نے بین الاقوامی فوجداری عدالت انصاف کی توثیق ہی نہیں کی۔ چنانچہ اگر کسی امریکی سپاہی نے، یا کسی سیاست کار نے ہی، خود کو کٹہرے میں پایا تو بش نے خبردار کر دیا ہے کہ وہ اپنے میرین سپاہی بھیجے گا۔ لیکن ٹونی بلیئر عدالت انصاف کی توثیق کر چکا ہے چنانچہ مقدمہ چلائے جانے کے لیے دستیاب ہے۔ اگر عدالت کو دلچسپی ہو تو ہم اس کا پتا بتا سکتے ہیں۔ پتا ہے: 10، ڈاؤننگ اسٹریٹ، لندن۔

اس تناظر میں موت بے معنی ہو جاتی ہے۔ بش اور بلیئر دونوں نے موت کو دور، پچھلے چولھے پر رکھ دیا ہے۔ عراق میں بغاوت کے سر اٹھانے سے پہلے کم از کم ایک لاکھ عراقی امریکی بموں اور میزائلوں سے ہلاک کیے جا چکے تھے۔ ان لوگوں کی کوئی ہستی نہیں۔ ان کی موت کا کوئی وجود نہیں۔ وہ خالی ہیں۔ انھیں مُردوں کے طور پر گنا بھی نہیں گیا۔ ''ہم لاشیں گننے کا کام نہیں کرتے،'' امریکی جنرل ٹومی فرینکس کہتا ہے۔

حملے کے آغاز ہی میں برطانوی اخباروں کے صفحہ اول پر ٹونی بلیئر کا ایک فوٹوگراف شائع ہوا تھا جس میں وہ ایک ننھے عراقی بچے کا گال چوم رہا تھا۔ چند روز بعد، اندر کے کسی صفحے پر، ایک اور چار سالہ بچے کی تصویر اور خبر شائع ہوئی جس کے دونوں بازو نہیں رہے تھے۔ اس کے خاندان کو ایک میزائل نے اڑا دیا تھا۔ صرف وہی زندہ بچا تھا۔ ''مجھے میرے بازو کب واپس ملیں گے؟'' اس کا سوال تھا۔ اس خبر کو بس یہیں روک دیا گیا۔ آخر ٹونی بلیئر اسے اپنے بازوؤں میں تو اٹھائے ہوئے نہیں تھا، اور نہ ایک اور مسخ کردہ بچے کی لاش کو، اور نہ کسی اور خون آلود لاش کو۔ ایسا کرنے سے، جبکہ آپ ٹیلی وژن پر ایک مخلصانہ تقریر کر رہے ہوں، آپ کی قمیص اور ٹائی گندی ہو جاتی ہے۔

مارے جانے والے دو ہزار امریکی ایک شرمندگی کی چیز ہیں۔ انھیں اندھیرے میں ان کی قبروں تک لے جایا جاتا ہے۔ جنازے اوٹ میں ہوتے ہیں، خطرے کی زد سے باہر۔ زخمی ہونے والے اپنے بستروں میں پڑے سڑا کرتے ہیں، ان میں سے کچھ اپنی پوری بقیہ زندگی کے لیے۔ چنانچہ مارے جانے والے اور زخمی ہونے والے دونوں، الگ الگ قسم کی قبروں میں، گلتے سڑتے رہتے ہیں۔

پابلو نیرودا کی نظم ''میں چند چیزوں کی وضاحت کر رہا ہوں'' سے ایک اقتباس:

اور ایک صبح وہ سب کچھ جل رہا تھا
ایک صبح الاؤ
زمین سے لپک کر اٹھے
انسانوں کو بھسم کرتے ہوئے
اور اس کے بعد سے آگ،
اور بارود اس کے بعد سے،
اور اس کے بعد سے خون۔
بدمعاش اپنے طیاروں اور لنگروں کے ساتھ
بدمعاش اپنی انگشتریوں اور ریشمی جھالروں کے ساتھ
بدمعاش دعائیں تھوکتے سیاہ فام راہبوں کے ساتھ
آسمان سے اترے، بچوں کو ہلاک کرنے کے لیے
اور بچوں کا خون گلیوں میں بہنے لگا
بغیر کسی شور غل کے، بچوں کے خون کی طرح

گیدڑ جن سے گیدڑ نفرت کرتے ہیں
پتھر جنھیں خشک کانٹے دار جھاڑی چبا کر تھوک دیتی ہے
سانپ جن سے سانپوں کو بھی گھن آتی ہے

تمھارے روبہ رو میں نے دیکھا ہے خون
اسپین کا، ایک جوار کی طرح اٹھتا ہوا
غرور اور چاقوؤں کی ایک لہر میں

Scanned with CamScanner

تمھیں ڈبو دینے کے لیے

غدار جنرلو:
میرے مردہ گھر کو دیکھو،
ٹوٹے ہوئے اسپین کو دیکھو:
ہر مکان سے جلتی ہوئی دھات بہہ رہی ہے
پھولوں کی جگہ
اسپین کی ہر خالی جگہ سے
اسپین ابھرتا ہے
اور ہر مردہ بچے سے آنکھوں والی ایک رائفل
اور ہر جرم سے بندوق کی گولیاں جنم لیتی ہیں
جو ایک دن پہنچ جائیں گی
تمھارے دلوں کے ہدف تک۔

اور تم پوچھو گے: یہ شاعری بھلا کیوں
خوابوں اور پتیوں کی بات نہیں کرتی
اور اس آبائی سرزمین کے عظیم آتش فشانوں کی بات نہیں کرتی

آؤ اور گلیوں میں بہتے خون کو دیکھو
آؤ دیکھو
گلیوں میں بہتے خون کو
آؤ دیکھو خون کو
گلیوں میں بہتے ہوئے

میں یہ وضاحت کر دوں کہ نیرودا کی نظم کے اس اقتباس کے ذریعے میں جمہوریہ اسپین کا موازنہ صدام حسین کے عراق سے نہیں کر رہا ہوں۔ میں نیرودا کا اقتباس اس لیے پڑھ رہا ہوں کہ میں نے معاصر شاعری میں شہریوں پر بمباری کا اتنا طاقتور اور حساس بیان نہیں دیکھا۔

میں نے پہلے کہا ہے کہ امریکہ اب اپنے پتے میز پر رکھ دینے میں قطعی بے باک ہے۔ معاملہ یہی ہے۔ اس کی سرکاری طور پر اعلان کردہ پالیسی اب ان الفاظ بیان کی جاتی ہے: فل اسپیکٹرم ڈومینینس۔ یہ میری نہیں، ان کی اصطلاح ہے۔ اس کے معنی ہیں زمین، سمندر، ہوا اور خلا اور ان میں موجود تمام وسائل پر مکمل تصرف۔

امریکہ اب دنیا کے 132 ملکوں میں 702 فوجی تنصیبات پر قابض ہے، جس میں سویڈن بے شک ایک باعزت استثنیٰ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم یہ نہیں جانتے کہ امریکی ان تمام جگہوں تک کس طرح پہنچے، لیکن وہ پہنچ ضرور چکے ہیں۔

امریکہ کے پاس 8,000 فعال اور مکمل طور پر قابل استعمال نیوکلیئر وار ہیڈ ہیں۔ ان میں سے دو ہزار ایسے ہیں جو فوری استعمال کے لیے تیار ہیں، یعنی جنھیں 15 منٹ کے انتباہ پر چھوڑا جا سکتا ہے۔ وہ نیوکلیئر طاقت کے نئے نظام تیار کر رہا ہے جنھیں بنکر بسٹر کہا جاتا ہے۔ برطانوی، ہمیشہ تعاون پر آمادہ، اپنے نیوکلیئر میزائل ٹرائیڈنٹ کو تبدیل کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ میں سوچتا ہوں، وہ کسے ہدف بنانے والے ہیں؟ اسامہ بن لادن کو؟ آپ کو؟ مجھے؟ جو ڈوکس کو؟ چین کو؟ پیرس کو؟ کون جانتا ہے؟ جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ بچگانہ دیوانگی — نیوکلیئر ہتھیاروں کو اپنے پاس رکھنا اور ان کے استعمال کی دھمکی دینا — امریکی کے حالیہ سیاسی فلسفے کے عین قلب میں واقع ہے۔ ہمیں خود کو یاد دلانا چاہیے کہ امریکہ مستقل طور پر فوجی تیاری کی حالت میں ہے اور اپنی اس حالت میں نرمی لانے کا کوئی اشارہ نہیں دے رہا۔

خود امریکہ میں، اگر دسیوں لاکھ نہیں تو ہزاروں لوگ اپنی حکومت کے افعال سے واضح طور پر متنفر، شرمندہ اور غضب ناک ہیں، لیکن جیسے حالات اس وقت ہیں ان میں وہ لوگ کوئی مربوط سیاسی قوت نہیں ہیں — ابھی تک نہیں۔ لیکن وہ تشویش، غیر یقینی پن اور خوف جسے ہم امریکہ میں روز بروز

بڑھتا ہوا دیکھ رہے ہیں، اس جس کے کم ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

میں جانتا ہوں صدر بش کے پاس بہت سے باصلاحیت تقریر نگار ہیں لیکن میں اس کام کے لیے رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میں یہ مختصر خطاب تجویز کروں گا جو وہ ٹیلی وژن پر آ کر قوم کے سامنے کر سکتا ہے۔ میں اسے چہرے پر سنجیدگی لیے، بال سلیقے سے بنائے، متانت، دل جیتنے والے انداز، خلوص، اکثر لبھاؤنے پن اور کبھی کبھی ایک روکھی مسکراہٹ کے ساتھ، عجیب طور سے پرکشش، مردوں کے مرد کے طور پر تصور کرتا ہوں:

> "خدا خیر ہے۔ خدا بڑا ہے۔ خدا خیر ہے۔ میرا خدا خیر ہے۔ بن لادن کا خدا شر ہے۔ وہ ایک برا خدا ہے۔ صدام کا خدا برا تھا، گوکہ حقیقت میں اس کا کوئی خدا تھا ہی نہیں۔ وہ وحشی تھا۔ ہم وحشی نہیں ہیں۔ ہم لوگوں کے سر نہیں کاٹتے۔ ہم آزادی پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ خدا بھی رکھتا ہے۔ میں وحشی نہیں ہوں۔ میں ایک آزادی پسند جمہوریت کا منتخب قائد ہوں۔ ہمارا معاشرہ ہمدرد معاشرہ ہے۔ ہم ہمدردی کے ساتھ بجلی کی کرسی اور زہریلا انجکشن دیتے ہیں۔ ہم ایک عظیم قوم ہیں۔ میں آمر نہیں ہوں۔ وہ ہے۔ میں وحشی نہیں ہوں۔ اور وہ ہے۔ وہ سب ہیں۔ میرے پاس اخلاقی حاکمیت ہے۔ یہ مکا دیکھتے ہو؟ یہ میری اخلاقی حاکمیت ہے۔ اور اسے بھولنا مت۔"

ادیب کی زندگی نہایت مخدوش، تقریباً برہنہ سرگرمی ہوتی ہے۔ ہمیں اس پر آنسو بہانے کی ضرورت نہیں۔ ادیب اپنا راستہ چنتا ہے اور اس سے جڑا رہتا ہے۔ لیکن یہ بات سچ ہے کہ آپ ہر طرح کی ہواؤں کا سامنا کرتے ہیں، جن میں سے کچھ واقعی برفانی ہوتی ہیں۔ آپ اپنے بل پر نکلتے ہیں، خود کو خطروں میں ڈالتے ہیں۔ آپ کو کوئی پناہ گاہ، کوئی تحفظ مہیا نہیں ہوتا — جب تک آپ جھوٹ نہ بولیں — اور بلاشبہ جھوٹ بولنے کی صورت میں آپ اپنی پناہ گاہ تعمیر کر چکے ہوں گے اور کہا جا سکتا ہے کہ ایک سیاست کار بن چکے ہوں گے۔

آج شام میں نے موت کا کئی بار ذکر کیا ہے۔ اب میں خود اپنی نظم "موت" کا ایک اقتباس پڑھتا ہوں۔

Scanned with CamScanner

لاش کس جگہ ملی؟
لاش کسے ملی؟
جب ملی تو کیا لاش مر چکی تھی؟
لاش کیسے ملی؟

لاش کون تھی؟

باپ یا بیٹی یا بھائی کون تھا
یا چچا یا بہن یا ماں یا بیٹا
اس مردہ اور چھوڑ دی گئی لاش کا؟

کیا چھوڑے جاتے وقت لاش مر چکی تھی؟
کیا لاش کو چھوڑا گیا؟
کس نے چھوڑا اسے؟

کیا لاش ننگی تھی یا سفر کے لباس میں؟

کس شے نے تمھیں لاش کو مردہ قرار دینے پر آمادہ کیا؟
کیا تمھی نے لاش کو مردہ قرار دیا؟
تم لاش کو کتنی اچھی طرح جانتے تھے؟
تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ لاش مردہ ہے؟

Scanned with CamScanner

کیا تم نے لاش کو دھویا
کیا تم نے اس کی دونوں آنکھیں بند کیں
کیا تم نے لاش کو دفن کیا
کیا تم نے اسے چھوڑا ہوا رہنے دیا
کیا تم نے لاش کو چوما

جب ہم آئینے میں دیکھتے ہیں تو سوچتے ہیں کہ اس میں دکھائی دینے والا عکس بالکل درست ہے۔ لیکن ایک ملی میٹر اِدھر اُدھر سرکیں تو عکس بدل جاتا ہے۔ ہم دراصل عکسوں کے ایک کبھی نہ ختم ہونے والے سلسلے کو دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی کسی لکھنے والے کو آئینہ چور چور کرنا پڑتا ہے — کیونکہ جو سچ ہمیں گھور رہا ہے وہ آئینے کے دوسری طرف ہے۔

میرا اعتقاد ہے کہ بڑی رکاوٹوں کے باوجود، شہریوں کے طور پر، اپنی زندگیوں اور اپنے معاشروں کے سچ کی درست تعریف متعین کرنے کا غیر متزلزل اور پختہ ذہنی عزم ایک اہم ذمے داری ہے جو ہم سب پر عائد ہوتی ہے۔ درحقیقت یہ ایک فریضہ ہے۔

اگر یہ عزم ہماری سیاسی بصیرت میں اپنی تجسیم نہ کر سکے تو ہم اس شے کو بحال کرنے کی کوئی امید نہیں کر سکتے جسے ہم قریب قریب کھو چکے ہیں — انسان کا وقار۔

❋❋

"آج" اور "سٹی پریس" کی کتابیں یہاں دستیاب ہیں

فضلی سنز
میپل روڈ، اردو بازار
کراچی

ویلکم بک پورٹ
اردو بازار
کراچی

تھامس اینڈ تھامس
نزد صدر جی پی او
کراچی

سٹی بک پوائنٹ
نزد مقدس مسجد، اردو بازار
کراچی

دی سیکنڈ فلور
5/6-C، خیابانِ اتحاد
ڈیفنس فیز 7، کراچی

مکتبہ دانیال
عبداللہ ہارون روڈ، نزد جیمس ہوٹل
صدر، کراچی

سندھی لینگویج اتھارٹی
لطیف آباد
حیدرآباد

سندھی ادبی بورڈ بک اسٹال
تلک چاڑی
حیدرآباد

کریمی بک کارپوریشن
نزد چاندنی شاپنگ مال
حیدرآباد کینٹ

خالد بک ڈپو
درانی چوک
خانپور

کتاب نگر
حسن آرکیڈ
ملتان کینٹ

شمع بک اسٹال
بیرون بھوانہ بازار
فیصل آباد

ڈاکٹر ریاض مجید
D-288، پیپلز کالونی
فیصل آباد

کوپرا بک شاپ
70، شاہراہِ قائداعظم
لاہور

بک ہوم
بک اسٹریٹ، 46 مزنگ روڈ
لاہور

نگارشات
24، مزنگ روڈ
لاہور

مسٹر بکس
10- ڈی، سپر مارکیٹ
اسلام آباد

لندن بک کمپنی
کوہسار مارکیٹ،
F-6-3، اسلام آباد

قلات پبلشرز
رستم جی لین، جناح روڈ
کوئٹہ

مکران بک ہاؤس
ایئرپورٹ روڈ، نزد واشتی مارکیٹ
گوادر

Scanned with CamScanner

کچھ کھویا، کچھ پایا

رالف رسل کی خودنوشت سوانح کا دوسرا حصہ

1945 سے 1958 تک

(LOSSES, GAINS)

Part II

of the autobiography of Ralph Russell

1945-1958

مصنف:

رالف رسل

(بہ تعاون میرین مولٹینو)

مترجم:

ارجمند آرا

Scanned with CamScanner

حصہ دوم: طالبِ علمی کا زمانہ

7

مزگروری اور سوالیس

مجھے وہ رات اچھی طرح یاد ہے جب میں مسز مزگروف (Mrs. Musgrov) کے گھر قیام کی غرض سے پہنچا۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور میری پتلون اور ٹانگیں پانی میں تر بتر تھیں۔ مجھے خیال آیا کہ پتلون کو خشک کرنے کا آسان طریقہ یہ ہوگا کہ اس پر استری کر لی جائے۔ چنانچہ جب استری اور استری کرنے کا تختہ مجھے مل گیا تو میں نے اپنی پتلون اتاری اور جانگیا پہنے پہنے کھڑا ہوا استری کرنے لگا۔ یہ خیال میرے ذہن میں آیا ہی نہیں کہ میں کوئی خلافِ دستور کام کر رہا ہوں۔ ہم سب کمیونسٹ تھے اور میں نے خود ہی یہ مان لیا تھا کہ اگر ہم ان ریت رواجوں کو نہ مانیں جو عام لوگ مانتے ہیں تو یہ کسی کے لیے پریشانی کی بات نہ ہوگی۔ میرے رویے سے مسز مزگروف اور ان کی اٹھارہ سالہ بیٹی مولی (Molly) خاصی محظوظ ہوئیں جس کی میں نے کچھ پروا نہ کی۔

پہلے ہی دن مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ اس گھر میں، جس کو میں نے اپنے دل میں 'مزگروری' (Musgrovery) کہنا شروع کر دیا تھا، میری زندگی خوب لطف سے گزرے گی۔ یہاں ایک تو میں ہی کمیونسٹ تھا، مکان مالکن بھی پرولتاری کمیونسٹ تھی اور اس پر مستزاد پرولتاری کرایہ داروں کا ایک گروہ تھا۔ یہ سب اس طبقے کے اراکین تھے (حالانکہ ان کا طبقاتی شعور کچھ خاص گہرا نہ تھا) جس کا مقدر دنیا کو بدلنا تھا — وہ بھی (کومنٹرن کے ایک اہم رکن پائک (Pieck) کے الفاظ میں)

Scanned with CamScanner

'پچاس برس کی خاصی قلیل مدت میں' — اس میں بھی تب سے گیارہ برس بیت چکے تھے جب 1935 کی ساتویں عالمی کانگریس میں پیش کردہ اپنی رپورٹ میں اس نے یہ بات کہی تھی۔

یہ خاصا بڑا مکان تھا، بھرا پُرا۔ پہلی منزل کے دو کمروں میں مسز مزگروف کے بیٹے فلپ (Philip) کا خاندان رہتا تھا۔ جنگ کے زمانے میں وہ بحری فوج میں تھا اور بعد میں بھی اس نے اسی ملازمت میں رہنے کا فیصلہ کیا، چنانچہ اس سے ہماری ملاقات کبھی کبھار ہی ہوتی تھی۔ اس کی بیوی ڈوروتھی (Dorothy) اور اس کے دو چھوٹے چھوٹے بچوں سے بھی اتنی ہی کم ملاقات ہوتی کیونکہ ان کا چولھا الگ تھا۔ کرایہ دار آتے جاتے رہتے تھے۔ اسکاچ، آئرش، کیریبی اور ہندوستانی۔ سبھی سے میری اچھی ملاقاتیں رہتیں لیکن ان میں مجھے سب سے زیادہ پسند ایک اسکاچ تھا جس کا نام جارج ہٹن (George Hutton) تھا۔ اسی سے میں نے یہ دعا سیکھی تھی:

Some have meat that can not eat
And some lack meat that want it.
But we have meat and we can eat
And so the Lord be thankit.

(کچھ لوگوں کے پاس گوشت ہوتا ہے لیکن کھا نہیں سکتے/ کچھ کے پاس گوشت نہیں ہوتا لیکن وہ کھانا چاہتے ہیں/ لیکن ہمارے پاس گوشت بھی ہے اور ہم کھا بھی سکتے ہیں/ اس لیے آؤ خدا کا شکر ادا کریں)

ہم سب لوگ، اور مولی بھی، ایک بڑی سی میز کے گرد کھانا کھاتے تھے اور مسز مزگروف ہم لوگوں کو بے تحاشا کھلاتیں۔ میں دم سادھے اس آئرش کو دیکھتا جو اپنی پلیٹ میں آلوؤں کے ڈھیر لگا لیتا۔ مسز مزگروف کے پیش کیے ہوئے دوسرے کھانوں سے اسے کوئی دلچسپی نہ ہوتی تھی۔ میں حیرت سے سوچتا، اتنا کھانا میں کیونکر کھا سکوں گا۔ لیکن جلد ہی میں اتنا کھانا کھانے کا عادی ہوگیا — جس پر میں بعد میں پچھتایا بھی کیونکہ اس عادت سے نجات پانا بعد میں میرے لیے مشکل ہوگیا۔

مزگروو ری کے مکینوں میں طالب علم میں ہی تھا، اور وہاں کے کمرے مطالعے کے لیے مناسب نہیں تھے۔ اپنی ضرورت کے لحاظ سے میں نے ایک میز خریدی جو بس اتنی چوڑی تھی کہ اس پر ایک کتاب اور اس کے ساتھ لغات رکھی جاسکیں، اور لمبی اتنی کہ پڑھنے سے متعلق دوسری ضروری

Scanned with CamScanner

چیزیں رکھی جاسکیں۔ اگلا کام میں نے یہ کیا کہ ہوم سے اپنی سائیکل منگوائی۔ سائیکل میرے پاس اسکول کے زمانے سے ہی تھی — آٹھ میل دور اسکول اسی سے آتا جاتا تھا، فوج میں بھرتی کے لیے بلاوا آنے تک یہ میرے پاس تھی۔ میں سائیکل خوب استعمال کرتا تھا، یہاں تک کہ چھٹیوں میں لاکٹن (Loughton) میں واقع اپنے گھر سے یارک شائر بھی سائیکل ہی سے چلا جاتا تھا جس کے لیے مجھے ایک دن میں دوسومیل تک چلانا پڑتا تھا۔ بعد میں یارک شائر سے کیمبرج بھی سائیکل ہی سے جاتا تھا۔ چنانچہ اب میں نے سواس جانے کے لیے بھی سائیکل ہی استعمال کرنی شروع کی لیکن جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ راستے میں اکثر کانچ کے ٹکڑے پڑے ہوتے تھے جس کے سبب سائیکل میں اکثر پنکچر ہونے لگا۔ جلد ہی میں نے اس کا استعمال ترک کر دیا اور پبلک ٹرانسپورٹ سے اپنا سفر طے کرنے لگا — شیفرڈز بش (Shepherd's Bush) انڈر گراونڈ اسٹیشن تک کے لیے پہلے بس پر سوار ہوتا، وہاں سے ٹرین لے کر ہابرن (Holborn) یا ٹوٹنہم کورٹ روڈ (Tottenham Court Road) پہنچتا اور وہاں سے پیدل سواس جاتا۔ اس میں تقریباً ایک گھنٹہ لگتا تھا۔ یہ سائیکل، جو پوری طرح سے درست تھی، پھر کبھی استعمال نہ ہو سکی اور مسز مزگروف کے باغیچے کے ایک کونے کھڑے کھڑے زنگ خوردہ ہو کر گل گئی۔

1946 میں سواس میں تقریباً تیس لوگوں کا اسٹاف تھا۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ ایشیائی اور افریقی زبانوں کے ماہر تھے۔ ان میں سے بیشتر بزرگ تھے اور کبھی کچھ سنکی سے معلوم ہوتے تھے۔ یہ سب اپنے اپنے علمی کاموں میں مصروف رہتے۔ پڑھانا ان کی ملازمت کا حصہ تھا لیکن یقیناً ایسا حصہ نہ تھا جس کو وہ ترجیح دیتے۔ ان کی کلاسوں میں بہت ہی قلیل تعداد میں یونیورسٹی کے طالب علم داخلہ لیتے تھے — جنگ سے پہلے ان میں سے بیشتر پوسٹ گریجویٹ طالب علم ہوتے تھے جو عموماً ایشیائی ہوتے تھے۔ میں طلبا کی پہلی برطانوی کھیپ میں سے تھا۔

ہندوستانی شعبے میں سات طالب علم تھے۔ بنیادی یا پھر معاون مضمون کے طور پر ہم بھی سنسکرت پڑھ رہے تھے، اس لیے سنسکرت ہی کی کلاس میں ہم لوگ ایک دوسرے سے بخوبی متعارف ہوئے۔ سب کے سب مرد تھے جو اپنی عمر کے تیسری دہائی کے اواخر سے گزر رہے تھے۔ سبھی نے پچھلے چھ برس کا عرصہ مسلح فوج میں کام کرتے گزارا تھا۔ ان میں سے بیشتر کو سرکاری گرانٹ ملتی تھی جو ایسے

Scanned with CamScanner

ہی سابق فوجی ملازمین کے لیے جاری کی گئی تھی جو فوجی خدمت کے سبب یونیورسٹی میں داخلہ لینے کا موقع گنوا چکے تھے۔ ایک دو طالب علموں کو میری طرح کا تعلیمی وظیفہ بھی ملتا تھا۔

ہم جلد ہی آپس میں بے تکلف ہو گئے، ہم بے جھجک باتیں کرتے اور قہقہے لگاتے۔ جس دن دھوپ ہوتی، اس دن لیکچروں کے درمیانی وقفے میں عمارت کے سرے پر واقع لان میں جا بیٹھتے۔ دوسری جگہیں جہاں ہم خصوصاً پائے جاتے، جونیئر کامن روم اور طعام گاہ تھیں جو نچلی منزل میں واقع تھیں۔ ہم میں بہت سی باتیں مشترک تھیں کیونکہ ہم سب تقریباً ایک جیسے مقاصد کے تحت سوا یس آئے تھے۔ جنگ کی مدت میں ملازمت کے دوران ہندوستان کے معاملات سے پیدا ہونے والی دلچسپی نے، جس کو اب ہم مزید وسیع کرنا چاہتے تھے، ہمیں یہاں اکٹھا کیا تھا۔

یہاں آنے سے پہلے میں نے سوچا تھا کہ تعلیم میں میرا زیادہ وقت صرف نہ ہوگا۔ میں گیارہ برس کی عمر سے زبانیں اور ادب پڑھ رہا تھا اور ہمیشہ ہی ایک اچھا طالب علم رہا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ سنسکرت پڑھنا آسان ہوگا کیونکہ میں اس قبیل کی دو زبانیں، یونانی اور لاطینی پڑھ چکا تھا، اور اردو تو یقیناً کوئی مسئلہ ہی نہیں تھی کیونکہ یہ میں پہلے ہی سے پڑھنا جانتا تھا۔ چنانچہ میرا ارادہ یہ تھا کہ خالی وقت میں دوسری کتابیں پڑھوں گا تاکہ ڈگری لینے کے بعد ہندوستان کے سیاسی مسائل پر موثر کام کرنے لیے خود کو تیار کر سکوں۔

لیکن یہ اندازہ کرنے میں مجھے زیادہ وقت نہیں لگا کہ میں بے جا خوش امیدی کا شکار ہو گیا تھا۔ سنسکرت سیکھنے کے لیے توقع سے زیادہ وقت اور محنت درکار تھی۔ لاطینی اور یونانی زبانوں کے مطالعے نے قواعد کے ضابطے اور چند الفاظ سمجھنے میں مدد تو کی لیکن یہ میری توقع کے مطابق ہرگز نہیں تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ ہمارے سنسکرت کے استاد، جیسا کہ یونیورسٹی اساتذہ کا طریقہ ہوتا ہے، اس بات پر کوئی توجہ نہ دیتے تھے کہ ہم میں سے اکثر لوگ سنسکرت صرف معاون مضمون کے طور پر پڑھ رہے ہیں۔ وہ ہم سے اتنی ہی توقعات رکھتے تھے جتنی ان طالب علموں سے جو سنسکرت بنیادی مضمون کے طور پر پڑھ رہے تھے۔

سچ مچ کا صدمہ تو مجھے اس وقت پہنچا جب میں نے اردو سیکھنے میں پریشانیاں اٹھائیں۔ میری یہ خود اعتمادی کہ میں اردو آسانی سے سیکھ لوں گا، صرف روانی سے بول لینے کی بنا پر تھی۔ اب مجھے اندازہ

ہوا کہ میری استعداد صرف بول چال کی حد تک تھی۔ اس سے آگے کی سطح کی لفظیات وغیرہ سے میرا تعلق لغت کی مدد سے مطالعے تک محدود تھا۔ یہ مطالعہ بھی صرف ہندوستان کے بارے میں مارکس کے خطوط اور اسٹالن کی کتاب Foundations of Leninism کے ترجموں تک محدود تھا۔ اس کا ادب اور شاعری سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ اردو کی ادبی لفظیات کا ذخیرہ بہت بڑا ہے۔ جس میں فارسی اور عربی کے الفاظ بھی شامل ہیں۔ ان میں سے بیشتر لفظوں سے میرا کوئی سابقہ اب تک نہیں پڑا تھا۔

ہمارے نصاب میں شامل پہلی کتاب توبۃ النصوح تھی جو ابتدائی دور کے ناولوں میں سے ہے۔ مجھے واضح طور پر یاد ہے کہ اس کا مجھ پر کیا اثر پڑا تھا۔ یہ ناول دہلی میں پھیلی ہیضے کی وبا کے ایک بے حد پُر اثر بیان سے شروع ہوتا ہے۔ مجھے اس وقت بڑی مایوسی ہوئی جب دیکھا کہ اس میں بمشکل کوئی جملہ ہوگا جسے میں سمجھ سکتا ہوں۔ میں اس بات سے بھی مضحکہ خیز حد تک پریشان ہوا کہ اس کے مصنف نے مکالمے اس انداز میں لکھے تھے جو میں نے اب تک صرف ڈراموں کے متن میں پڑھے تھے۔ مثلاً:

نصوح نے کہا، ''میں نہیں جانتا۔''

کے بجائے اس طرح لکھا گیا تھا:

نصوح: میں نہیں جانتا۔

اتنا ہی پریشان کن تعارف اردو شاعری سے بھی ہوا۔ میرے استاد نے اپنے ساتھ مجھ سے غزل کی قرأت کرائی۔ غزل اردو میں فارسی سے آئی ہے اور سیکڑوں سال سے ایک مقبول عام صنف ہے۔ میں غزل کے بارے میں صرف اتنا ہی جانتا تھا کہ اس میں عشق کی شاعری ہوتی ہے اور تھوڑا بہت یہ بھی اندازہ تھا کہ اردو اپنی عشقیہ شاعری کے لیے مشہور ہے۔ مجھے عشقیہ شاعری پسند ہے، اس لیے کلاس میں بڑی خوش کن توقعات کے ساتھ آیا تھا۔ کلاس سے باہر نکلا تو مایوس سا تھا، اور مجھے یقین ہے کہ میں نے کچھ سیکھا بھی نہیں تھا۔ غزل کے بارے میں جو کچھ میں نے پڑھا تھا، سمجھا تھا اور پسند کیا تھا، اس میں سے یہاں کچھ بھی نہ تھا۔

چند ہی ہفتوں کے اندر مجھے یہ ماننا پڑا، جس سے مجھے خاصی مایوسی بھی ہوئی، کہ اردو سے میری دلچسپی سنسکرت کے مقابلے میں کم ہو گئی ہے۔ اپنے گروپ کا میں واحد طالب علم تھا جس نے اردو

Scanned with CamScanner

بنیادی مضمون کے طور پر لی تھی، اسی لیے اردو کی کلاس میں وہ دوستانہ ماحول نہیں تھا جو سنسکرت کی کلاسوں میں نظر آتا تھا۔ اردو پڑھنے کے دوران ایک اور حوصلہ شکن پہلو یہ بھی سامنے آیا کہ خود سے مطالعہ کرنے کے لیے معاون کتابیں دستیاب نہیں تھیں، جبکہ یہ سہولت ہمیں لاطینی اور یونانی زبانیں پڑھتے وقت حاصل تھی اور کسی حد تک سنسکرت کے لیے بھی تھی۔ یعنی اردو میں کوئی ایسی کتاب نہیں تھی جس میں حاشیے میں شرح یا معنی لکھے ہوں، جن کی مدد سے میں کتاب خود پڑھ سکوں۔ کوئی انگریزی ترجمہ بھی موجود نہ تھا۔ میں پہلا شخص تھا جس نے کسی بھی برطانوی یونیورسٹی میں اردو کے ڈگری کورس میں داخلہ لیا تھا۔ اس لیے پہلے سے کچھ بھی طے نہیں تھا کہ کون کون سے ادبی متون، کتنی تعداد میں شاملِ نصاب ہوں گے۔ میرے اساتذہ نے مزید ستم یہ کیا کہ جو کچھ اہم سمجھا سب نصاب میں شامل کردیا۔ اس طرح نصاب بے اندازہ پھیل گیا اور مقررہ وقت میں اسے ختم کرنے کا مجھے کوئی راستہ نظر نہ آتا تھا۔

مختصر یہ کہ مایوسی اور صدمے کا وہ شدید احساس جو اپنے سامنے پھیلے ہوئے کام کو دیکھ کر ہوا، حد سے تجاوز کر گیا۔ مزگر وہ دری پہنچ کر شام کو ہر روز میں وہ تمام باتیں لکھتا جو دن میں سیکھی ہوتی تھیں اور نئے لفظوں کے معنی ان سادہ اوراق پر لکھتا تھا جو میں نے کتابوں کے اوراق کے بیچ جلد میں بندھوا رکھے تھے۔ یہ عادت مجھے اسکول کے زمانے میں پڑی تھی جب یونانی کے نصاب کی ہماری ایک دو کتابوں کے متن کے ہر ورق کے بعد ایک خالی ورق لگا ہوتا تھا۔ سوالیس آنے سے قبل جب میں نے اردو نصاب میں شامل متون کی فہرست دیکھی تو راشد سے، جو ہندوستان واپس جارہا تھا، کہہ دیا تھا کہ وہ یہ سب کتابیں بھیج دے۔ جب کتابیں آگئیں تو میں انھیں سلیبی (Selby) کے، جو ہوم سے بارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے، ایک جلد ساز کے پاس لے گیا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ کتابوں کی جلدیں کھول کر ہر ورق کے ساتھ ایک خالی ورق لگا کر پھر سے جلد باندھ دے۔ چونکہ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ کتاب اس طرف سے شروع ہوتی ہے جدھر سے انگریزی کی کتابوں کا آخری صفحہ ہوتا ہے، اس لیے میں نے تمام صفحات پر پنسل سے نئے نمبر اس کی رہنمائی کے لیے ڈالے تھے۔ اب پڑھائی کے دوران ہر دن نئے لفظوں اور قواعد کی پیچیدگیوں کے سیلاب کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ایسے حالات میں متن کے ساتھ خالی اوراق والی کتابیں میری لیے بڑی قیمتی ثابت ہوئیں۔

Scanned with CamScanner

طالب علموں کے ہمارے گروپ میں میری سب سے زیادہ قربت شاید ڈیوڈ ہورسبرگ (David Horsburgh) کے ساتھ ہوئی۔ مجھے نہیں لگتا کہ ہندوستان جانے سے پہلے اس میں کوئی خاص سیاسی شعور رہا ہوگا، لیکن وہاں اس نے ہندوستانیوں کے تئیں انگریزوں کا جو رویہ دیکھا، اس کے خلاف میری ہی طرح اس پر بھی شدید ردعمل ہوا۔ اس نے بھی ایسے ہر موقعے کا فائدہ اٹھایا جس میں وہ ہندوستانیوں کو قریب سے دیکھ سکے اور ان کے ساتھ دوستانہ مراسم استوار کر سکے۔ اس کے ذہن میں یہ بات واضح تھی کہ اسے ہندوستان واپس لوٹنا ہے اور وہیں رہنا ہے۔ اس کا خصوصی مضمون سنسکرت تھا لیکن وہ تھوڑی بہت اردو اس وقت سے جانتا تھا جب وہ ہندوستان میں رائل ایرفورس میں تھا۔ ہم دونوں ہی نے یہ طے کر لیا تھا کہ لندن میں بھی ہندوستانیوں کے ساتھ روابط بڑھائیں گے۔

ہمارے گروپ میں جو (Joe) نام کے دو لڑکے تھے۔ جو ہنٹ (Joe Hunt) بہت ہی خوش مزاج تھا، (ہندوستانی انگریزی کے محاورے میں ڈیوڈ اس کو very jolly gentleman کہتا تھا)۔ ہم اس کو چڑانے کے لیے اس کا نام لیتے وقت 'ایچ' پر خصوصی زور ڈالتے تھے تاکہ اسے Joe Cunt سے ممیز کر سکیں جو فوجیوں کی اصطلاح میں کسی بھی ایرے غیرے کے لیے مستعمل تھا۔ اس پر جو بھی ہماری طرح خوب ہنستا تھا۔ دوسرا جو کلیمنٹ (Joe Clement) تھا جس کا خصوصی مضمون ہندی تھا۔ اس کے ساتھ بھی وقت اچھا گزرتا تھا، حالانکہ اپنے بارے میں اس کی رائے خاصی اونچی تھی۔ جنگ میں وہ میجر کے عہدے پر تھا۔ یہ عہدہ ان عہدوں سے بڑا تھا جن پر ہم فائز تھے، اور اس نے بطور خاص دھیان رکھا تھا کہ یہ بات ہمیں معلوم ہو جائے۔ درحقیقت اس کا عہدہ وہی تھا جسے ہم جنگ کا مستقل عہدہ (War Substantive) کہتے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر وہ امن کے دنوں میں بھی فوجی ملازمت میں رہنے کا فیصلہ کرتا تو پھر اس عہدے کا مجاز نہ رہتا۔ فوج نے ہمیں باضابطہ طور پر یہ حق دے رکھا تھا کہ اگر ہم چاہیں تو جنگ والے عہدے کا ٹائٹل استعمال کرتے رہیں، اور جو ان لوگوں میں سے تھا جو اس طرح کی خواہش رکھتے ہیں۔ ہمارے ساتھ تو ایسا نہیں ہوا لیکن جب وہ محسوس کرتا کہ کسی پر رعب ڈالنا ہے تو پھر وہ اس کا استعمال کرتا تھا، مثال کے طور پر سرکاری

Scanned with CamScanner

بابوؤں سے واسطہ پڑنے پر۔

جو کلیمنٹ کی حس مزاح زہر خند تھی اور وہ اپنی پرزور رائے کا اظہار بھی بڑے پرزور انداز میں کرتا تھا۔ ایک بار ہندوستانیوں کی امنگوں کے بارے میں اس کی ہمدردیوں کا غلط اندازہ کر کے میں نے اس کو ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے ہفت روزہ People's Age کی چند کاپیاں مستعار دیں۔ اس نے یہ کاپیاں زہر آلود لہجے میں یہ کہہ کر مجھے واپس کر دیں کہ تم کو پسند کرنے اور تمھارا معترف ہونے کے باوجود میں آئندہ اس قسم کا مواد دیکھنا پسند نہیں کروں گا۔ لفظوں سے کھیلنے کا بھی اس کا بڑا دلچسپ انداز تھا۔ سنسکرت میں ایک فعل ہے جس کے معنی کہیں تو 'اُڑنا' ہوتے ہیں اور کہیں 'گرنا'۔ ان دنوں طیاروں کے گرنے کے کئی حادثے ہو چکے تھے۔ ایک دن جو نے ہم نے پوچھا کہ اس جملے کو سنسکرت میں کس طرح ترجمہ کریں گے، ''جب وہ اڑتے ہیں تو گر جاتے ہیں۔'' ایک اور بار جب یہ خبر آئی کہ ایک اور سیاست داں نے برما کے اہم سیاست دانوں کو بے دخل کر دیا ہے (جس کا نام میرے خیال میں تھکین نو (Thakin Nu) تھا) تو جو نے کہا: ''نیا آنے والا تھینکن یو (Thankin' you) کہتا ہوا اپنے پیشروؤں کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

ہمارے گروپ میں ایک کمیونسٹ ساتھی بھی تھا جس کا نام ٹونی وارڈر (Tony Warder) تھا۔ وہ بدھسٹ تھا۔ حالانکہ اس نے اپنے کمیونسٹ عقیدے کو کبھی نہیں چھپایا اور اس کی ایمان داری پر میں نے کبھی شک نہیں کیا لیکن ہمیشہ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بدھ مت سے نسبتاً زیادہ دلچسپی رکھتا ہے اور یہاں آنے کا اس کا مقصد بدھ عقیدے کی مذہبی کتابوں کو پڑھنے کی صلاحیت پیدا کرنا ہے۔ ان میں سے بیشتر کتابیں پالی میں لکھی ہوئی ہیں جو سنسکرت سے نکلی ہوئی ایک زبان ہے۔ ان کو پڑھنے کا روایتی طریقہ یہ ہے کہ پہلے سنسکرت سیکھی جاتی ہے، پھر پالی۔ وہ زبان کا ایک سنجیدہ لیکن کمزور طالب علم تھا۔ سنسکرت گرامر پر عبور کے لیے اسے جیسی جدوجہد کرنا پڑتی تھی اس سے ہم لوگ خوب محظوظ ہوتے تھے۔ ایک دن سنسکرت کی کلاس میں ہمارے سامنے ایک لفظ ''وِدوشا'' آیا۔ یہ اسمِ آلہ ہے (جو لاطینی کے ablative کی طرح سے ہوتا ہے) ہمارے ٹیچر ریلینڈز (Rylands) اس لفظ کی غیر معمولی ہیئت کی جانب ہمیں کئی بار متوجہ کر چکے تھے لیکن اس دن ٹونی اچانک غصے کے مارے چیخ پڑا۔ ''یہ ودوشا کیا ہے؟'' گویا اس کے سامنے یہ لفظ پہلی بار آیا ہو۔ اس پر ریلینڈز تو کچھ خفا سے نظر آئے اور ہم

Scanned with CamScanner

سب خوب محظوظ ہوے۔ بہر حال یہ سب بڑے ہلکے پھلکے ماحول میں گزر گیا۔

مائیکل پیج (Michael Page) ٹونی کا بالکل الٹ تھا۔ ایک خوش مزاج، بے فکرا، اعلیٰ طبقے کا کیریکٹر، جس کے بارے میں اگر کم سے کم بھی کہا جائے تو یہ ہوگا کہ وہ اپنی پڑھائی کے بارے میں بالکل بھی سنجیدہ نہیں تھا۔ وہ رچمنڈ (Richmond) میں رہتا تھا اور ہمارا تاثر یہ تھا کہ اس کا کوئی نجی ذریعۂ آمدنی بھی ہے۔ بہر حال یہ ظاہر تھا کہ روزی کمانے کے لیے وہ تعلیم کو ضروری خیال نہیں کرتا ہے۔ ہم سب کا خیال تھا کہ وہ امرد پرست ہے لیکن ہم نے اس بارے میں کبھی بات نہیں کی۔ اس زمانے میں کوئی بھی کھلے طور پر امرد پرست ہونے کا اقرار نہیں کرتا تھا۔ بہر حال ہم میں سے کسی نے بھی اسے قابل اعتراض نہیں سمجھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس نے بھی اسے قابل اعتراض سمجھا ہوگا۔ پبلک اسکول کے تعلیم یافتہ انگریز حالانکہ اس کے موید نہیں تھے لیکن عداوت بھی نہ رکھتے تھے۔ وہ ایک نفیس قسم کا آدمی تھا اور دوسرے ایسے 'گے' مردوں کی طرح تھا جن سے عورتیں گھبراتی نہیں۔

مائیکل کا خصوصی مضمون، جہاں تک مجھے یاد ہے، سنسکرت تھا لیکن کبھی کبھی وہ اردو تلفظ کی کلاسوں میں بھی بیٹھتا تھا۔ ہمارے ٹیچر کبھی کبھی ہندوستان سے آنے والے بے خبر اور کندۂ ناتراش انگریز افسروں کے تلفظ کا مذاق اڑاتے تھے جو اردو لفظوں کے تلفظ اور درست آوازوں کو یکسر نظر انداز کرتے تھے۔ اسی لیے ان کی زبان میں ''بہت خراب'' بگڑ کر ''بوت کراب'' ہو جاتا تھا۔ مائیکل نے بھی اپنے تلفظ کی اصلاح کی کبھی کوشش نہیں کی اور وہ بھی تقریباً 'بوت کراب' ہی بولتا تھا۔ لیکن اپنے تلفظ پر اسی طرح دل کھول کر ہنستا تھا جیسے ہم سب ہنستے تھے۔

بڑے بڑے کرداروں کے اس مجمعے میں ساتواں اور آخری کردار ایک مجہول سا، افسردہ رہنے والا شخص تھا جس کا نام ٹیم ریپر (Timothy C. Harcourt Raper) تھا۔ 'سی' سے کیا نام بنتا تھا مجھے اب یاد نہیں، لیکن 'ہرکورٹ' یقیناً اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ ہمارے گروپ کا حصہ تو تھا لیکن اس نے ذہن پر کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑا۔

سواس کی انتظامیہ کے سامنے ہم لوگوں کے سبب ایک نئی صورت حال پیدا ہوگئی تھی۔ ہمارے اساتذہ استاد شاگرد کے درمیان روایتی تعظیمی رشتوں کے عادی تھے اور ہم لوگ اس پیمانے پر پورے نہیں اترتے تھے۔ اٹھارہ برس کی عمر میں اسکول سے براہِ راست یونیورسٹی آنے والے طلبا

کے مقابلے میں ہم لوگوں میں خاصی خوداعتمادی تھی اور کئی معنوں میں ہماری زندگی کے تجربات اپنے اِن استادوں سے زیادہ وسیع تھے جن میں سے کسی نے بھی جنگی خدمات انجام نہیں دی تھیں۔ ان میں سے کچھ تو اپنی معمری کے سبب فوجی خدمت کے اہل نہیں تھے اور کچھ ایسے کاموں میں مصروف تھے جن کو حکومت جنگی مہم میں اتنا اہم سمجھتی تھی کہ ان میں خلل نہ ڈالنا چاہتی تھی۔ سنسکرت کے ایک ٹیچر مسٹر برو (Brough) اصولی طور پر جنگ میں فوجی خدمت کے سخت خلاف تھے۔ اس طرح ان کا اپنا تجربہ تھا اور ہمارا اپنا، اور حالانکہ ہم وہاں تعلیم کے لیے گئے تھے لیکن سماجی معنوں میں ہم خود کو اُن کے برابر سمجھتے تھے اور اسی کے مطابق ہمارے رویے بھی تھے۔ ہمارے لیے جو بھی پروگرام ترتیب دیے جاتے، ان میں کسی قسم کی تبدیلیاں کرنے میں ہم کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے۔ ویسے بھی یہ پروگرام پہلی ہی بار ترتیب دیے جا رہے تھے۔ سوایس حالانکہ لندن یونیورسٹی کا ماتحت کالج تھا لیکن یہاں پہلی ڈگری دیے جانے کا کوئی واضح سانچا نہیں تھا کیونکہ ہمارا پہلا گروپ تھا جو یہاں سے ڈگری کورس کر رہا تھا۔ ابتدا میں ہمارے اساتذہ ہمارے رویوں سے تھوڑا حیران ہوئے لیکن جلد ہی انھوں نے ہمارے طرزِ فکر کو قبول کر لیا اور وہ بمشکل ہی کبھی ہمارے رویوں سے عاجز آتے تھے۔

اب مجھے یہ سمجھ میں آنے لگا تھا کہ سوایس کس قسم کا ادارہ ہے۔ اس ادارے کو 1908 کی ایک سرکاری کمیٹی (Reay Committee) کی رپورٹ کے نتیجے میں قائم کیا گیا تھا جس میں ''ایشیا اور افریقہ کے انتظامی عہدوں پر جانے والے لوگوں کو تربیت فراہم کرنے کی فوری ضرورت'' پر زور دیا گیا تھا۔ برطانوی حکومت کے نزدیک ''فوری ضرورت'' کا جو بھی تصور ہو لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ یہ ادارہ کم از کم نو سال کے بعد وجود میں آیا۔ ابتدا میں یہ ''اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز'' تھا اور بعد میں، 1938 میں، اس میں ''اینڈ افریکن'' کا اضافہ کیا گیا۔ شعبے کے اساتذہ کو دیکھ کر سامراجی رشتے صاف ظاہر ہو جاتے تھے۔ ان میں سے بیشتر سابق مشنری تھے یا پھر کولونیل سول سرونٹ۔ ان میں سے کوئی برطانوی راج کے ماضی، حال اور مستقبل پر کوئی سوال نہ اٹھاتا تھا۔ وہ جن خطوں میں رہے وہاں کی زبانیں اانھوں نے سیکھ لی تھیں لیکن اپنے اردگرد کے ماحول، تہذیب اور لوگوں کے بارے میں انھوں نے بہت کم جاننے کی کوشش کی تھی۔ حسنِ اتفاق سے اساتذہ کا ایک زمرہ اور تھا جس کو 'اوورسیز لیکچررز' کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ عموماً اپنی مادری زبان پڑھاتے تھے۔ لیکن ان کو قلیل مدتی

Scanned with CamScanner

معاہدے پر رکھا جاتا تھا اور ان کی حیثیت یقیناً دوم درجے کی ہوتی تھی۔ ان کولونیل رویوں کے علاوہ ایک قسم کی اکادمک بوسیدگی کی فضا بھی محسوس ہوتی تھی۔ لائبریرین ایل ڈی بارنیٹ (L.D. Barnett) سنسکرت کے اسکالر تھے۔ وہ آج کے دور کے ہندوستانی ناموں کو خالص سنسکرت کے ناموں کی بے حد بگڑی ہوئی صورت سمجھتے تھے۔ چنانچہ اگر آپ کارڈ انڈیکس میں رابندر ناتھ ٹیگور کا نام تلاش کریں تو ٹیگور کی سنسکرت شکل کا ایک رجوع حوالہ بھی ضرور پائیں گے: ''دیکھیں رویندر ناتھ ٹھاکر۔'' اس حقیقت کا بارنیٹ کے نزدیک کوئی مطلب نہیں تھا کہ ٹیگور اور دوسرے تمام لوگوں کے لیے ان کا درست نام رابندر ناتھ ٹیگور ہی ہے۔

جو وظیفہ مجھے دیا گیا تھا وہ برطانوی حکومت کی طرزِ فکر میں جدت کا غماز تھا۔ 1934 کے آس پاس یہ بات نظر آنے لگی تھی کہ سوویت یونین اور مشرقی یوروپ کے وہ ممالک جو اس کے اثر میں ہیں، آنے والے وقت میں بین الاقوامی منظر نامے پر اہم رول ادا کریں گے۔ اور یہ بھی ظاہر تھا کہ ایشیائی کالونیاں جلد یا بدیر آزادی کا مطالبہ کریں گی اور ان کو آزادی دینی ہی ہوگی۔ حکومت نے یہ سوچا کہ اس کو بڑی تعداد میں ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو ان ممالک کا خاصا گہرا علم رکھتے ہوں۔ اس مقصد کو نظر میں رکھ کر حکومت نے سکاربرو کمیشن (Scarbrough Commission) یہ جانچنے کے لیے بٹھایا تھا کہ ان نئی قومی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کیا کیا اقدامات کیے جائیں۔ جہاں تک سوایس کا تعلق ہے تو اس میں نئے اسٹاف کی فوری تربیت کو ضروری سمجھا گیا کیونکہ اس کے موجودہ اساتذہ، جو کالونیوں سے سبکدوش ہو کر لوٹنے کے بعد ملازم رکھے گئے تھے، اپنی عمروں کے آخری پڑاؤ پر تھے۔ اردو کا معاملہ یہ تھا کہ اس کے بانی استاد کچھ عرصہ پہلے تک ٹی گراہم بیلی (T. Grahame Bailey) تھے جو چرچ آف اسکاٹ لینڈ کے ایک مشنری تھے اور سوایس میں میرے داخلے سے کچھ ہی عرصے پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ موجودہ سینئر استاد ہارلے (Harley) تھے جو منتظر تھے کہ کوئی نیا استاد آئے تو وہ ریٹائر ہو جائیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میری تربیت ان کی جگہ لینے کے لیے کی جا رہی ہے — لیکن اسی صورت میں جب میں اول درجے کے نمبر حاصل کر لوں اور سوایس انتظامیہ کی خوشنودی بھی۔ میرے ذہن میں آنے والا یہ خیال سنسنی خیز تھا اور جلد ہی مستقبل کے تعلق سے میرے خیالات کو اس نے متاثر کرنا شروع کر دیا۔

کہتے ہیں کہ 1947 کی سردیاں اس صدی کی شدید ترین سردیاں تھیں۔ جن لوگوں نے وہ سردیاں دیکھیں وہ ایسا مانتے ہیں اور ان دنوں کی جو تاریخیں لکھی گئیں، ان میں بھی یہی درج ہے۔ جنوری کے اواخر سے وسطِ مارچ تک مسلسل برف باری ہوتی رہی۔ بیچ بیچ میں اکثر ہوا کے تند جھکڑ بھی چلتے۔ وسیع زمینی منظر کو برف نے دس دس فٹ تک پاٹ دیا تھا۔ ٹیمز (Thames) جم گیا تھا۔ ایندھن کا انتظام نہیں تھا۔ صنعتی کارخانوں کی بجلی کاٹ دی گئی، شاہراہوں پر اندھیرا چھا گیا۔ گھریلو بجلی کی سپلائی میں شدید کٹوتی کی گئی اور گھروں کو بمشکل گرم رکھا جا سکا۔ لیکن اس میں سے کچھ بھی میری یادداشت میں محفوظ نہیں — نہ تو مسلسل برف باری، نہ ٹھنڈ کی کیفیت اور نہ ہی سوالیس تک آنے جانے میں کسی قسم کی پریشانی۔ کچھ بھی یاد نہیں۔

اس کتاب کے سلسلے میں جب میں نے اپنے جو کاغذات کھنگالے ان سے پتا چلا کہ کرسمس اور پھر ایسٹر کے موقعے پر میں اپنے گاؤں ہوم چلا گیا تھا۔ 4 جنوری 1947 کو میں یارک کے رائل تھیٹر میں منعقد ایک اینگلو پولش بیلے دیکھنے کے لیے ریکس اور فراوڈ کے ساتھ گیا تھا — یہ پروگرام ان دوستانہ مراسم کی علامت تھا جو جنگ کے زمانے میں بھی برقرار رہے تھے۔ میں ایک نوٹ بک میں ان کتابوں کا اندراج رکھتا تھا جو میں دوستوں کو مستعار دیتا تھا۔ اس نوٹ بک میں ریکس کے نام کا اندراج لگاتار ملتا ہے۔ صرف اپریل ہی میں ریکس کو بارہ کتابیں دیں۔ اس صدی کی سب سے شدید سردیوں میں گاؤں جاتے وقت، کہہ سکتے ہیں کہ مجھے راستے میں ملنے والے برف کے تودے یاد ہوں گے، بند راستے یاد ہوں گے، آگ جلانے کے لیے لکڑی چیرتے وقت ہاتھوں کے جمنے کا کوئی تو احساس یاد ہوگا — لیکن مجھے کچھ یاد نہیں۔

یہ ایک سربستہ راز ہے کہ ہم کون سی باتیں یاد رکھتے ہیں اور کون سی بھول جاتے ہیں، لیکن یہ میرے کردار کی عمومی خاصیت کی ایک مثال بھی ہے کہ میں اپنے گردوپیش کے آرام و آسائش یا پریشانیوں سے بے نیاز رہتا ہوں۔ اگر میری دلچسپی کی کوئی بات میرے سامنے ہو (عموماً اگر مجھے کوئی کتاب یا کاغذ قلم فراہم ہو) تو بیرونی صورتِ حال مجھ پر کوئی خاص اثر انداز نہیں ہوتی۔ ایسا لگتا ہے کہ مجھ پر گرمی سردی، بے آرامی یا بیماری، یا کچھ دوسری چیزیں اس حد تک اثر انداز نہیں ہوتیں جتنی

دوسرے بہت سے لوگوں پر ہوتی ہیں۔ میں نے ہندوستان میں رہ کر، وہاں کی گرمی برداشت کر کے اور فوجی زندگی کی سادگی سے یہ بات سیکھی تھی اور یہاں آ کر بھی شاید اسی طرح کی صورتِ حال سے دوچار ہوا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میرا مزاج ایسا کیوں ہے لیکن میں اسے اپنی خوش بختی سمجھتا ہوں کہ ایسا ہے۔

جنگ کے بعد کے دنوں میں قومی معیشت کے مفاد میں سادگی سے جینے سے متعلق بھی اسی قسم کے کئی پہلو میرے سامنے آئے۔ کپڑوں اور دوسرے سامان کی قلت نے مجھے بالکل پریشان نہیں کیا۔ مسز مزگروف نے ہم سے راشن کارڈ لے لیے تھے اور ہمارے لیے کھانا وہی خریدتی تھیں، یوں مجھے کبھی کھانے کے لیے قطار میں نہیں لگنا پڑا۔ اگر کھانے کی قلت کے معنی یہ تھے کہ کئی طرح کا کھانا نہ ملے، تو اس کا مجھے پتا نہیں چلا۔ البتہ مجھے ایک بات یاد ہے۔ وہ یہ کہ حکومت کے ذریعے وہیل مچھلی کا گوشت استعمال کرنے پر زور دینے کے سبب مسز مزگروف نے ایک دن وہیل کا گوشت پکایا۔ مجھے یہ ٹھیک ہی لگا لیکن مسز مزگروف سمیت کسی کو بھی پسند نہیں آیا اور اس کے بعد انھوں نے کبھی وہیل کا گوشت پکانے کی کوشش نہیں کی۔

آج جب ماضی کی طرف دیکھتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ سردیوں کے ان حالات میں مسز مزگروف کے لیے اپنے کرایہ داروں کے لیے کھانے کا انتظام کرنا کتنا مشکل ہوتا ہوگا۔ برف میں گھنٹوں تک قطار میں کھڑے ہونا، اور گھروں میں صرف چند ہی گھنٹے کے لیے بجلی کا آنا وغیرہ۔ حالانکہ اپنے بے فکرے پن کے باعث میں عورتوں کے ان کاموں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا جو مجھ سے اوجھل تھے لیکن جب میں نے برتن دھونے میں مدد کرنے کی تجویز رکھی تو وہ حیرت زدہ رہ گئیں۔ صاف دیکھا جا سکتا تھا کہ ان کے جان پہچان والوں میں کسی نے بھی کبھی یہ کام نہیں کیا ہے۔ ہم دونوں برتن دھوتے جاتے اور باتیں کرتے رہتے۔ اسی قسم کی بالمشافہ گفتگو کے سبب میں ان کو بھی سمجھ سکا اور لندن میں عام طور سے غریب یا مزدور طبقے کے اندرونی زندگی کے بارے میں کچھ باتیں جان سکا۔

ریڈیو بیشتر اوقات باورچی خانے میں رکھا ہوتا تھا اور برتن دھوتے وقت ہم اکثر سنتے تھے۔ ہمارے (بلکہ برطانوی لوگوں میں سے اکثر کے) پسندیدہ پروگرام کا نام Much Binding in

Scanned with CamScanner

the Marsh تھا۔ یہ ایک مزاحیہ پروگرام تھا جس میں جنگ کے بعد کے برطانیہ میں پیش آرہے واقعات کا مذاق اڑانے والا کوئی نہ کوئی اچھا سا فقرہ ضرور شامل ہوتا تھا۔ ہر پروگرام کا خاتمہ کسی حالیہ واقعے پر ایک منظوم یا مقفیٰ تبصرے پر ہوتا تھا۔ یہ خاصی چالو قسم کی تک بندی ہوتی تھی۔ رہائشی مکانات کی شدید قلت کے پیش نظر حکومت نے ایک کریش پروگرام شروع کیا جس میں عمارت کے پیش ساختہ اجزا (pre-fabricated components) کی مدد سے مکان بنائے جاتے تھے۔ اس پر ڈرم اس دُھن پر بجائے گئے:

Down in the Jungle --v v-- --
Living in a tent v v v v --
Better than a prefab v v v v -- --
No rent ! -- --

(پری فیب مکان میں رہنے سے جنگل میں خیمہ ڈال کر رہنا بہتر ہے۔ کرایہ بھی نہیں دینا پڑے گا۔)

اور جب خوردنی اشیا کی قلت کے سبب وزیر محنت نے لوگوں کی سفید بریڈ کے استعمال کی لت چھڑوانی چاہی تو یہ دھن بجائی گئی:

Sir Ben Smith ---
He done said ---
Gonna give the white man v v v v -- --
Black bread -- --

(کہتے ہیں سر بین اسمتھ سفید فاموں کو اب کالی بریڈ دے گا)

اس پروگرام میں ہر طرح کے اور ہر طبقے کے لوگوں کا بڑی خوش دلی سے مذاق اڑایا جاتا تھا جس کے لیے چند مخصوص کردار تھے۔ مثلاً رے لنگ(Rai Ling, the Chinese fence)اور لارڈ واٹرلوگ (Lord Waterlog) جو مزدور طبقے کا کردار تھا لیکن کسی طرح رتبے والا ہو گیا تھا۔ وہ اپنی صورتِ حال کا خوب مذاق اڑاتا اور ٹھیٹھ مزدوروں والے لہجے میں بات کرتا تھا۔ اس کی بیٹی 'آنریبل فیب' (the Honourable Pheeb) تھی جو اپنے باپ کے برخلاف ایسا رویہ اور لہجہ اختیار کرنے کی کوشش کرتی جو طبقۂ امرا سے مخصوص ہے۔ اس کی بات کرتے وقت لارڈ واٹرلوگ

اکثر اسے 'آزیبل فیب' کہتا اور اپنے جملے کی شروعات اس طرح کرتا: "ہو (اوہ) وہ کہتی ہیں۔۔۔"
مسز مزگروف حالانکہ بڑی پکی کمیونسٹ تھیں لیکن وہ اس پر سخت معترض تھیں کیونکہ اس کے خیال میں طبقۂ امرا کا مذاق اڑانا اچھی بات نہ تھی۔ روایتی سماجی مراتب کے احترام کے معاملے میں وہ بہت سخت تھیں۔ وہ ہمارے علاقے کے ایم پی کو ہمیشہ مسٹر پرٹ (Mr. Pritt) کہتیں حالانکہ وہ بھی کمیونسٹ تھا۔ لیکن اعتراف نہیں کرتا تھا، کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ لیبر پارٹی سے نکال دیا جائے۔ ہم کرایہ داروں کے ساتھ بھی ان کا رویہ اسی قسم کا تھا۔ ہم سب تو رالف، جارج اور ایمون وغیرہ تھے لیکن جو ایک ڈاکٹر تھا اسے ہمیشہ "ڈاکٹر بوگیس" (Boggis) کہہ کر بلاتی تھیں۔ ایک سے زیادہ موقعوں پر انھوں نے مجھ سے کہا کہ تم سیاست میں کیوں نہیں جاتے، لیبر پارٹی میں شامل ہو جاؤ اور پھر ایم پی بن جاؤ۔ میں اس بات سے خاصا محظوظ ہوا کیونکہ کوئی کمیونسٹ یہ بات خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔

مسز مزگروف کی بیٹی مولی کبھی کبھار ہماری باتوں میں شریک ہو جاتی تھی۔ وہ ایک پرکشش لڑکی تھی اور انیس سال کی عمر میں بھی خاصی کمسن نظر آتی تھی۔ چمک دھمک اور بھڑکیلے لباس سے وہ دور رہتی تھی --- نہ میک اپ کرتی تھی اور نہ اکثر فیشن ایبل کپڑے خریدتی تھی۔ وہ بیکر اسٹریٹ کے قریب واقع ایک چھوٹی سی دکان میں زنانی ٹوپیاں فروخت کرنے کا کام کرتی تھی۔ اس کے گاہک اونچے طبقے کے ہوتے تھے۔ اپنے کام سے اسے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی لیکن کام کرنا تھا اس لیے کرتی تھی۔ اس کے مطابق 'ٹریڈ اسکول' میں ٹوپیاں بنانا سیکھنے سے پہلے اس نے محض ابتدائی نوعیت کی تعلیم حاصل کی تھی، اور پہلا موقع ملتے ہی اس نے تعلیم چھوڑ دی تھی۔ میں یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا لیکن اس سے وہ کسی طرح مرعوب نہ تھی۔ وہ اپنے حالات سے مطمئن اور خود میں مگن تھی اور میرے ساتھ اسی کے مطابق پیش آتی تھی۔ میں اس کی سادگی اور راست بازی سے بڑا متاثر تھا۔

آئندہ چند مہینوں میں ہم ایک دوسرے سے اتنا واقف ضرور ہو گئے کہ وہ مجھ سے اپنی ماں کے ساتھ اپنے رشتوں کے بارے میں باتیں کرنے لگی۔ بچپن میں وہ اپنے باپ کی لاڈلی تھی جبکہ اس کی ماں کی توجہ کا مرکز واضح طور پر اس کا بھائی فلپ تھا۔ اب فلپ کے بچوں کے ساتھ بھی ان کا یہی رویہ تھا۔ پیٹر (Peter) ان کا پسندیدہ بچہ تھا جبکہ چھوٹی بچی پامیلا (Pamela) پر وہ ذرا بھی توجہ نہیں

Scanned with CamScanner

دیتی تھیں۔ اس کے ازالے کے طور پر مولی پامیلا پر خصوصی توجہ دیتی تھی۔

مولی کے باپ کے اچانک گزر جانے اور فلپ کے جنگی محاذ پر چلے جانے کے سبب ماں بیٹی میں قربت بڑھ گئی تھی۔ حالانکہ وہ ایک فرض شناس بیٹی تھی اور واضح طور پر اپنی ماں کی تعریف وتکریم کرتی تھی لیکن جب مجھ سے بات کرتی تو اکثر ان کی ناراضگی بھی ظاہر کر دیتی تھی۔ اپنی ماں کی مخالفت کا حوصلہ اس میں نہیں تھا اور شاید اسی وجہ سے اسے شکایت بھی زیادہ تھی۔ اس کی کچھ شکایتیں ان کینیڈین اور امریکی فوجیوں کے سبب بھی تھیں جو ان کے ہاں کرائے پر رہتے تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جو مولی صرف سولہ سال کی تھی (میرے آنے سے پہلے ایک کے سوا ان میں سے سب جا چکے تھے)۔ وہ مولی پر بہت زیادہ توجہ دیتے تھے اور یہ بات مولی کو بھی اچھی لگتی تھی۔ وہ ان کے پرشور اور فحش گیتوں میں معنوں کی طرف ذرا بھی توجہ دیے بغیر شامل ہو جاتی تھی۔ ان میں سے ایک گیت ایک ایسے فوجی کے بارے میں تھا جسے جنسی آسودگی کے مواقع حاصل نہ تھے:

When there isn't a girl about you do feel lonely
When there isn't a girl about you're on your owny
Absolutely on the shelf
Nothing to do but abuse yourself
When there isn't a girl about.

(جب تمھارے آس پاس کوئی لڑکی نہ ہو تو کتنی تنہائی محسوس کرتے ہو/ جب تمھارے آس پاس کوئی لڑکی نہ ہو تو تم بس خود تک محدود رہتے ہو/ پوری طرح طاق پر/ کرنے کو کچھ نہیں سوائے خود کو بھلا برا کہنے کے/ جب تمھارے پاس کوئی لڑکی نہیں ہوتی)

اس کا ہر بند ایک زوردار کورس پر ختم ہوتا تھا:

Late last night
The moon was shining bright
He whipped his old bazooka out
and shouted with delight
'Get hold of this
Get hold of that...

(کل دیر رات گئے/ جب چاند تیز روشنی میں چمک رہا تھا/ اس نے اپنا پرانا خدنگ

Scanned with CamScanner

نکال لیا اور خوشی کے مارے چیخ پڑا/ اسے جانے نہ دو/ اسے جانے نہ دو)

کچھ عرصے بعد ایک کینیڈین، جونی کیاگ (Johnny Keough) نے اس سے شادی کی درخواست کی۔ اس وقت مولی کو دراصل جو پامیری (Joe Palmeri) نام کے ایک امریکی میں دلچسپی تھی جو روچسٹر، نیویارک، کا رہنے والا تھا۔ لیکن چونکہ اس نے اظہار نہیں کیا اس لیے اس نے جونی کا پیغام قبول کرلیا۔ اسے یقین تھا کہ اس کی ماں نے یہ صورتِ حال پیدا کی تھی، کیونکہ بعد میں جو نے اسے بتایا کہ وہ پیغام دینا چاہتا تھا اور مولی کی ماں سے اس نے اس سلسلے میں بات کی تھی لیکن مسز مزگروف نے اس سے کہا کہ تم نے دیر کردی کیونکہ جونی پیغام دے چکا ہے جسے قبول بھی کرلیا گیا ہے — حالانکہ اس وقت تک ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ مولی نے بتایا کہ اس کی ماں کینیڈا جا بسنے کا ارادہ کر رہی تھیں کیونکہ ان کے چند رشتے دار وہاں رہتے تھے۔ کینیڈین کے ساتھ شادی، کسی نیویارک والے کے مقابلے میں، ان کے پلان کے زیادہ مطابق تھی۔ اس میں کتنی سچائی تھی مجھے نہیں معلوم۔ جو بھی ہو لیکن مولی نے سوچ لیا کہ اسے جونی سے محبت ہے اور وہ اس وقت بڑی اپ سیٹ ہوئی جب واپس لوٹنے کے بعد جونی نے نسبت توڑنے کا خط بھیجا۔ اس کے بعد کینیڈا جا کر بسنے کا ذکر پھر کبھی نہیں ہوا۔

8

اردو سے گتھم گتھا

برصغیر ہند کی تقریباً پندرہ بڑی زبانوں میں سے ایک اردو ہے لیکن اس کی عجیب وغریب حیثیت ہے۔ یہ زبان مغل حکمرانوں کے دور میں ارتقاپذیر ہوئی جو یا تو ترکی یا اسی نسل کی زبانیں بولتے تھے یا پھر فارسی۔ لیکن ان کی تہذیبی اور انتظامی امور کی زبان فارسی تھی۔ اردو کا ارتقا حکمرانوں اور ان کی ہندوستانی رعایا کے مابین رابطے کی زبان کے طور پر ہوا۔ یہ ایک ایسی زبان تھی جس کی جڑیں پوری طرح سے ہندوستانی تھیں لیکن جس پر فارسی اور عربی کا گہرا اثر تھا۔ جب انگریز ہندوستان پہنچے اس وقت بھی راج درباروں کے انتظامی امور کی زبان فارسی ہی تھی — فارسی صرف مسلمان مغل ہی استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ ہندو مراٹھا اور سکھ حکمران بھی استعمال کرتے تھے۔ اس لیے ابتدا میں مقامی حکمرانوں کے ساتھ رابطے کے لیے انگریزوں کو اسی زبان کی ضرورت پڑی۔ لیکن انیسویں صدی کے دور میں فارسی کا علم آہستہ آہستہ کمزور پڑتا گیا اور اس کے بجائے اپنی وسیع فارسی لفظیات کے ساتھ اردو اس کی فطری جانشین بن گئی۔ یہ انتظامیہ کی بھی زبان بن گئی اور افواج کی بھی، اور جو شخص بھی ملازمت کرنا چاہتا اس کے لیے اردو جاننا ضروری ہوگیا۔

ہندوستان میں اردو کو ہندی کے ساتھ سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان کی حیثیت حاصل ہے۔ دوسری زبانوں کے برخلاف اس کا کوئی بھی طے شدہ علاقہ نہیں ہے۔ مثال کے طور پر بنگال کی زبان بنگلہ ہے۔ اردو اور ہندی دونوں ہی زبانیں تقریباً پورے شمالی ہند میں استعمال ہوتی ہیں۔ یہ علاقہ مغرب میں پنجاب کی سرحد سے لے کر مشرق میں بنگال کی سرحد تک، اور شمال میں ہمالہ کے

Scanned with CamScanner

دامن سے لے کر دکن میں گجرات، مہاراشٹر اور اڑیسہ کی سرحدوں تک پھیلا ہوا ہے۔ روزمرہ کی بول چال میں اردو اور ہندی تقریباً ایک سی ہیں۔ دونوں کی قواعد، جملوں کی ترتیب اور ذخیرۂ الفاظ مشترک ہے۔ لیکن اس بنیادی سطح سے آگے بڑھتے ہوئے دونوں ایک دوسرے سے خاصی مختلف ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اردو، جس کے بیشتر بولنے والے مسلمان ہیں، بدلے ہوئے عربی رسمِ خط میں لکھی جاتی ہے۔ ہندی، جس کے بیشتر بولنے والے ہندو ہیں، دیوناگری رسمِ خط میں لکھی جاتی ہے جو سنسکرت میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اردو کے ذخیرۂ الفاظ میں فارسی اور عربی الفاظ کثیر تعداد میں شامل ہیں، جبکہ ہندی کا ادبی ذخیرۂ الفاظ سنسکرت پر منحصر ہے۔ ادبی اصناف اور مواد و موضوعات پر بھی دونوں مذہبی اور تہذیبی اثرات بالکل واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

سوالیس کے مخصوص طریقے پر تعلیم کا آغاز ہوا۔ میں اپنے ٹیچر کے ساتھ بیٹھتا تھا اور ہم دونوں ساتھ ساتھ متن پڑھتے جاتے، ٹیچر اُن حصوں کی وضاحت کرتا جاتا جو میری سمجھ میں نہ آتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا ممکن بھی نہ تھا کیونکہ کسی طرح کا معاون درسی مواد موجود نہ تھا۔ بہرحال کم از کم ایک اردو انگریزی لغت ضرور تھا جسے ہندوستان میں انیسویں صدی میں ایک سول سرونٹ جان ٹی پلیٹس (John T. Platts) نے مرتب کیا تھا (اس میں شک نہیں کہ اس نے بہت سے ہندوستانیوں سے استفادہ کیا ہوگا جن کی خدمات کا اس نے اعتراف تک نہیں کیا)۔ اسے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے 1884 میں چھاپا تھا۔ یہ مجھے نہایت عمدہ لغت لگا اور میں اس پر بہت زیادہ انحصار کرنے لگا۔

میرے تین اساتذہ تھے، ان میں سے ہر ایک دوسرے سے خاصا الگ تھا۔ وہ سب بہت محنتی، بااصول اور مدد کرنے والے تھے اور تینوں ہی اس کے معترف تھے کہ میں اپنی پڑھائی میں سنجیدہ ہوں، اور اسی وجہ سے وہ مطالعے میں ہر اعتبار سے میری مدد کو کوشاں رہتے تھے۔ اے ایچ ہارلی انچارج تھے۔ یہ بزرگ انڈین ایجوکیشنل سروس سے متعلق تھے اور کلکتہ مدرسے کے سربراہ رہ چکے تھے۔ (کلکتہ مدرسے کے بارے میں مجھے اس کے علاوہ کچھ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ اسلام سے متعلق موضوعات کا ایک بہت ہی مشہور ادارہ ہے۔) ان کو ''نظام ریڈر اردو'' کا غیر معمولی خطاب حاصل تھا — جس کے معنی میرے خیال میں یہ تھے کہ حیدر آباد کی شاہی ریاست (جس کا رقبہ، اگر میری

یادداشت درست ہے تو، فرانس اور اٹلی کے مشترکہ رقبے سے بھی زیادہ تھا) کے حکمراں، نظام حیدرآباد نے یہ عہدہ قائم کیا تھا۔ میں نے جب سوالیس میں داخلہ لیا تو ہارلی پہلے ہی سبکدوشی کی عمر سے تجاوز کر چکے تھے۔ وہ پرانے طرز کے معتدل مزاج اور کشادہ دل سامراجی لوگوں میں سے تھے۔ اس کے علاوہ ان کا ایک وصف یہ بھی تھا کہ وہ روایتی انداز کے غائب دماغ پروفیسر تھے۔ کوئی طالب علم طے شدہ وقت پر ان کے دروازے پر جا کھڑا ہوتا اور وہ اس کا استقبال ان حیران کن الفاظ میں کرتے، ''اس وقت میری کلاس تمھارے ساتھ نہیں ہے!'' اس کے بعد وہ اپنی میز پر لگا ٹائم ٹیبل دیکھتے اور تب انھیں پتا چلتا کہ درحقیقت یہ وقت اسی طالب علم کے لیے مقرر ہے۔ انھوں نے میری ہمیشہ مدد کی اور ملازمت کے طے شدہ وقت کے علاوہ بھی وہ مجھ پر وقت اور توجہ صرف کرتے تھے۔ جب میں یہ سوچ کر پریشان تھا کہ نصاب میں شامل ساری کتابیں وقت سے نہیں پڑھ پاؤں گا تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ یونیورسٹی کی چھٹیوں کے دوران بھی ان کے ساتھ بیٹھ کر پڑھوں۔ ان کی اس مہربانی کا میں دل سے معترف تھا۔

لیکن اس مہربانی کے ساتھ ساتھ ان کا ایک پرانی طرز کا عقیدہ بھی تھا — وہ یہ تھا کہ اپنے ماتحتوں کے سامنے وہ ان سے زیادہ ذی علم ہونے کا مظاہرہ کرتے تھے۔ ان ماتحتوں میں صرف طالب علموں ہی کا شمار نہ تھا بلکہ ان کے رفقائے کار بھی اس زمرے میں آتے تھے۔ ایک دن میں نے ایک فقرہ ''نظر انداز کرنا'' استعمال کیا۔ وہ اس کا مطلب نہیں سمجھ سکے۔ میں نے بتایا کہ اس کے معنی disregard کرنے کے ہیں (جو ہیں بھی) تو انھوں نے کہا کہ یہ نہیں ہو سکتا، اس کے معنی ہونے چاہئیں ''کسی چیز کو غور سے دیکھنا''۔ کبھی کبھی ڈیوڈ ہاربرگ اردو کی کلاسوں میں بھی آتا تھا، اس نے ایک بار تجویز رکھی کہ ہم مسٹر ہارلی کو کھانے پر شفیع کے ریستوراں میں مدعو کریں۔ آپ یقین کریں یا نہ کریں لیکن یہ درست ہے کہ ان دنوں لندن میں ایک ہی مستند قسم کا ہندوستانی ریستوراں تھا۔ وہاں ہم اس وقت خاصے محظوظ ہوئے جب انھوں نے شفیع سے پوچھا، (ہمیں یہ دکھانے کے لیے کہ وہ اہل زبان کے ساتھ کس طرح گفتگو کرتے ہیں) ''آپ کا مذہب کیا ہے؟'' اگر ان کے ذہن میں شفیع کا نام رہ گیا ہوتا تو وہ مذہب پوچھنے کی زحمت سے بچ جاتے کیونکہ شفیع نام صرف مسلمان ہی کا ہو سکتا ہے۔ شفیع نے پوری خود اعتمادی کے ساتھ جواب دیا تھا، ''کوئی مذہب نہیں ہے جی۔ میرا مذہب پیسہ

ہے۔'' اس کے بعد ہارلی نے کچھ نہیں پوچھا۔

ہارلی کی اپنی اعلیٰ علمیت کے اظہار کی ضرورت اردو کے بقیہ دونوں اساتذہ کے سامنے اور زیادہ واضح ہو جاتی تھی۔ یہ دونوں اساتذہ جڈ (Judd) اور بلگرامی ان کے ماتحت تھے۔ ایک بار جب میں جڈ کی کلاس بھی تھا تو وہ کمرے میں چلے آئے اور مجھ سے اردو میں پوچھا کہ آئندہ تعطیلات میں کیا تم مزید اردو سیکھنے کے لیے آؤ گے؟ میں نے جواب دیا کہ میرے خیال میں اگر میں مسلسل کام کروں تو خاصی رفتار سے سیکھ سکتا ہوں۔ اس پر انھوں نے اپنی انگلی اٹھائی اور بولے، ''مسلسل نہیں، سلسلہ وار۔'' جب وہ چلے گئے تو جڈ نے اپنے پاٹ دار نورفو کی (Norfolk) لہجے میں کہا، ''تمھارا جملہ بالکل درست تھا، لیکن ان کو یہ نہ بتانا کہ میں نے ایسا کہا ہے۔''

جڈ، کیپٹن اے آر جڈ، سواس میں عارضی ملازم تھے جن کی خدمات ان لوگوں کو پڑھانے کے لیے لی گئی تھیں جو ہندوستان میں تجارتی فرموں کے نمائندے کے طور پر جاتے تھے۔ جڈ کا پس منظر یونیورسٹی کے دوسرے اساتذہ سے بالکل مختلف تھا۔ مجھے ان کے بارے میں جو کچھ معلوم ہوا وہ انھی کی زبانی معلوم ہوا۔ ان کا تعلق نورفوک سے تھا جیسا کہ ان کے منھ کھولتے ہی پتا چل جاتا تھا۔ انھوں نے کوئی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ میرا اندازہ ہے کہ انھوں نے چودہ سال کی عمر میں اسکول چھوڑ دیا تھا۔ اس زمانے میں لڑکپن میں اسکول چھوڑنے کی یہی عمر ہوتی تھی۔ رائل نورفوک رجمنٹ میں بطور پرائیویٹ یعنی غیر سرکاری فوجی ملازم بھرتی ہوئے۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران یا اس کے فوراً بعد ان کی رجمنٹ ہندوستان بھیج دی گئی جہاں وہ دوسری جنگ عظیم تک مسلسل رہی۔ کسی وجہ سے شروع ہی میں انھیں اردو سے دلچسپی پیدا ہو گئی اور انھوں نے اردو پر عبور حاصل کرنے کا تہیہ کر لیا۔ جیسا کہ بہت سے لوگ جانتے ہیں، یہ بات کسی شخص کو اردو بولنے والوں میں جلد ہی مقبول کر دیتی ہے اور وہ ایسے شخص کی بخوشی مدد کرتے ہیں۔ یوں انھوں نے جڈ کو بھی اردو دنیا کی بہت سی معروف شخصیتوں سے متعارف کرایا۔

میرے تمام اساتذہ میں جڈ ہی سب سے قابل ذکر ٹیچر تھے اور میں ان کا بے حد مقروض ہوں۔ اپنے تجربے سے انھوں نے ان مشکلات کو سمجھ لیا تھا جو اردو سیکھنے والے انگریز کو پیش آتی ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ان مشکلات کو کیسے سمجھائیں۔ اردو پر ان کو حیرت انگیز عبور حاصل تھا۔ وہ نہ

Scanned with CamScanner

صرف انتہائی سہولت سے اردو بولتے تھے — رواں اور کوئی غلطی کیے بغیر: میں نے اپنی زندگی میں انگریزی مادری زبان والے کسی شخص کو ایسی اردو بولتے ہوئے نہیں دیکھا— بلکہ ان کی تحریر خوشخط اور پختہ تھی جس کے کچھ نمونے اب بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔ دسمبر 1941 میں جب جاپان دوسری جنگ عظیم میں کود پڑا تو فوجی انتظامیہ نے جڈ کی اس غیر معمولی صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں فوجی مینوئلز کا اردو ترجمہ کرنے پر ملازم رکھ لیا۔ ان کو اپنے ماتحت کام کرنے کے لیے اردو بولنے والی ایک ایسی ٹیم کی ضرورت تھی جس کو اچھی خاصی انگریزی آتی ہو۔ فوجی انتظامیہ کو یہ اندازہ ہو گیا کہ اس کام کے لیے ان کے اختیارات بڑھانے ہوں گے جس کے لیے ان کو ترقی دے کر کیپٹن کے عہدے پر مامور کر دیا گیا۔

جڈ کو خاص دلچسپی زبان سے تھی، اور اس میں بھی محاوروں اور ضرب الامثال سے۔ ان کی اردو کی واحد خامی یہ تھی کہ اپنی بات چیت میں وہ ضرب الامثال کا بکثرت اور بے جا استعمال کرتے تھے۔ انھیں بہت سے فحش الفاظ یاد تھے اور کلاس میں پڑھاتے ہوئے وہ اکثر ان میں سے کوئی لفظ بولتے، ہنستے اور ایک ہاتھ اپنے منھ پر رکھ کر کہتے، ''اوہ، میں تمھیں اس کا مطلب نہیں بتا سکتا۔'' ڈیوڈ جواب میں ہمیشہ بہ اصرار کہتا، ''چلیے سر! بتا بھی دیجیے،'' جس پر وہ بتا دیتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ لفظ ''چپٹی'' کے معنی میں نے انھی سے سیکھے تھے (پلیٹس کے لغت میں اس کے معنی لاطینی میں لکھے ہوئے ہیں جس کے معنی ہیں: دو عورتوں کا شہوانی رشتہ)۔ یہ لفظ ایک تک بندی کی دوسری سطر میں اس طرح آیا ہے:

''آؤ پڑوسن چپٹی کھیلیں...''

جڈ کی انگریزی کی محدود تعلیم کا ایک عجیب و غریب نتیجہ یہ نکلا تھا کہ ان کا اردو ذخیرۂ الفاظ انگریزی سے کہیں زیادہ وسیع تھا۔ کبھی کبھار انگریزی متبادل ہوتے ہوئے بھی وہ کسی اردو لفظ کے معنی وضاحت سے سمجھاتے تھے کیونکہ وہ خود انگریزی لفظ سے واقف نہ ہوتے تھے۔ اسی وجہ سے ایسے اردو الفاظ کا محل استعمال سمجھانے میں وہ بہت تفصیل سے کام لیتے۔ مطلب سمجھانے کے لیے اکثر اشاروں سے بھی کام لیتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ''بگلا بھگت'' کے معنی انھوں نے کس طرح سمجھائے تھے۔ پہلے بتایا تھا کہ بگلا ایک پاؤں پر کھڑا ہوتا ہے، وہ بظاہر کسی چیز پر توجہ نہیں دیتا لیکن اچانک بجلی کی سی سرعت سے اپنی چونچ سے مچھلی پکڑ لیتا ہے۔ یہ سمجھانے کے لیے وہ خود ایک پیر پر کھڑے ہوئے اور

اچانک اپنے سر کو غوطہ دیا تھا۔

لفظوں پر جڈ کی غیر معمولی گرفت کا مجھے اس وقت اندازہ ہوا جب ہم ساتھ بیٹھ کر متن پڑھتے تھے۔ ہارلی کی کتابوں کے چوڑے حاشیے ان تشریحات سے بھرے پڑے تھے جو برسوں پہلے کسی ایسے شخص نے ان کو سمجھائی تھیں جس کو وہ ''میرا پرانا منشی'' کہتے تھے۔ جڈ کو اس طرح کی کسی مدد کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔ میں اپنی کتاب لے کر کمرے میں داخل ہوتا اور ہم پڑھنا شروع کر دیتے تھے۔ بغیر کسی تیاری کے وہ اردو کے کسی بھی متن کو پڑھ سکتے تھے، اس کی باریکیاں سمجھا سکتے تھے۔ مجھے بس یہ کرنا ہوتا تھا کہ ان کے برابر جا بیٹھتا، کتاب کھولتا اور کہتا: ''یہاں سے شروع کریں۔'' میرے سامنے کبھی کوئی ایسا لفظ نہیں آیا جس کے معنی وہ نہ جانتے ہوں۔

اتنی ہی حیرت انگیز اردو ادب سے ان کی لاعلمی بھی تھی۔ ہمارے نصاب میں رتن ناتھ سرشار کے فسانۂ آزاد کا ایک انتخاب بھی شامل تھا۔ یہ انیسویں صدی کا سب سے زیادہ معروف ناول نما ہے۔ اس کے مصنف نے بڑی پُر لطف اور شگفتہ زبان لکھی ہے اور اس میں روزمرہ اور مقامی بول چال کا زیادہ استعمال ہے۔ اس وجہ سے جڈ کی خوشی کبھی تھمتی نہ تھی۔ وقتاً فوقتاً وہ کہہ اٹھتے، ''یہ بہت اچھی کتاب ہے! کس نے لکھی ہے؟'' پہلے دن انھوں نے کتاب اٹھائی اور اس کے پشتے کو دیکھا، لیکن وہاں مصنف کا نام درج نہیں تھا۔ بہر حال، مصنف کے نام سے انھیں کوئی مطلب بھی نہیں تھا، ان کی دلچسپی تو زبان سے تھی، ادب سے نہیں۔ زبان کا ان کو جتنا علم تھا اس سے اندازہ تو یہ ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ بہت وسیع رہا ہوگا لیکن اس میں بھی ان کا واحد مقصد زبان سیکھنا ہی رہا ہوگا۔ چنانچہ نہ تو وہ ادیبوں کو جانتے تھے اور نہ جاننے کی پروا کرتے تھے۔ اگر میری ادب میں دلچسپی تھی تو یہ میرا کام تھا کہ میں دوسرے اساتذہ سے معلوم کروں۔

جیسا کہ توقع کی جا سکتی ہے، جڈ کو اس انگریزی نخوت و برتری کے خبط کا شکار ہونا پڑا جس کے وہ ہرگز مستحق نہ تھے۔ لیکن ہندوستانی فوجوں کے برطانوی افسروں کے مقابلے میں بہتر اردو جاننے کے سبب ان کی حق بجانب خود اعتمادی نے انھیں اس قسم کی صورت حال پر ہنسنا سکھا دیا تھا۔ ایک دن انھوں نے مجھے بتایا کہ ایک بار ہندوستانی فوج کا ایک افسر جی ڈی پائبس (G.D.Pybus) (جس نے اردو عروض اور علم البیان پر ایک مفید کتاب لکھی) اور جڈ کسی امتحان میں ایک ساتھ بیٹھے۔ امتحان

گاہ تک پہنچنے کے لیے ایک ندی کو کشتی کے ذریعے پار کرنا تھا۔ جڈ کشتی کے ایک سرے پر بیٹھ گئے جبکہ دوسرے سرے پر پائبس ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ پائبس نے اردو پر جڈ کی غیر معمولی مہارت کے بارے میں سن رکھا تھا۔ اس نے دیکھا کہ سامنے بیٹھے ہوئے شخص نے ایک معمولی انگریز سپاہی کی وردی پہن رکھی ہے اور اچانک اس احساس سے مغلوب ہو کر کہ سامنے بیٹھا ہوا آدمی کون ہو سکتا ہے، وہ چیخ کر بولا، "Are you that bloody fellow, Judd?" (کیا تم ہی وہ کم بخت جڈ ہو؟) جڈ نے مجھے یہ قصہ ہنس ہنس کر سنایا، ان کے لہجے میں ذرا بھی تلخی نہیں تھی۔ سوایس میں ان کے مقابلے میں جڈ کے تئیں 'برتر' لوگوں کا رویہ، جن میں ہارلی بھی شامل تھے، کسی قدر نرم تو تھا لیکن دوستانہ ہرگز نہ تھا۔

میرے تیسرے ٹیچر کا نام حامد حسن بلگرامی تھا۔ اردو جاننے والے ان کے نام سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان کی مادری زبان اردو تھی، کیونکہ بلگرام لکھنؤ کے قریب واقع ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، اور لکھنؤ اپنی شاندار اردو کے لیے مشہور ہے۔ سوایس میں وہ 'اوورسیز لیکچرز' کے طور پر آئے تھے۔ پہلے وہ دہرہ دون کے دون اسکول میں ٹیچر تھے جو ایک نفیس قسم کا اور مہنگی فیس والا اسکول ہے۔ مطبوعہ تحریروں کے نام پر ان کی ایک چھوٹی سی کتاب طالب علموں کو خلاصہ نگاری کی مشق کرانے کے بارے میں تھی۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے انھوں نے یونیورسٹی سطح پر پہلے کبھی نہیں پڑھایا تھا۔ مجھے اس کا علم نہیں کہ ان کا انتخاب کس طرح عمل میں آیا، نہ ہی مجھے ان کے اردو ادب کے مطالعے کی وسعت کے بارے میں کوئی علم ہے۔ مجھے یہ یاد ہے کہ ایک نظم انھوں نے اٹھارھویں صدی کے عظیم شاعر سودا سے منسوب کی تھی جس کے بارے میں مجھے بعد میں پتا چلا کہ جرأت کی ہے، جو سودا سے بعد کے اور ان سے چھوٹے شاعر ہیں۔ اسی طرح عصرِ حاضر کے سب سے مشہور شاعر فیض کو وہ فیض محمد فیض کہتے تھے، حالانکہ اتنی بات تو میں بھی جانتا تھا کہ ان کا نام فیض احمد فیض ہے۔ اقبال کے بارے میں ان تبصرہ تھا، ''کچھ بالغ نظر لوگوں کا خیال ہے کہ ابھی اقبال پر لکھنا قبل از وقت ہے۔ میں نے خود بھی ابھی ان پر نہیں لکھا ہے۔'' لیکن بہ حیثیت استاد وہ ایک با اصول اور بہ حیثیت انسان ایک مہربان شخص تھے، اور میں ان کا زیرِ بار ہوں۔

جڈ کے تئیں بلگرامی کا رویہ بھی ہارلی سے مختلف نہیں تھا۔ ایک بار میں نے ان سے جڈ کی اردو پر

Scanned with CamScanner

غیر معمولی گرفت کا ذکر کیا تو جواباً ان کا انداز کچھ ایسا تھا گویا کوئی بدبودار چیز ان کی ناک کے قریب لے آیا ہو۔ بولے، ''ہم کہاوتیں ہر وقت استعمال نہیں کرتے۔'' جڈ کی اردو پر یہ تنقید بالکل درست تھی لیکن اس سے جڈ کے تئیں کسی کو حقارت کا رویہ رکھنے کا اختیار ہرگز نہیں مل جاتا۔

ہارلی اور بلگرامی دونوں سے مجھے پتا چلا کہ اردو بولنے والے اپنی زبان پر کتنے نازاں ہیں اور اس کا معیار برقرار رکھنے کے لیے فکرمند رہتے ہیں۔ حالانکہ ان کا معاشرہ بھی امیرانہ راوایات اور طبقاتی اقدار سے مملو ہے لیکن جیسے ہی زبان کی بات سامنے آتی ہے ان کا طبقاتی فرق مٹ جاتا ہے۔ اٹھارھویں صدی کے بیشتر حصے میں شہرِ دہلی کی اردو کو معیاری زبان سمجھا جاتا تھا جو مغل سطوت کا مرکز تھا۔ وہ بھی یہاں کے صرف طبقۂ امراہی کی زبان کو معیاری نہیں مانا جاتا تھا بلکہ ہر اس شخص کی زبان جو دہلی میں پیدا ہوا اور پرورش پایا ہو، معیاری سمجھی جاتی تھی۔ اٹھارھویں صدی کے عظیم شاعر میر نے کہا تھا کہ اردو جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بولی جاتی ہے — وہ شاندار مسجد جو شاہجہاں کے زمانے میں بنی تھی اور جہاں ہر طبقے کے لوگ اکٹھے ہوتے تھے۔ ہارلی ہمیشہ یہ بات زور دے کر کہتے تھے، ''میرے پرانے منشی دہلی کے رہنے والے تھے،'' جس کے بین السطور یہ دعویٰ پوشیدہ تھا کہ ان کا کہا ہوا ہر حرف حرفِ آخر ہوتا تھا۔ اٹھارھویں صدی کے نصف آخر میں لکھنؤ اردو کا دوسرا مرکز بن گیا۔ یہاں بھی یہی اصول تسلیم کیا گیا کہ یہاں کے تمام اردو بولنے والوں کی زبان درست معیاری زبان کہلانے کی مجاز ہے۔ بلگرامی نے بتایا کہ ایک بار لکھنؤ کے چند لوگ یہ بحث کر رہے تھے کہ بارش کی باریک پھوار کے لیے معیاری لفظ کون سا ہے۔ ایک جاروب کش عورت اس وقت وہاں جھاڑو لگا رہی تھی۔ ذرا توقف سے اس نے مداخلت کی اور بولی۔ ''جناب، ہم اس کو ترشح کہتے ہیں۔'' ہندو معاشرے میں جاروب کش اچھوت ہوتے ہیں اور مسلمان بھی، اپنے اس دعوے کے باوجود کہ اسلام میں ذات پات نہیں مانی جاتی، ان کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتے ہیں۔ لیکن زبان کے معاملے میں اس جاروب کش عورت کے اختیار پر کسی نے اعتراض نہیں کیا۔

ہمارے نصاب کی سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ طالب علموں میں روانی کے ساتھ اردو بولنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے سلسلے میں کوئی توجہ نہیں دی گئی تھی۔ اردو سیکھنے میں میری دلچسپی یہ تھی

Scanned with CamScanner

کہ میں اردو بولنے والوں سے آسانی سے بات چیت کرسکوں، لیکن اب مجھے حیرت یہ ہورہی تھی کہ سوالیس کے نصاب میں اس پہلو کو کوئی معقول جزو نہیں سمجھا گیا تھا۔ میں نے طے کرلیا تھا کہ بولنے میں روانی برقرار رکھوں گا اور روزمرہ کا ذخیرۂ الفاظ بڑے پیمانے پر بڑھانے کی کوشش کروں گا۔ پارٹی کے رابطوں کا فائدہ اٹھا کر میں اردو مادری زبان والے تین کمیونسٹ ساتھیوں سے ملا جو لندن یونیورسٹی کے کالجوں میں پوسٹ گریجویشن کررہے تھے۔ یہ تھے: علی گڑھ کے رفعت عثمانی، بریلی کے مقبول احمد اور حیدرآباد دکن کی ایک خاتون سردار محبوب۔ ان میں سے ہر ساتھی روزانہ لنچ بریک میں میرے ساتھ بالمشافہ گفتگو کرنے کے لیے تیار ہوگیا۔ الٰہ آباد کے ایک صاحب انصار اللہ تھے، وہ بھی کبھی کبھی میرے ساتھ نشست کرتے تھے۔

ڈیوڈ ہوربرگ اکثر اپنے ہندوستانی دوستوں اور کچھ میرے دوستوں کے ساتھ تفریح کا پروگرام بناتا رہتا تھا۔ ایسے ہی ایک موقعے پر مجھے یاد ہے کہ ہم لوگ شہر سے باہر کینٹ گئے تھے اور ٹنبرج ویلز (Tunbridge Wells) کے قریب ایک ندی کی سیر کی تھی۔ فوج میں رہ کر ڈیوڈ نے اردو کے جتنے الفاظ سیکھے تھے ان میں کچھ چنیدہ گالیاں بھی تھیں۔ ان سب گالیوں کی مشترکہ خصوصیت یہ ہے کہ ان کا نشانہ براہ راست وہ شخص نہیں ہوتا جس کو گالی دی جاتی ہے بلکہ اس کے گھر کی عورتیں ہوتی ہیں — اس کی ماں، بہن، بیٹی اور بیوی۔ اس سیر کے موقعے پر ڈیوڈ نے ہمارے ہندوستانی دوستوں کو اس وقت بہت سراسیمہ کردیا جب وہ ان پر زور سے چیخا: ''تیری ماں کی چو...'' اس نے گالی کو ذرا طول دیا اور اس طرح جملہ پورا کیا، ''...چوڑیاں۔''

سوالیس کے ارباب اختیار کے ساتھ میرے تعلقات پر ہمارے سیاسی اختلافات کا کوئی اثر محسوس نہ ہوتا تھا۔ جین ٹرنر نے مجھے بتایا تھا کہ جب اس نے اپنے انکل کو، جو سوالیس کے ڈائرکٹر تھے، یہ بتایا کہ رسل ایک پرجوش کمیونسٹ ہے تو وہ اس پر ہنس پڑے تھے۔ شاید ان کا خیال یہ تھا کہ میں چونکہ کیمبرج سے فارغ ہوں اس لیے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ دوسرے لوگوں کو یہ بات معلوم تھی یا نہیں مجھے کبھی پتا نہیں چلا۔ لیکن اگر وہ جانتے تھے تو بھی ہمارے باہمی احترام کے رشتے میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا۔

Scanned with CamScanner

جس ڈور نے ہمیں آپس میں باندھ رکھا تھا وہ تھی مطالعے کے موضوعات میں ہماری دلچسپی۔ میں جس قدر محنت کرتا تھا اور جیسے جیسے زبان پر میری گرفت بڑھتی جا رہی تھی وہ اس کے اتنے ہی معترف ہوتے جاتے تھے۔ (ایک طالب علم نے مجھے بتایا کہ ایک بار ہارلی نے اس سے کہا تھا کہ رسل کی اردو اتنی اچھی ہوگئی ہے کہ میں اس کے سامنے بولتے ہوئے یہ سوچ کر بہت محتاط رہتا ہوں کہ کہیں کوئی غلطی نہ ہو جائے۔) شاید سب سے زیادہ تعجب خیز رشتہ میرے اور پروفیسر جے بی فرتھ (J.B.Firth) کے مابین بنا۔ پروفیسر فرتھ شعبۂ صوتیات ولسانیات کے سربراہ تھے۔ میرے لیے یہ تصور ناممکن تھا کہ وہ میرے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہوں گے۔ انھوں نے ہندوستان میں رہ کر کام کیا تھا، سامراجیت ان کے خون میں شامل تھی، بڑی بے جا قسم کی انگریز شاونیت ان کے مزاج کا حصہ تھی، اکاڈمکس میں لوگوں کو دھونسانے والے اور حاکمانہ بالادستی کے حامل شخص تھے۔ ان کی شخصیت کے یہ اوصاف بہ آسانی ظاہر ہو جاتے تھے کیونکہ وہ انھیں چھپانے کی کبھی کوشش نہیں کرتے تھے۔ ماہرینِ صوتیات کا برٹش اسکول ان کی گفتگو کا محبوب موضوع تھا— جس میں وہ لفظ 'برٹش' پر خصوصی زور دیتے رہتے تھے۔ وہ اس پر مصر رہتے کہ ہندوستانی شعبے کے تمام طلبا صحیح تلفظ سیکھنے کے لیے ان کے شعبے سے ضرور رجوع کریں۔

اس سب کے باوجود ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ مجھے کبھی پتا نہیں چل سکا کہ ہندوستان میں قیام کے زمانے میں انھوں نے کیا کیا کیا لیکن ایک بے حد قابلِ قدر کام یہ کیا کہ ہندوستانی زبانوں کو رومن رسم خط میں لکھنے کا طریقہ ایجاد کرنے میں بڑا تعاون دیا۔ میں آج بھی اس طریقے کو فردین اسکرپٹ (Firthian Script) کہتا ہوں اور آج بھی یہ سمجھتا ہوں کہ زبانیں سیکھنے کے عمل میں ابتدائی سطح پر یہ اسکرپٹ (تقریباً) مثالی معاون ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اردو رسم خط کے برخلاف اس میں ایک آواز کے لیے ایک ہی حرف کے استعمال کا اصول اختیار کیا گیا ہے۔ میں ان کی اس لیے بھی قدر کرتا ہوں کہ اپنے موضوع سے انھیں والہانہ لگاؤ تھا۔ ہر ہفتے، بدھ کی صبح وہ ایک نشست رکھتے جس میں ہر کوئی شرکت کر سکتا تھا۔ اس میں وہ زبان کے بارے میں اپنے خیالات بے تامل پیش کرتے تھے۔ روایتی انداز کی قواعد کا اکثر مذاق اڑاتے تھے۔ ایک بار کہنے لگے، لفظ آن (on) حرفِ جار ہے لیکن ذرا بتائیے کہ اس جملے میں کیا ہے؟ He went on and on and

on۔ وہ اس بات پر بھی زور دیتے تھے کہ ہر لفظ کے معنی میں اس کے تمام اطلاقی معنی بھی شامل ہوتے ہیں۔ ''اپریل سے تم کیا مراد لیتے ہو؟'' انھوں نے پوچھا۔ کسی نے جواب دیا، ''بارش،'' کسی نے کہا، ''انکم ٹیکس،'' کوئی بولا، ''شادیاں''۔ فرتھ کہنے لگے کہ درحقیقت اپریل کے یہ تمام معنی ہوتے ہیں۔ ان کی اس طرح کی باتوں سے میں بڑا متاثر ہوتا تھا۔

میرے اساتذہ میں فرتھ پہلے ٹیچر تھے جنھوں نے اس بات پر زور دیا کہ طالب علموں کو اردو بولتے وقت درست تلفظ ادا کرنا چاہیے۔ میں بھی بڑی شدت سے یہی بات محسوس کرتا تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ فوج میں میرے اردو کے ٹیچر کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی کہ میرا تلفظ درست ہے یا نہیں۔ اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ میں جو کچھ بولتا ہوں لوگ اسے سمجھ لیتے ہیں۔ اس کے سبب بہت سے الفاظ کا غلط تلفظ میری زبان پر چڑھ گیا تھا اور اب اس کو درست کرنا خاصا مشکل محسوس ہوتا تھا۔ ایک بار اپنی بات ادھوری چھوڑ کر وہ مجھ سے بولے، ''تم ڈربی یا اس کے شمال میں واقع کسی علاقے میں پیدا ہوئے تھے یا تمھارا بچپن وہاں گزرا ہے۔'' میں نے کہا درست ہے، جس پر وہ بولے، ''ہاں، اسی لیے تم سے 'h' کی آواز نہیں نکلتی ہے۔'' میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا لیکن مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ بعد میں 'h' کی اس کمی کو میں نے کب دور کیا۔ بہرحال میں اس چھوٹے سے واقعے سے بہت متاثر ہوا تھا۔

اردو میں میری اچھی استعداد کے سبب ان کے دل میں میرے لیے جلد ہی جگہ بن گئی اور انھوں نے گرمجوشی سے اس کا اظہار بھی کیا۔ چونکہ وہ سواس کے ایک بااختیار شخص تھے اس لیے اس سے سواس میں میری حیثیت کو مستحکم ہونے میں مدد ملی۔ ایک اور کمیونسٹ طالب علم ایلن ہیوز (Alan Hughes) کے ساتھ فرتھ کا رویہ اُسی طرح کا تھا جیسا کہ ان کے سیاسی رویے تھے۔ ایلن ویلش نسل کا تھا اور ویلش قوم پرستی کے تئیں وہ شدید ہمدردی رکھتا تھا۔ کسی غیر معروف جگہ پر اس نے ایک مضمون چھپوایا جس میں اس موضوع پر اس نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ کسی طرح فرتھ کو اس کا علم ہو گیا۔ انھوں نے ایلن کو اپنے آفس میں بلایا اور بغیر کسی لاگ لپیٹ کے کہا کہ شعبے میں کسی کو بھی یہ اختیار نہیں ہے کہ مجھے دکھائے بغیر وہ اپنی کوئی تحریر کسی جگہ چھپوائے۔ جب ایلن نے مجھے یہ واقعہ سنایا تو میں نے اس سے کہا کہ تم کو فرتھ سے صاف کہہ دینا چاہیے تھا، ''جہنم میں جاؤ! ہم کو پورا اختیار ہے کہ اپنی پسند کی کوئی تحریر جہاں چاہیں چھپوائیں۔'' لیکن ایلن نے فرتھ سے کوئی جھگڑا مول نہیں لیا۔

Scanned with CamScanner

شعبۂ ہندوستان کے صدر برو نے ایک نئی کتاب Teach yourself Hindustani (لفظ ہندوستانی، اردو کا ایک قدیمی برطانوی متبادل ہے) پر مجھ سے رائے مانگ کر گویا میری غیر معمولی ستائش کی۔ میں نے اس کو ستائش اس لیے سمجھا کہ یہ کتاب سواس کے اساتذہ کے کام کا نتیجہ تھی، اور انھوں نے مجھ جیسے طالب علم کی رائے طلب کی تھی۔ گراہم بیلی کا حال ہی میں انتقال ہوا تھا اور ان کے چھوڑے ہوئے کاغذات کی بنیاد پر ہارلی نے یہ کتاب تیار کی تھی۔ اس میں فرتھ نے بھی معاونت کی تھی۔ اپنے مخصوص رویے کے مطابق فرتھ نے کتاب کی ہر طرح کی خامیوں کے لیے ٹائٹل کے صفحے پر خود ذمے داری لی تھی — جو میرے خیال میں درست نہیں تھا، جیسا کہ کتاب کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ ان کا واحد تعاون تلفظ پر ایک بہت عمدہ تعارفی مضمون تھا۔ اس میں وہ تمام مشقیں بھی شامل کر دی گئی تھیں جو وہ ہمیں تلفظ والی کلاس میں کراتے تھے۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ برو مجھ سے کیا توقع کر رہے تھے — جو کچھ میں نے لکھ کر دیا اس کی تو ہرگز نہیں کر رہے ہوں گے۔ میں نے پوری کتاب کو لفظ بہ لفظ پڑھا، اس کی ہر خامی کو نشان زد کیا اور ایک تفصیلی تبصرہ لکھ کر برو کو دے دیا۔ انھوں نے یہ تبصرہ فرتھ کو بھی دکھایا لیکن فرتھ نے اس کا برا نہیں مانا، حالانکہ میں نے ان کے مضمون میں بھی غلطیاں نکالی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ اس میں ایک لفظ ''بھانا'' کے معنی دیے تھے — to be pleased جبکہ اس کے معنی to please ہوتے ہیں۔ اسی طرح لفظ ''آقا'' کو مہمل بتایا گیا تھا، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ بالکل درست لفظ ہے اور ''ماسٹر'' کے معنوں میں (مثلاً آقا اور غلام کا رشتہ) ایسا اجنبی بھی نہیں ہے۔

تقریباً انھی دنوں فرتھ کو بنگلور کی ایک باحیثیت لیڈی امینہ خاتون نے اس کتاب پر ایک مفصل ناقدانہ تبصرہ بھیجا۔ یہ ایک طویل خط کی صورت میں تھا جو اس نے اردو میں تحریر کیا تھا اور وجہ یہ لکھی تھی کہ زبان کے ایک ماہر کو اسی زبان میں مخاطب کرنا مناسب ہے (غالباً وہ بن کر طنزاً ایسا کہہ رہی تھی)۔ فرتھ نے وہ خط ذرا نخوت کے ساتھ یہ کہہ کر مجھے دیا کہ اسے پڑھنے کا مجھ سے زیادہ تمھارے پاس وقت ہے۔ بجا طور پر میں نے اسے پڑھا اور فرتھ سے کہا کہ میرے خیال میں اس کے تقریباً سارے تنقیدی نکات درست ہیں۔ (میں نے بھی جو خامیاں نکالی تھیں وہ تقریباً ایسی ہی تھیں۔) میرے تبصرے پر انھوں نے جو جواب دیا اس کا لبِ لباب یہ تھا کہ انھیں تمام غلطیاں تسلیم ہیں، لیکن ساتھ ہی

Scanned with CamScanner

یہ بھی کہا تھا، ''لیکن گراہم بیلی جو کچھ جانتے تھے اس کا اعتراف بھی کرنا چاہیے۔'' یہ آخری جملہ تھا جو اس کتاب کے بارے میں نے سنا۔

اب میرے ذہن میں یہ بات صاف ہوگئی تھی کہ مجھے لیکچرشپ چاہیے، جس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے اوّل آنا ہوگا۔ لیکن چونکہ ڈگری کے لیے یہ کورس پڑھنے والا میں پہلا طالب علم تھا تو میرے پاس یہ جاننے کا کوئی طریقہ نہیں تھا کہ اوّل آنے کا معیار کیا ہے۔ میں صرف اتنا ہی جانتا تھا کہ مجھے ہر ممکن کوشش کرنی ہے۔ میں نے اپنی اس پریشانی اور چیلنج کا ذکر ایک خط میں اپنے دوست آر کے روپر (R.K.Roper) سے کیا جو چگویل اسکول میں چیپلن رہے تھے۔ ہمارے بیچ رشتہ برابری کا سا تھا، جو عموماً اساتذہ کے ساتھ ممکن نہیں ہوتا۔ انھیں مجھ سے اور دوسروں سے بھی سچی مشفقانہ دلچسپی تھی۔ میں ان کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار آزادانہ طور پر کردیتا تھا اور انھوں نے میری سیاسی وابستگی کو میرے ایک اچھا انسان بننے کا راستہ مان کر قبول کیا تھا۔ جب میں نے ان کو اردو اور سنسکرت کے مطالعے میں درپیش مشکلات لکھیں تو ان کا جواب آیا:

> اگر تم یہ کہتے ہو کہ زندگی میں پہلی بار تمھیں اس قدر مشکلات سے واسطہ پڑا ہے تو یہ سوچ کر مجھ پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے کہ تم کس قدر محنت کر رہے ہو، کیونکہ چگویل میں وقت ضائع کرتے تمھیں کبھی کسی نے نہیں دیکھا۔

میں گھنٹوں میز پر گزرنے والے وقت کی کوئی پروا نہیں کرتا تھا— میں خوش تھا۔ اپنی ذہنی رو کو سانچوں میں ڈھالنا مجھے اچھا لگتا تھا، اور ایک بالکل نئی طرح کا، مختلف قسم کا انٹلکچوئل چیلنج قبول کرنے میں مجھے خاصا مزہ آرہا تھا۔ نصاب حالانکہ بہت زیادہ تھا، لیکن اس کے لیے وسیع مطالعے کی ضرورت کو میں خوش آمدید کہتا تھا۔ مجھے انگریزی ادب سے محبت تھی۔ لاطینی اور اس سے بھی زیادہ یونانی مصنفین سے محبت تھی جنھیں میں نے پڑھا تھا۔ وہ یوروپی کلاسکس بھی جن کا ترجمہ مجھے مل سکا اور میں نے پڑھا تھا، مجھے بہت پسند تھے۔ اب مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ میرا تعارف سنسکرت اور اردو زبانوں کے ادب سے بھی ہو رہا ہے۔

9

پارٹی کی مقامی شاخ اور اس کی سرگرمیاں

تعلیمی کام کا مجھ پر جتنا بھی دباؤ ہو، میں نے طے کرلیا تھا کہ پارٹی کی مقامی شاخ میں کام کرنے کے لیے وقت ضرور نکالوں گا۔ حالات کے جبر سے اتنے طویل عرصے تک تنہا کام کرنے کے بعد میرے سامنے ایک بار پھر اجتماعی کام کرنے کا موقع تھا۔ پارٹی کی اصولی روایت یہ تھی کہ طالب علم طلبا کی تنظیم ہی میں کام کرے گا۔ لیکن اس طرح کا کام تو میں پہلے ہی کر چکا تھا۔ اب میں مقامی شاخ کا حصہ بننا چاہتا تھا، اس علاقے کے عام اراکین کے ساتھ رہنا چاہتا تھا جہاں میری رہائش تھی، صرف دانشوروں کے ساتھ نہیں۔ محض اتفاق سے، سبکدوش کامریڈوں کے اسکول میں میری ملاقات موری لیویٹاس (Morry Levitas) سے ہو چکی تھی جو جلد ہی اِس علاقے میں رہائش اختیار کرنے والا تھا۔ اس نے بڑے جوش کے ساتھ اس موضوع پر بات کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم مقامی اسٹارچ گرین (Starch Green) شاخ میں ساتھ ساتھ کس طرح کام کریں گے۔ وہ اب یہاں کا سکریٹری اور منتظم اعلیٰ تھا اور یہ بات واضح تھی کہ وہ اس کام میں خاصی توانائی صرف کرے گا۔

پہلی ہی میٹنگ میں جو کچھ نظر آیا وہ کچھ حوصلہ افزا نہیں تھا۔ ہماری شاخ کا علاقہ ہیمر اسمتھ (Hammersmith) کے سارے شمالی علاقے کو محیط تھا جو وائٹ سٹی (White City) کی حدود تک پھیلا ہوا ہے (وائٹ سٹی اس میں شامل نہیں تھا)۔ اس کے اراکین کی فہرست میں چالیس سے پچاس کے درمیان نام شامل تھے۔ لیکن یہ رکنیت محض فہرست ہی تک محدود تھی ۔ میٹنگ میں بس

Scanned with CamScanner

درجن بھر ہی لوگ آئے تھے۔ اور مجھے اندازہ ہوا کہ ہمیشہ اتنے ہی لوگ آتے تھے۔ مقامی شاخوں میں کام کرنے کا میرا پچھلا تجربہ مثبت تھا۔ پہلی مقامی شاخ جس میں میں نے کام کیا تھا، وُڈفرڈ میں تھی اور دوسری کیمبرج میں۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے فل گرفتھ کو بتایا کہ ہماری کیمبرج برانچ کس طرح سے کام کرتی تھی تو وہ تقریباً بے یقینی کے ساتھ میری کہانی سنتی رہی کہ کس طرح ہمارے سکریٹریٹ کی ہفتے میں تین میٹنگیں ہوتی تھیں اور اگر کوئی ہنگامی صورتِ حال پیش آجائے تو مزید میٹنگوں کے لیے ہم کس طرح تیار رہتے تھے۔ میں نے کہا کہ میں یہ جانتا ہوں کہ ہیمر اسمتھ کی مقامی شاخیں اس کا مقابلہ نہیں کرسکتیں لیکن کم از کم برانچ کمیٹیوں کی باقاعدہ میٹنگیں تو پوری برانچ میٹنگ سے پہلے ہو جایا کریں۔ مجھے یہ اندازہ کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا کہ یہ تجربہ میرے گذشتہ تجربوں سے مختلف ہوگا، اور ان سے ایسی توقع کرنا بھی حقیقت سے بعید ہوگا۔ میں نے وُڈفرڈ برانچ میں 1934 سے 1937 تک کام کیا تھا اور اس وقت کے زیادہ تر اراکین دوسرے عام لوگوں کی طرح بے روزگار تھے۔ کیمبرج میں سارے ہی اراکین طالب علم تھے اور ہمارے پاس آپس میں مل بیٹھنے، سیاسی نظریات پر بحث و مباحثے اور سرگرمیوں کے منصوبے بنانے کے لیے خوب وقت تھا۔ 1946 کے بعد کی اسٹارچ گرین شاخ کے زیادہ تر اراکین کا تعلق محنت کش طبقے سے تھا جو دن بھر مصروف رہتے اور شام کو تھکے ہارے لوٹتے تھے۔ انگریزوں کے مزدور طبقے کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ تھیوری کو ناپسند کرتے ہیں۔

مزدور طبقے کے لوگوں کی صحبت میں ہمیشہ ہی میں نے ایک فراغت اور بے تکلفی محسوس کی تھی — وہ چاہے ہوم کے کھیت مزدوروں کے ساتھ کام کا موقع ہو یا پھر برطانوی فوج میں افسر کی حیثیت سے تربیت سے پہلے 'دیگر رینک' کے سپاہیوں کے ساتھ رہنے کا موقع۔ دونوں ہی موقعوں پر میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ گھنٹوں گزار دیتا تھا۔ یہ کام اسٹارچ گرین میں ناممکن تھا۔ ان دنوں برطانیہ میں تقریباً سبھی برسرِ روزگار تھے، یوں لوگ دن بھر کام کرتے تھے اور شامیں عموماً اپنے گھروں میں گزارنا پسند کرتے تھے۔ انگریز عورت مرد گھروں میں بھی کسی کو ملاقات کے لیے مدعو نہ کرتے، اور صرف اپنے اہل خانہ کے ساتھ وقت گزارنا پسند کرتے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ جیفرے گورر (Geoffrey Gorer) کا یہ تبصرہ کتنا درست تھا کہ "انگریزوں کا گھر ان کے لیے قلعہ نہیں بلکہ

Scanned with CamScanner

خانقاہ ہوتا ہے۔''[1] اس پر مستزاد یہ کہ برطانیہ کے دوسرے بڑے شہروں کی مانند، خصوصاً جنوبی شہروں کی مانند، اسٹارچ گرین میں بھی کوئی شخص اپنے علاقے سے کوئی قلبی لگاؤ محسوس نہ کرتا تھا۔ لوگوں میں 'اسٹارچ گرین کا شعور' جیسا کوئی احساس نہیں ملتا تھا۔ لوگ جہاں بھی رہتے بس اس لیے رہتے تھے کہ ان کو اپنی ملازمت کی جگہ کے قریب سہولت والی مناسب جگہ وہی میسر تھی۔ یہ بات ان کے تجربے کا حصہ نہیں تھی کہ وہ مقامی لوگوں کے ساتھ یہ سوچ کر ربط بڑھائیں کہ اس سے اپنے گردوپیش کے حالات پر اثر انداز ہو سکیں گے۔ اجتماعی شعور کی یہ عدم موجودگی پارٹی میں بھی نظر آنے لگی تھی۔ عوامی پارٹی بنانے کا جو احمقانہ نعرہ دیا جا رہا تھا اس کا مطلب محض اتنا ہی تھا کہ ہمارے بیشتر اراکین کی پارٹی کے ساتھ وابستگی بس اپنی رکنیت کی فیس ادا کرنے تک محدود ہو، وہ بھی اتنی کہ کوئی آ کر پیسہ لے جائے۔ جو لوگ زیادہ فعال تھے وہ بھی پارٹی کی سرگرمیوں میں اپنا زیادہ وقت صرف کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اراکین کا ایک دوسرے سے رابطہ بھی کبھی کبھار ہی قائم ہوتا تھا، اور وہ بھی نجی طور پر۔ میری جن لوگوں سے جان پہچان ہوئی ان میں سے اکثر ایک دوسرے سے واقف نہیں تھے۔ اور اسی وجہ سے پارٹی کی حیثیت سے کسی اجتماعی زندگی کا تصور بھی نہیں تھا۔

'مزدور طبقے کے شعور' کے فروغ والی بات میں بھی دم نہیں تھا۔ کمیونسٹوں میں یہ رجحان عام طور پر پایا جاتا ہے کہ وہ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ مزدور، کسان اور کاریگر طبقے کے لوگ آسانی سے ان کے مقاصد میں ساتھ دیں گے۔ جبکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ میرا خیال تھا کہ برطانیہ کے محنت کش طبقوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول تو وہ لاکھوں لوگ ہیں جن کو سیاست میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس کے معنی تھے کہ انھوں نے موجودہ صورت حال کو یوں ہی قبول کر لیا ہے، جس کا سبب یہ ہے کہ انھیں کسی اہم تبدیلی کے کوئی ذرائع نظر نہیں آتے، اور یہ بھی کہ ان کے خیال میں سیاسی لیڈر

---

[1] 1967 میں شائع ہونے والی ایک کتاب سے ماخوذ۔ اس کتاب کا مقصد برطانیہ اور یہاں باہر سے آ کر بسنے والوں کی حقیقی صورت حال سامنے لانا اور حقائق کے بارے میں پھیلے غلط تصورات کا ازالہ کرنا تھا۔ اس کتاب کے شاندار پلان نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا۔ یہ 'میزبان معاشرے' کی معروضی عکاسی سے شروع ہوتی ہے، اور اس میزبان معاشرے کا کوئی بھی فرد جو خود پر ایک ایماندارانہ نظر ڈالنے کو تیار ہو، اس مضمون سے اب بھی بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔

Scanned with CamScanner

بدمعاش ہوتے ہیں (یہ خاصا معقول جواز ہے) اور اپنے وعدے پورے نہیں کرتے۔ دوسرے قسم کے وہ لوگ ہیں جو سیاست میں صرف اتنی دلچسپی رکھتے ہیں کہ انتخابات میں اپنا ووٹ ڈال آئیں۔ ان میں سے آدھے لوگ ٹوری پارٹی کو ووٹ دے کر سرمایہ دار طبقے کو براہ راست ووٹ ڈالتے ہیں اور آدھے لوگ لیبر پارٹی کو ووٹ دے کر بالواسطہ سرمایہ دار طبقے کو ووٹ ڈالتے ہیں اور ایسے لیڈروں کے ماتحت حفظ وامان میں رہتے ہیں جو کسی طرح کا احتجاج بھی نہیں کر سکتے۔ تیسری قسم کے نام پر وہ چھوٹی سی اقلیت بچتی ہے جس میں ان باتوں کے تئیں دلچسپی پیدا کی جاسکتی ہے جو کمیونسٹ پارٹی کہتی ہے۔

طویل مدتی سماجی سیاق میں دیکھیں تو ہم ایسے دور سے گزر رہے تھے جس کا ماحول لوگوں میں ہمارے نظریات سے دلچسپی پیدا کرنے کے لیے ناسازگار تھا۔ مقامی شاخوں میں کام کے میرے پچھلے تجربات گذشتہ صدی کے چوتھی دہائی کو محیط تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب برطانیہ میں اور بین الاقوامی سطح پر بھی سیاسی اور معاشی بحران اپنے عروج پر پہنچ چکے تھے اور انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت وہ لوگ بھی محسوس کر رہے تھے جو عام حالات میں سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ اب صورتِ حال کافی بدل چکی تھی۔ خانگی بحران کم ہوا تھا تو بین الاقوامی مسائل سے بھی دلچسپی کم ہوئی تھی۔ 1945 میں لیبر حکومت کے انتخاب کو اکثر لوگ سرمایہ داری نظام میں مکمل تبدیلی لانے کی جانب ایک قدم کے طور پر دیکھ رہے تھے۔ حکومت کی اس تبدیلی کو سرمایہ دارانہ نظام کی ان پالیسیوں پر اعتراض اور تنقید کے روپ میں بھی دیکھا جارہا تھا جن کی نشان دہی پارٹی نے کی تھی اور ان پر معترض بھی تھی۔

اس کے علاوہ برطانوی سامراج کا بھی سوال تھا۔ جنگ کے عرصے میں برطانیہ کی سامراجی پالیسیاں کچھ زیادہ واضح نہیں تھیں لیکن لیبر حکومت نے آتے ہی ان پالیسیوں پر سرگرمی سے عمل شروع کردیا۔ برطانیہ کے اکثر لوگ ہمیشہ سے یہ مانتے آئے تھے کہ دنیا کے ایک چوتھائی حصے پر حکومت کرنے کا ہمیں پورا حق ہے، اور موجودہ حالات میں انھیں اس سے مختلف انداز سے سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

جہاں تک سوویت یونین کے بارے میں رویوں کا ذکر ہے تو برطانوی لوگوں نے 1941 کے برطانیہ سوویت معاہدے اور اس کے بعد کے دور کو اس طرح سمجھا گویا سوویت یونین ''ہماری

جانب آ گیا ہے۔'' جنگ کے حالات میں جب برطانیہ اور امریکہ کے ساتھ سوویت یونین کا ناگزیر تنازعہ پیدا ہوا تو انھوں نے بڑا شدید ردعمل ظاہر کیا۔ ایک آدمی نے مسز مزگروف سے کہا، ''وہ پہلے تو آپ کے ساتھ تھے اور پھر اچانک گھوم کر آپ کی پشت پر جا پہنچے اور آپ کی آنکھوں میں تھوک دیا۔'' — اس بیان پر وہ اس قدر حیران ہوئیں، کیونکہ عملی طور پر اس قسم کی حرکت ممکن ہی نہیں، کہ وہ اپنی عادت کے برخلاف جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہہ سکیں۔

ایسے ماحول میں ہمارے ساتھی خود کو تنہا محسوس کر رہے تھے۔ وہ اپنے ہی ہم پیشہ مزدوروں کی باتوں سے پریشان تھے جن کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ انھیں کھل کر ہمارے حق میں بولنا چاہیے۔ لیکن ظاہر ہے کہ وہ ہمارے ساتھ نہیں تھے۔ وہ اپنے ہاتھوں میں اپنی کمیونسٹ بندوقیں تانے اپنے زخموں کو سہلاتے ہوئے اس انتظار میں تھے کہ وہ دن آئے گا جب حالات ان کے حق میں بہتر ہو جائیں گے۔ اپنے ابتدائی دنوں سے ہی ایک خاصے بڑے حصے پر مشتمل پارٹی کارکنان خالص آدرشوں میں یقین رکھتے تھے، وہ اپنے انقلابی نظریات پر نازاں تھے اور یہ جاننے کی ان کے دلوں میں کوئی خواہش نہیں تھی کہ آخر دوسرے لوگ ان کے ہم نوا کیوں نہیں ہیں۔ وہ اپنے نظریات کا ڈھنڈورا پیٹتے تھے اور جب یہ دیکھتے تھے کہ اس کا کوئی خاص اثر نہیں پڑ رہا ہے تو افسوسناک حقائق کو فلسفیانہ انداز میں تسلیم کرنے سے زیادہ کچھ نہ کرتے تھے۔ ایسے لوگ اس بارے میں سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت محسوس نہ کرتے تھے کہ اس صورتِ حال میں تبدیلی لانے کے لیے کوئی حکمت عملی بنائی جائے تاکہ آہستہ آہستہ وہ وقت نزدیک آ سکے جب کافی تعداد میں لوگ اس انداز میں سوچنے لگیں جس میں ہم لوگ سوچتے ہیں اور جس سے سنجیدہ قسم کی تبدیلیاں ممکن ہو سکیں۔ اس مسئلے پر میں برسوں سے غور کر رہا تھا، یعنی 1935 میں منعقد ہونے والی کمیونسٹ انٹرنیشنل کی ساتویں عالمی کانگریس کے زمانے سے، جب میری عمر سترہ برس تھی اور پارٹی کی رکنیت اختیار کیے ہوئے مجھے صرف ایک سال ہوا تھا۔ کانگریس کے بارے میں سوویت لیڈر مینوئلسکی (Manuilsky) کی ایک رپورٹ سے میں بے حد متاثر ہوا تھا۔ اس میں انھوں نے کہا تھا، ''کمیونسٹ پارٹیاں صرف ایسی تنظیمیں بن کر نہیں رہ سکتیں جن کا کام کمیونسٹ نظریات کو فروغ دینا ہے، بلکہ ان کو مختلف ممالک میں اور پوری دنیا میں سیاسی زندگی کا سب سے اہم عنصر بننا ہوگا۔'' کیمبرج میں ہم نے اسی مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کی

Scanned with CamScanner

تھی اور میرا خیال ہے کہ قابلِ لحاظ حد تک ہم اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہوئے تھے۔ کمیونسٹ پارٹی کی یہ شاخ کیمبرج کے طلبا کی زندگی پر صریحاً خاصی اثر انداز ہوئی تھی۔ عمومی طور پر موجودہ ناسازگار صورتِ حال میں بھی ایسے موقعے آئے جن میں پارٹی نے اپنا متوقع رول پورا کیا۔

ایسا ہی ایک موقع خالی جگہوں پر قبضہ کرنے کی تحریک کی صورت میں سامنے آیا۔ رہائشی مکانات کی شدید قلت اور بڑھتی بھیڑ کے سبب ملک بھر میں لوگوں نے خالی مکانوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ مثال کے طور پر جنگ کے زمانے میں بنائی گئی فوجی جھونپڑیوں پر جو اَب خالی پڑی تھیں، اور ایسی عمارتوں پر جن کو حکومت نے جنگ کی ضرورتوں کے مدنظر اپنے تصرف میں لیا تھا لیکن ابھی تک ان کے مالکان کو واپس نہیں کیا تھا۔ دوسری جگہوں کے مقابلے میں لندن میں صورتِ حال زیادہ خراب تھی کیونکہ بمباری میں نقصان بھی یہیں زیادہ پہنچا تھا۔ اندازہ لگایا جا رہا تھا کہ لندن کے کُل رہائشی مکانات کے مقابلے میں چھ لاکھ زائد خاندان اس شہر میں مقیم تھے۔ 1946 کی گرمیوں میں احتجاج کرنے والوں نے لائسٹر اسکوئر (Leicester Square) میں مظاہرہ کیا۔ اس کے جواب میں حکومت نے مقامی کاؤنسل کی ان عمارتوں کے عارضی استعمال کی تجویز رکھی جو جنگ کی ضرورتوں کے تحت سرکاری تصرف کے لیے حاصل کی گئی تھیں، لیکن یہ فیصلہ کاؤنسلوں پر چھوڑ دیا کہ وہ انھیں بساتی ہیں یا نہیں۔ بہت سی کنزرویٹو بلدیہ کاؤنسلوں نے یہ تجویز مسترد کر دی۔ اسٹارچ گرین شاخ میں میری شمولیت سے ذرا پہلے، ستمبر میں، ہماری شاخ کے ایک معروف رکن نے اس مسئلے کی جانب توجہ دلانے میں اہم رول ادا کیا تھا۔ یہ صاحب ٹیڈ بریملی (Ted Bramely) لندن ڈسٹرکٹ کمیٹی کے سکریٹری تھے، جو شہر میں پارٹی کی سب سے بڑی تنظیم تھی۔ انھوں نے لندن کی مقامی کاؤنسلوں میں منتخب ہونے والے بہت سے کمیونسٹوں کے ساتھ مل کر بے گھر لوگوں کے ایک گروہ کی رہنمائی کرتے ہوئے کینسنگٹن (Kensington) میں واقع لگژری فلیٹوں کے ایک خالی بلاک پر قبضہ کر لیا جس کو مقامی کاؤنسل رہائشی مقاصد کے لیے دینے سے انکار کر چکی تھی۔ اس احتجاجی قبضے کو The Great Sunday Squat کا نام دیا گیا۔ اس کام میں ان کو زبردست عوامی حمایت ملی۔ پولیس نے فلیٹوں کا محاصرہ کر لیا تو مقامی لوگوں نے کھڑکیوں کے راستے سے ان کو رسد فراہم کی۔ بالآخر جب لیڈر گرفتار ہوئے تو ججوں نے بھی ہمدردی کا اظہار کیا۔ انھوں نے ان پر دو سال کے لیے پابندی لگا دی

Scanned with CamScanner

اور قبضہ کرنے والے بے گھر لوگوں کو رہنے کے لیے دوسری جگہ فراہم کی گئی۔

لیکن یہ واقعہ ایک شعلۂ مستعجل ثابت ہوا۔ عام حالات میں کسی کو بھی یہ خیال نہ آتا تھا کہ اسٹارچ گرین شاخ کبھی ایسی حیثیت حاصل کرسکتی ہے کہ اپنے علاقے کی سیاسی زندگی میں سب سے اہم عنصر بن جائے۔ لیکن میرے نزدیک بنیادی مقصد یہی تھا اور میں یہ مانتا تھا کہ ہر مقامی شاخ کو اپنی سرگرمیاں اسی مقصد کے حصول کی تیاری میں صرف کرنی چاہئیں۔

ہماری شاخ میں تین کمیونسٹ ایسے تھے جن کو کام کا واقعی تجربہ تھا۔ ان میں ایک ٹیڈ بریملی تھے۔ ان کے پاس لندن کے معاملات کی ذمے داری تھی اور وہ پارٹی کے اہم ترین رہنماؤں میں سے ایک تھے۔ دوسرے بل میسی (Bill Massy) نسلاً اسکاچ تھے اور ان کو تھیوری سے دلچسپی تھی۔ تھیوری میں دلچسپی رکھنا ایسی خوبی ہے جس کے سبب اسکاٹش محنت کش اپنے برطانوی ساتھیوں سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ بل پیشے سے پینٹر تھے اور اپنی یونین میں بہت عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ایک مہم جو ٹریڈ یونینسٹ ہونے کی وجہ سے انھیں ایسے ناروا تعصب کا بھی شکار ہونا پڑا تھا جو بھاری بے روزگاری کے دنوں میں مالکان عموماً برتتے ہیں۔ وہ اور ان کی اتنی ہی قابلِ تعریف بیوی جین (Jean) بڑے راسخ کمیونسٹ تھے اور اس صدی کی تیسری دہائی سے کمیونسٹ پارٹی کے رکن تھے۔ تیسرے کمیونسٹ موری لیویٹاس (Morry Levitas) تھے۔ وہ اسٹیپنی (Stepney) کے ایک پلمبر تھے۔ اسٹیپنی ان علاقوں میں سے ایک ہے جہاں کے عوام چوتھی دہائی میں اور جنگ کے زمانے میں کمیونسٹوں کے اثر میں تھے۔ یہاں کے لوگوں نے جنگ کے زمانے میں سیوائے ہوٹل (Savoy Hotel) پر اس جانب توجہ دلانے کے لیے دھرنا دیا تھا کہ امیر لوگ اب بھی پرتکلف کھانے کھاتے ہیں جبکہ عام آدمی کے راشن میں کٹوتی ہو رہی ہے۔ انھوں نے تہہ خانوں پر قبضہ بھی کیا تھا تاکہ حکومت کو مجبور کرسکیں کہ وہ ان کا استعمال بمباری سے حفاظت کے لیے کرے۔ انٹرنیشنل بریگیڈ کے رکن کے طور پر موری اسپین کے محاذ پر بھی لڑ چکے تھے۔

ایسے تجربہ کار تین ساتھیوں کی ہماری شاخ میں موجودگی کے سبب میں یہ توقع کر رہا تھا کہ اپنے مقاصد کے بارے میں وہ میرے نظریات سے اتفاق کریں گے اور اپنی دوسری مصروفیات کے باوجود ایک مناسب حکمتِ عملی بنانے میں اپنا زیادہ سے زیادہ وقت صرف کریں گے۔ لیکن ان میں

Scanned with CamScanner

سے دو لوگوں نے مجھے مایوس کیا۔ بل اپنی یونین کے کاموں میں اس بری طرح مصروف تھے کہ ان کے پاس پارٹی کی شاخ کے لیے نہ تو وقت بچتا تھا اور نہ توانائی۔ کینسنگٹن والے محاذ کی رہنمائی کرنے کے بعد ٹیڈ بھی سخت بیمار پڑ گئے تھے۔ اب وہ پارٹی کے ہر طرح کے کاموں سے دستبردار ہو چکے تھے، یہاں تک کہ کسی مشکل مسئلے پر مشورے تک کے لیے وہ ہمارے ہاتھ نہ آتے تھے۔ میں ان کی بیوی مارگریٹ (Margaret) سے، جو بائیں بازو کی ایک معروف سوشلسٹ طالبہ تھی، کیمبرج کے زمانے سے ہی واقف تھا — یعنی وہ ہمارے ساتھ تھی لیکن ہم میں سے نہیں تھی۔ ٹیڈ اور اس کے چوری چھپے معاشقے کے بعد انھوں نے شادی کر لی اور (میرے خیال میں) ساتھ ہی پارٹی کی رکنیت بھی لے لی۔ وہ اب ٹیڈ کی تیمارداری میں مصروف رہتی تھی اور مجھ جیسے تمام لوگوں سے انھیں محفوظ رکھتی تھی جو پارٹی کے مقامی کاموں میں کم از کم مشورے کی حد تک انھیں شامل کرنا چاہتے تھے۔ اس طرح مارگریٹ کو بھی پارٹی کی شاخ کے کسی کام سے کچھ تعلق نہیں رہ گیا تھا۔

اب رہ گئے موری اور ان کی رہنمائی میں کام کرنے والا یہ کارکن — یعنی میں۔ موری میرے اس خیال سے متفق تھے کہ مقامی شاخ کو مضبوط اور با اثر بنانا بہت ضروری ہے۔ لیکن یہ کام کیسے ہو، اس سلسلے میں ان کا اندازِ فکر سادہ اور روایتی تھا: اس طرح کہ ایک طرف ہم ہیں یعنی پارٹی کے لوگ، اور ہمارے سامنے عوام ہیں؛ ہم عوام کے پاس جائیں اور انھیں پارٹی کا صحیفہ پڑھائیں۔ اس کے لیے گھر گھر جا کر پارٹی کے پمفلٹ بیچیں، نکڑ سبھائیں کریں، پارٹی برانچ کی شام کی بیٹھکوں میں لوگوں کو بلایا جائے جہاں کمیونسٹ مقررین عصرِ حاضر کے مسائل ان کو سمجھائیں۔ نکڑ سبھاؤں پر انھیں بہت بھروسا تھا، اور شاید جنگ سے پہلے اسٹیپنی میں یہ طریقہ موثر بھی رہا تھا، لیکن جنگ کے بعد شیفرڈز بش (Shepherd's Bush) علاقے میں یہ اب کچھ خاص اثر نہ رکھتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک موقعے پر ایک میٹنگ کے منتظموں میں صرف موری اور میں ہی شامل تھے — میں صدارت کر رہا تھا اور وہ کلیدی مقرر تھے۔ میں نے اس قسم کی نکڑ سبھا میں پہلے کبھی تقریر نہیں کی تھی، لیکن ایک اچھے کمیونسٹ کی طرح مجھے کوشش کرنے میں کوئی عار نہ تھی۔ میری کوشش پر موری ہنس پڑے (لیکن مشفقانہ انداز میں) اور اس کے بعد خود تقریر کرنے کے لیے گشتی چبوترے پر چڑھ گئے۔ وہ ایک اچھے مقرر تھے، اس کے باوجود مجھے یاد نہیں کہ کوئی ایک بھی آدمی ہماری باتیں سننے کو ٹھہرا ہو۔

موری کے ساتھ کام کر کے مجھے مقامی شاخ کے طریق کار اور مقاصد کے تعلق سے ہمارے نظریاتی اختلاف کا اندازہ ہوا۔ ایک پرانے عام مقولے کے مطابق مجھے موری کی اس بات سے اتفاق تو تھا کہ ہم 'پارٹی کا چہرہ دکھائیں' تا کہ لوگوں کو پتا لگے کہ ہمارا ایک علیحدہ وجود ہے، ایک شناخت ہے، لوگوں کے مسائل پر ہمارا ایک مخصوص نقطۂ نظر ہے۔ جس کے درست ہونے کا لوگوں یقین دلانا چاہتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے ہم برطانیہ میں اس نہج پر کام نہیں کر سکتے تھے جس طرح 1917 میں روس کے انقلاب سے پندرہ سال قبل بالشیوکوں نے کیا تھا۔ روس میں وسیع پیمانے پر لوگوں میں پھیلی مایوسی اور بے اطمینانی کے سبب، حکمرانوں کی بے رحمی سے متجاوز بے وقوفی کے سبب، اور عوام کی فلاح کے لیے چھوٹے پیمانے پر ہی سہی، کوئی کام کرنے اور عوام کا دل جیتنے والی کسی دوسری تنظیم کی عدم موجودگی کے سبب کمیونسٹوں کے لیے یہ ممکن ہو سکا کہ وہ لوگوں سے براہ راست اپیل کریں اور انقلاب لانے میں ان کی قیادت کریں۔ ہمارے سامنے بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ ہم ایک ایسے وقت میں سماج کے ڈھانچے میں انقلابی تبدیلیاں لانے کے لیے کام کر رہے تھے جب برطانوی لوگوں کے دلوں میں تبدیلی کے لیے کوئی جوش و خروش نظر نہیں آتا تھا۔

ایسے میں ہم کیا کر سکتے تھے؟ ایک طرف ہم تھے جن کا عقیدہ تھا کہ انصاف پر مبنی معاشرے کی تعمیر کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کو بدل دیا جائے، لیکن ستم ظریفی یہ تھی کہ ہمیں ان لوگوں سے خطاب کرنا تھا جو اس پر تقریباً متفق تھے کہ ایسا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، اور جو اپنی عملی اور بالواسطہ حمایت ان جماعتوں کو دے رہے تھے جو اسی ذہنیت کی غماز تھیں۔ ہماری شاخ کی کھلی ناکامیوں نے مجھے یہ سوچنے کی ترغیب دی کہ پارٹی کے مقامی یونٹ کی حکمتِ عملی اور مقاصد کے لیے اپنے ذہن میں واضح فکر پیدا کروں۔ سب سے اہم یہ تھا کہ کام وہیں سے شروع کیا جائے جہاں لوگ کھڑے ہیں۔ کسی بستی میں کام کرنے والے کمیونسٹوں کو ہر اس شے سے سروکار رکھنا چاہیے جس سے اس بستی کے لوگوں کو سروکار ہے، اور یہ سروکار اسی طرح سے رکھنا چاہیے جس طرح بین الاقوامی اور قومی سیاست کے بڑے مسائل سے عموماً رکھا جاتا ہے۔ یہ اہم تو تھا کہ بڑے مسائل کے تئیں ان کے اندر دلچسپی پیدا کی جائے لیکن ان کے وقت اور توانائی کا بڑا حصہ ان مسائل کے لیے وقف نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ اس علاقے سے اچھی طرح سے واقفیت پیدا کی جائے

Scanned with CamScanner

اور کوشش کی جائے کہ مقامی شاخ کی جڑیں مضبوط ہو جائیں۔ اس کے لیے یہ پتا لگایا جائے کہ وہ کون سے مسائل ہیں جو مقامی لوگوں کے لیے سچ مچ اہم ہیں اور وہ طریقے ڈھونڈے جائیں کہ ان مسائل سے نمٹا جا سکے۔

لیکن مقامی لوگوں کے ساتھ اس طرح کے رشتے بنانے میں، مقامی شاخ کے لوگوں کے لیے لازم تھا کہ وہ بستی کی ہر بات کی خبر رکھیں، ہمہ وقت یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ بہترین طور پر ان کے لیے کیا جانا چاہیے، اور اپنے محدود وسائل کی مدد سے ان میں سے کتنی باتوں کو عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے، اور وہ کون سے طریقے ہوں جن پر چل کر تھوڑی، بہت ہی سہی، لیکن کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہ سب کرنے میں وقت تو لگتا ہی، نہ صرف ان معنوں میں کہ اس قسم کا علم اور فہم پیدا ہونے میں برسوں لگ جاتے ہیں، بلکہ ان معنوں میں بھی کہ یہ کامیابی اس وقت تک ہرگز نہیں مل سکتی جب تک کہ لوگ اپنے دوسرے ضروری کاموں سے مستقل طور پر وقت نکالنے کی کوشش نہ کرتے رہیں۔ وہ لوگ جو اس سلسلے کو شروع کر سکتے تھے اسے اتنا اہم نہیں سمجھتے تھے کہ اس کے لیے وقت نکالیں۔ ایسے کمیونسٹوں نے جن کو واقعی عوامی مقبولیت حاصل تھی، یہ مقبولیت صنعتی تحریکوں میں اپنی انقلابی سرگرمیوں کے سبب حاصل کی تھی۔ بل میسی ایسے ہی کمیونسٹوں میں سے تھے۔ چونکہ یہ لوگ کمیونسٹ تھے اس لیے ٹریڈ یونین میں ان کے حامی اس پارٹی کے لیے احترام کا جذبہ رکھتے تھے جس کو ان باصلاحیت لوگوں کی وفاداریاں حاصل تھیں۔ لیکن ان کے حامیوں میں یہ جاننے کا کوئی تجسس نہیں تھا کہ کمیونزم کا کیا مطلب ہے، اور اس صورتِ حال کے لیے بنیادی طور پر پارٹی اور کمیونسٹ کارکن ذمے دار تھے — اس کا سبب یہ تھا کہ پارٹی کی سرگرمیوں میں شمولیت کو وہ ترجیح نہیں دیتے تھے۔ ان کی ٹریڈ یونین کی سرگرمیاں پارٹی کے کام پر ہمیشہ فوقیت پاتی تھیں۔ اگر ان کے نزدیک پارٹی کا صرف یہی مقصد تھا تو پھر وہ اپنے مداحوں سے اس سے زیادہ کی توقع کیسے کر سکتے تھے؟ اگر وہ ان کو یہ سمجھانے میں کامیاب بھی ہو جاتے کہ محض کمیونسٹ ہونے کے سبب ہی وہ محنت کش طبقے کے انقلابی سپاہی ہیں، اگر وہ انھیں یہ بھی بتا دیتے کہ محنت کش طبقے کی جنگ کی منطق کی رو سے انھیں کمیونسٹ بن جانا چاہیے، تو بھی اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں تھا، خصوصاً اس صورت میں جب کہ وہ خود اپنا یہ وتیرہ بنا چکے تھے کہ ٹریڈ یونین کے کاموں کو پارٹی کے ہر قسم کے کام پر فوقیت دی جائے۔

Scanned with CamScanner

لیکن میرے پاس ایسا کوئی طریقہ نہ تھا کہ اپنے خیالات کو پھیلاتا اور منواتا۔ چنانچہ اس صورتِ حال میں جو کچھ کر سکتا تھا میں نے کیا۔ میں نے تجویز رکھی کہ مجھے برانچ کا 'لٹریچر سکریٹری' بنا دیا جائے۔ اس کے بعد ہی برانچ کے بے اثر ہونے کا پہلا سبق مجھے ملا۔ میرے فرائض سیدھے سادے تھے۔ قریب ہی ایکٹن (Acton) میں واقع کتابوں کی دکان سے مجھے پارٹی کے مختلف پمفلٹ اور ہفت روزہ اخبار ورلڈ نیوز اینڈ ویوز (World News & Views) لانا ہوتا تھا۔ یہ اخبار صرف پارٹی کے اراکین کے لیے نہیں تھا بلکہ اس کا مقصد قارئین کے وسیع تر حلقے پر اثر انداز ہونا تھا۔ اس کے بعد میں یہ اخبار اور پمفلٹ پارٹی کے ان اراکین تک پہنچاتا جنھوں نے ان کو مستقل طور پر خریدنے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ کام اراکین سے بقایا رقوم اکٹھا کرنے والے وہ لوگ کرتے تھے جو ہماری شاخ کی تنظیم میں اہم مقام رکھتے تھے۔ ان میں سے ہر شخص کی ذمے داری یہ تھی کہ چار پانچ اراکین سے (جو عموماً پارٹی میں غیر فعال تھے) بقایاجات جمع کریں اور ہر اعتبار سے ان کا خیال رکھیں تاکہ وہ پارٹی کے کاموں میں نسبتاً زیادہ دلچسپی لینے لگیں، اور کمیونسٹ لیڈرشپ کی ذمے داریوں میں سے کچھ بار اٹھانے کو تیار ہو سکیں۔ لیکن اس تھیوری کا حقائق سے کوئی رشتہ نہ تھا۔ ہفت روزہ اخبار دکانوں پر جمعرات کو پہنچتا تھا۔ میں اس کی کاپیاں اسی شام کو بقایاجات اکٹھا کرنے والوں کو پہنچا دیتا تھا۔ تب وہ اسے اپنے آدمیوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ امید یہ کی جاتی تھی کہ اس طرح ہر شمارہ وقت پر پہنچ جائے گا۔ مثلاً 10 دسمبر بروز ہفتہ کا شمارہ ہفتے کے روز یا اس کے فوراً بعد قارئین تک ضرور پہنچ جائے گا۔ لٹریچر سکریٹری بننے کے چند مہینے بعد مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ تنظیم کا یہ معمولی سا کام کرنے پر یہ سمجھا جانے لگا تھا گویا میں نے پارٹی کا کوئی ناقابلِ تصور کام کر دکھایا ہے۔ خصوصاً ڈیو لیوس (Dave Levis) اور اس کی بیوی فریڈا (Freda) جو پارٹی کے رکن تھے، بہت متاثر ہوئے، حالانکہ ڈیو ایک ایسا بے دلا شخص تھا جو کسی سے بمشکل ہی متاثر ہوتا تھا۔ تب مجھے پتا چلا کہ میرا پیش رو ناقابلِ یقین حد تک کاہل تھا اور ہفت روزہ اخبار ایک ایک مہینے یا اس سے بھی زیادہ تاخیر سے پہنچتا تھا۔

میں برانچ کمیٹی کا رکن تھا اور روزمرہ کے کاموں میں اپنے حصے کے کام کرتا تھا، مثلاً میٹنگوں کے لیے کمرے بک کرانا، ڈیلی ورکر بیچنا وغیرہ، لیکن لٹریچر سکریٹری کی حیثیت سے کام سنبھالنے

Scanned with CamScanner

کے بعد ہی یہ ممکن ہو سکا کہ پارٹی کے اراکین کے ساتھ انفرادی طور پر رابطے قائم ہوں۔ ایسے لوگوں میں ایک مسز گولڈنگ (Goulding) تھیں جو ہمیشہ بڑے تپاک سے ملتی تھیں۔ بعد میں مجھے اس کا سبب معلوم ہوا کہ وہ مجھے اپنی بیٹی پیٹ (Pat) کے مستقبل کے شوہر کے روپ میں دیکھتی تھیں (یونیورسٹی طالب علم کے دنیا میں ترقی کے امکانات تھے اور وہ ایک اچھا شکار تھا)۔ دوسرے لوگوں سے جین میسی کے وسیلے سے ملاقات ہوئی جو بل میسی کی بیوی تھی۔ بل حالانکہ اتنا مصروف رہتا تھا کہ اس سے کبھی کبھار ہی ملاقات ہوتی تھی لیکن ان دونوں میاں بیوی سے میں جتنا بھی واقف تھا اسی سے ان کا بہت معترف تھا۔ وہ مسز مزگروف کے پرانے دوست تھے اور ان کا ذکر وہ ہمیشہ نہایت تحسین و تکریم سے کرتی تھیں۔ جین مقامی عورتوں کی تنظیم (Co-op Women's Guild) کی سرگرم کارکن تھی۔ ان دنوں پارٹی کی عام سمجھ یہ تھی کہ مزدور تحریک کے تین اہم پہلو ہیں۔ لیبر پارٹی اس کا سیاسی پہلو تھی، ٹریڈ یونینوں کا کام معاشی سرگرمیوں کے حوالے سے مزدوروں کو منظم کرنا تھا (مثلاً کام کے بہتر ماحول کی فراہمی کے لیے جدوجہد کرنا وغیرہ)، اور کوآپریٹو تحریک کا کام صارفین کی حیثیت سے محنت کشوں کو منظم کرنا تھا۔ انھوں نے کوآپریٹو سوسائٹیاں بنا رکھی تھیں اور اپنے خریدے ہوئے سامان پر انھیں منافع کے حصے (dividends) ملتے تھے جنھیں عموماً divvis کہا جاتا تھا، اور مقررہ بیٹھکوں میں اس کی پالیسی طے کی جاتی تھی۔ پارٹی شاخ کے سرگرم اراکین پابندی سے ان بیٹھکوں میں شریک ہوتے۔ ان میٹنگوں میں ایسے لوگوں سے بھی دوستانہ مراسم بڑھانے کا موقع ملتا جو پارٹی میں نہیں تھے۔ ایسے ہی لوگوں میں ایک مسز کونر (Mrs. Conner) تھیں جن کا شوہر ایک گوشہ نشین قسم کا آدمی تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ اس سے کبھی میری ملاقات بھی ہوئی ہو۔ وہ ایک پرانا انقلاب پسند سوشلسٹ تھا اور اس نے یہ تاثر دے رکھا تھا گویا وہ ہمیشہ سے ہی ایسا ہے۔ جو لوگ مجھے بہت اچھی طرح یاد ہیں ان میں ایک مسز اورک (Mrs. Orrick) تھیں جو میوزک ہال والے نغمے گاتی تھیں۔ ان کو اتنی بڑی تعداد میں گیت یاد تھے جو میں نے کسی اور سے کبھی نہیں سنے۔ کاش مجھے ان میں سے چند یاد رہ جاتے۔ ایک گیت یہ تھا:

I do like a cup of co-ho-coa

(مجھے قہوے کی پیالی بہت مرغوب ہے)

Scanned with CamScanner

اور دوسرا وہ گیت تھا جس میں نئی ازدواجی زندگی کی خوشیوں کی مدح سرائی کی گئی ہے۔ اس گیت کی ایک لائن یہ تھی:

We're going to blow the candle out
at half-past nine.

(ساڑھے نو بجے ہیں اور اب ہم شمع بجھانے والے ہیں)

برانچ کی بیٹھکوں میں بحث کا موضوع عموماً بیشتر اراکین کی عدم فعالیت ہوتا تھا۔ پہلے تو غیر حاضر رہنے والوں کے خلاف دبی دبی ناراضگی کا اظہار کیا جاتا اور پھر ذرا ہنرمندی سے کام لیتے ہوئے حاضر لوگوں میں ذمے داریاں بانٹی جاتیں جن کے بارے میں معلوم تھا کہ وہ شرمندگی کے ساتھ، انکار کرنے کے بجائے بے دلی سے قبول کرلیں گے۔

اکثر یہ شکایت سننے کو ملتی تھی کہ فعال کارکنوں کا بیشتر وقت غیر فعال اراکین کی حاضری پر تبصرہ کرنے میں ضائع ہوتا ہے، اور حالانکہ یہ ایسی سچائی تھی جس کی جانب توجہ دینا ضروری تھا لیکن یہ پارٹی کی بنیادی خامی نہیں تھی۔ بنیادی خامی یہ تھی کہ مقامی شاخوں کے رول پر کسی طرح کی کوئی گفتگو نہیں ہوتی تھی۔ اپنے علاقے کی 'سیاسی زندگی کا اہم ترین عنصر' بننے کے لیے بہت ضروری تھا کہ مقامی لیبر پارٹی کے ساتھ دوستانہ مراسم بڑھائے جائیں۔ ہم سب جانتے تھے کہ وہ وقت آچکا ہے جب برطانوی مزدور طبقے کا وہ حصہ جو سوشلزم سے وابستگی رکھتا ہے، ایسے سیاسی مسائل کے حل کی تجویزیں رد کردے گا جس میں لیبر پارٹی کا کوئی قائدانہ رول نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ برطانوی کمیونسٹوں کو چاہیے تھا کہ وہ لیبر پارٹی اور اس کے حامیوں کو سیاسی منظرنامے کے مرکز میں رکھ کر دیکھا کرتے۔ لیکن پارٹی کی اسٹارچ گرین شاخ چیزوں کو اس طرح ہرگز نہیں دیکھتی تھی۔ اس کی مہم خالصتاً بین الاقوامی اور قومی مسائل کے بارے میں ہوتی تھی، اور جب کبھی لیبر پارٹی کے اراکین سے ان کا واسطہ پڑتا تو وہ 'لیبر پارٹی چھوڑ کر ہمارے ساتھ آجاؤ' کی دعوت دیتے۔ اس معاملے میں موری کا رویہ بھی دوسروں سے مختلف نہیں تھا۔

مجھے اب اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ رویہ اکثر مقامی شاخوں میں یکساں طور پر پایا جاتا ہے اور ہیمر اسمتھ کی تینوں مقامی شاخیں اس کی جیتی جاگتی مثالیں ہیں۔ یعنی یہ لوگ یہ سوچنے میں ناکام تھے کہ

Scanned with CamScanner

لیبر پارٹی کے تعلق سے ان کا رول کیا ہونا چاہیے۔ اس وقت پارلیمنٹ میں ہیمر اسمتھ کی نمائندگی ڈی این پرٹ (D.N. Pritt) کر رہے تھے جو ایک معزز .Q.C یعنی ملکہ کے مشیر تھے۔ جنگ سے پہلے وہ لیبر پارٹی کے ایم پی منتخب ہوئے تھے اور آہستہ آہستہ کمیونسٹوں کے ساتھ ان کے روابط اس قدر قریبی ہو گئے کہ لیبر پارٹی نے ان کو نکال دیا۔ انھیں نے اپنے انتخابی حلقے میں غیر معمولی مقبولیت حاصل تھی، اور 1945 کے انتخابات میں وہ دوبارہ کچھ تو اسی مقبولیت کی وجہ سے منتخب ہوئے تھے لیکن بڑی وجہ یہ تھی کہ زیادہ تر رائے دہندگان یہ سمجھتے رہے کہ وہ لیبر پارٹی کے باضابطہ امیدوار ہیں۔ اس کے برخلاف لیبر پارٹی کی مشینری لوگوں کو یہ باور کرانے میں ناکام رہی کہ یہ بات غلط ہے۔ غور طلب بات تھی کہ سب سے زیادہ 'خالصیت پسند' کمیونسٹ کے ذہن میں بھی یہ بات واضح رہنی چاہیے تھی کہ ایک ایسے ایم پی کی حمایت اور عوامی مقبولیت میں اضافے کی کوششیں کرنا اس کا سب سے اہم کام ہے جو ہر اعتبار سے کمیونسٹ ہے۔ لیکن چونکہ وہ شخص فی الحقیقت کمیونسٹ 'پارٹی' کا ایم پی نہیں تھا اس لیے ہیمر اسمتھ کی شاخیں پرٹ اور اس کے انتخابی حلقے سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی تھیں اور اس حلقے کے معاملات و مسائل کو حل کرنے کی تمام ذمے داری پرٹ اور اس کی ذاتی حامیوں پر چھوڑ دی گئی (اگر چہ ان میں مقامی کمیونسٹ بھی انفرادی طور پر شامل تھے)۔

اس صورتِ حال سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ صرف پارٹی کے لیڈر ہی ایسے نہیں تھے جن کو میں نے 'ترازو میں تولا اور کم وزن پایا' بلکہ مقامی سطح پر شاخوں کی کارگردگی بھی مجھے اسی نتیجے پر پہنچنے کو مجبور کر رہی تھی۔ لیکن ایک اہم فرق ان میں تھا۔ مقامی اراکین جس بات پر اعتقاد رکھتے تھے اس کے لیے ایمانداری اور سنجیدگی سے کام کرتے تھے جبکہ بڑے لیڈر ایسے نہیں تھے۔ وہ عموماً انھی اصولوں کو پامال کرتے دیکھے جا سکتے تھے جن کی تبلیغ وہ بڑے زور و شور سے کرتے تھے۔

❊❊

Scanned with CamScanner

سہ ماہی ادبی کتابی سلسلے ''آج'' کی اشاعت ستمبر 1989 میں کراچی سے شروع ہوئی اور اب تک اس کے
شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ ''آج'' کے اب تک شائع ہونے والے خصوصی شماروں میں گابریئل گارسیا مار
''سرائیوو سرائیوو'' (بوسنیا)، نرمل ورما، اور ''کراچی کی کہانی'' کے علاوہ عربی، فارسی اور ہندی کہانیوں کے انتخاب
مشتمل شمارے بھی شامل ہیں۔

''آج'' کی مستقل خریداری حاصل کر کے آپ اس کا ہر شمارہ گھر بیٹھے وصول کر سکتے ہیں
اور ''آج کی کتابیں'' اور ''سٹی پریس'' کی شائع کردہ کتابیں 50 فیصد رعایت پر خرید سکتے ہیں۔
(یہ رعایت فی الحال صرف پاکستانی سالانہ خریداروں کے لیے دستیاب ہے۔)

چار شماروں کے لیے شرح خریداری (بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان میں: 500 روپے
دیگر ملکوں میں: 60 امریکی ڈالر

Scanned with CamScanner

اس اصول میں یہ بھی سہولت ہے کہ خریدار رسالے کا خرچ اسی صورت میں برداشت کریں گے جب انھیں یہ احساس ہوگا کہ انھیں اپنی ادا کی ہوئی قیمت کے عوض مطلوبہ معیار کی ادبی تحریریں حاصل ہو رہی ہیں۔ جس وقت اس تناسب کا احساس ختم ہو جائے گا تو وہ رسالے میں دلچسپی لینا ترک کر دیں گے اور یہ اس بات کا پیغام ہوگا کہ اسے مزید جاری رکھنا غیر ضروری ہوگیا ہے۔ خریداروں کے حوصلہ افزا ردعمل سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ وقت ابھی دور ہے، اس لیے رسالے کی اشاعت جاری رکھی جا سکتی ہے۔ اس حوصلہ افزائی کے لیے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اس تفصیل کو بیان کرنے کا مقصد اس بات کا جواز پیش کرنا ہے کہ بڑھتے ہوئے اخراجات کے باعث اب رسالے کی اندرون ملک مستقل خریداری کی شرح میں پچیس روپے فی شمارہ اضافہ کیا گیا ہے، یعنی چار شماروں کے لیے اب 400 روپے کے بجائے 500 روپے ادا کرنے ہوں گے۔ اس رقم میں رجسٹرڈ بک پوسٹ کا خرچ شامل ہے، لیکن خریداری کی تجدید اگر وی پی کے ذریعے کرائی جائے تو منی آرڈر فیس خریدار کو ادا کرنی ہوگی۔

اجمل کمال ـــــ

Scanned with CamScanner

۶۱

قیمت

۱۵۰ روپے

آج

آج کی کتابیں

۳۱۶ مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ،

صدر، کراچی ۷۴۴۰۰